عبداللہ گائیڈ سیریز

MODERN WESTERN THOUGHTS

جدید مغربی مفکرین

نوٹس بمعہ پانچ سالہ حل شدہ پرچہ جات

AB

عبداللہ

عبداللہ گائیڈ سیریز
جدید مغربی مفکرین
Politics of Fear
www.KitaboSunnat.com
☆ نعیم سلہری ☆ سیدہ کنیز نرجس زہرہ
2- اولمپک پلازہ والکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور
Ph: 042-7224925
عبداللہ برادرز

فہرست

ایم اے تاریخ کے لئے ہماری انفرادی خصوصیات کی حامل جامع کتب برائے ملتان یونیورسٹی

کتاب	مصنف	کتاب	مصنف
تاریخ اسلام	بشیر احمد تمنا	تاریخ اسلام (دور جاہلیت تا خلفاء راشدین)	محمد امین حق
تحریک پاکستان	اصغر علی شاہ جعفری	تعبیر پاکستان	ایس اے شاہد
تحریک پاکستان کی سرگزشت	ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری	طلوع پاکستان	محمد عثمان جان
پاکستان میں حکومت و سیاست	احمد جمال فاروقی	سیاسیات عالم	صفدر حیات صفدر
مطالعہ تاریخ	ایس ایم شاہد	مطالعہ تاریخ (سوالاً جواباً)	صفدر حیات صفدر
مطالعہ تاریخ نویسی	عبدالجلیل بھٹی	سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کا نظم و نسق	سید اشفاق حسین شاہ
سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کا نظم و نسق	پروفیسر عبدالباری	اسلامی ہند کے مسلم حکمرانوں کے تہذیبی اور سیاسی کارنامے	صفدر حیات صفدر
تاریخ ہند قدیم	غلام مصطفیٰ بسمل	تاریخ ہند قدیم	پروفیسر عبدالباری
سلاطین دہلی	پروفیسر محمد اکرم سعید	سلاطین دہلی	عبدالرزاق شاہد
عظیم مغلیہ عہد	غلام مصطفیٰ بسمل	عہد مغلیہ معہ دستاویزات	صفدر حیات صفدر
سلطنت مغلیہ کا زوال	ڈاکٹر شاہد حسن رضوی	ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال	پروفیسر عبدالباری
سلطنت ہند کا زوال (تاریخ پاک و ہند)	صفدر حیات صفدر	تاریخ پاک و ہند	قدرت آفاقی
تاریخ پنجاب	غلام مصطفیٰ بسمل	تاریخ پنجاب	سید اصغر علی شاہ جعفری
تاریخ بنو امیہ و بنو عباس	سید سلمان	جدید دنیائے اسلام	فضل کریم شیخ
جدید عالم عرب	اشفاق حسین شاہ	اسلامی ادارے و تہذیب و تمدن	ایس ایم شاہد
تاریخ اسپین	ایس ایم شاہد	تاریخ اسپین	پروفیسر عبدالباری
تاریخ ترکیہ	ایس ایم شاہد	تاریخ ترکیہ	عبدالرزاق شاہد۔ عبدالباری
جدید ترکی (تاریخ و سیاست)	عبدالرزاق شاہد	تاریخ یورپ	ایس ایم شاہد
تاریخ یورپ (سوالاً جواباً)	تنویر بخاری	تاریخ یورپ	محمد اکرم سعید
تاریخ امریکہ	زاہد حسین انجم		

رموز معروضیت تاریخ (سال اول و سال دوئم) شاہ نواز

تاریخ معروضیت کے آئینہ میں (عابدہ تبسم)

ماسٹر گائیڈ ایم اے تاریخ (سال اول و دوئم)

MASTER GUIDE M.A. HISTORY IN ENGLISH

ایور نیو بک پیلس اردو بازار لاہور

سوال: جدید سیاسی مفکرین و فلسفہ کی نمایاں خصوصیات بیان کریں۔ 1995ء

جدید سیاسی مفکرین و فلسفہ

Modern Political Thought

جواب: جدید سیاسی افکار کا مطالعاتی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جس طرح ارسطو بابائے سیاسیات کے نام سے مشہور ہے اسی طرح میکاولی جدید سیاسی افکار کا بانی ہے۔

یونانی سیاسی افکار کا دارومدار شہری و علاقائی ریاست پر ہے جبکہ رومی سیاسی افکار یپائر پر مشتمل ہے عہد وسطیٰ کے سیاسی افکار میں ایک وسیع معاشرے کا تذکرہ ملتا ہے اسی طرح جدید سیاسی افکار میں ریاست کو فوقیت حاصل ہے۔

جدید سیاسی افکار کی نوعیت :

جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ جدید سیاسی افکار کا دارومدار بھی ریاست پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ سیاسی فکر یونانی، رومی اور عہد وسطیٰ سے بالکل مختلف ہے جدید سیاسی فکر کا بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو اس میں مقتدر اعلیٰ پر مشتمل ریاست کا تصور نمایاں ہے اس کی ایک مثال مسلم ریاست ہے جس میں عالمگیریت کا تصور ہے۔

جدید سیاسی افکار کی نمایاں خوبیاں :

جدید سیاسی فلسفہ کی نمایاں خوبیاں درج ذیل ہیں۔

عقلیت پسندی Rationalism

جدید سیاسی فلسفہ کی خصوصیات و خوبیوں پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ اس میں عقلیت پسندی کا اہم عنصر شامل ہے جس میں عقل کو زیر استعمال لیکر انسانی مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی تگ و دو کی جاتی ہے میکاولی، ہابس، لاک اور روسو وغیرہ نے انسانی عقل کی بنیاد پر ہی ریاست کے وجود کی تشریح کی ہے اور انسانی عقل کے ذریعے ریاست کے مختلف اداروں کی تشکیل و تنظیم پر زور دیا ہے اگر ماضی کے ورق گردانی کریں تو معلوم ہو گا کہ یونانی سیاسی فلسفہ میں بھی عقلیت پسندی کو اہم مقام حاصل ہے جبکہ رومی اور عہد وسطیٰ کے سیاسی فلسفیوں نے عقلیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔

ان ادوار میں الہامی مذہب کے تصور کو برتری حاصل ہوتی۔ لیکن جدید دور میں عقلیت کو برتری حاصل ہوتی یعنی جدید فلسفی عقلیت پسندی سے تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انفرادیت پسندی Individualism

جدید فلسفہ کی اہم خوبی انفرادیت پسندی بھی ہے اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ جدید فلسفہ میں انفرادیت پسندی ہی بنیادی اصول قرار دیا گیا۔ اس کی واضحات کرتے ہوئے کہا گیا کہ ریاست کے دائرہ اختیار کو محدود حیثیت میں ہی رہنے دیا جائے اور ہر انسان کو انفرادی آزادی عطا کر دی جائے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ انفرادیت پسندی کا یہ تصور چند مغربی فلسفیوں نے اپنے ذاتی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی واضح کیا لیکن بعد ازاں وہ خود ہی اپنے اس تصور سے دور کر لئے۔ انفرادیت پسندی کا یہ تصور پیش کرنے کا حقیقی مقصد کچھ یوں تھا کہ ترقی یافتہ ریاستوں کا امان بارت ترقی پزیر ممالک کو سپلائی کیا جا سکے لیکن جدید دور میں یہ تصور پوری دنیا میں تنقید کا نشانہ بن رہا ہے انفرادیت پسندی کو پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ فرد کو ریاست کے تسلط سے آزاد کیا جائے یعنی حکمرانیت مطلق العنانیت عنان پرستی سے انسان کو آزادی مہیا کی جائے۔ کارل مارکس کے نظریہ Collective سے قبل جدید ترقی یافتہ ریاستوں میں انفرادیت پسندی کو زبردست حمایت حاصل تھی مغربی جرمنی اور برطانیہ وغیرہ میں آج بھی فرد کو مزید آزادی سے ہمکنار کرنے کی مروجہ ہو رہی ہے روسو نے منشائے عمومی کا نظریہ پیش کر کے فرد اور ریاست میں تعلق استوار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جبکہ ہابس نے معاہدہ عمرانی کے ذریعے فرد کو تحفظ مہیا کرنے کی بھرپور مروجہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سیاسی فلسفہ میں انفرادیت پسندی کی خوبیاں اور خامیاں برابر مقدار میں پائی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انفرادیت پسندی کے تصور کو اتنی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی جتنی کہ سوشلزم کو حاصل ہوئی۔ میکاولی کے سیاسی فلسفہ کا تجزیہ انفرادیت پسندی سے کرنے سے نظریہ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

تصور قومی ریاست Concept of National State

جدید یورپی دنیا میں جدید ریاست و مملکت کا تصور قومیت کو بنیاد پر کیا گیا ہے یعنی قومیت کی بنیاد پر جدید ریاست کو واضح کیا گیا ہے۔

قومی ریاست کے اجزاء :

مذہب، ثقافت اور فلسفہ حیات کو قومی ریاست کے اہم اجزا تصور کئے جاتے ہیں۔ جدید ریاست نے چونکہ ایک مقتدر ریاست ہے یعنی آئینی و قانونی لحاظ سے ایک مستحکم ریاست جدید مفکر آسٹن کا خیال ہے کہ مقتدر ریاست کسی دوسری ریاست کے زیر اثر نہیں ہو سکتی۔ اقتدار اعلیٰ کا تصور رومیوں کے ادوار میں بھی پایا جاتا ہے اور یہی وہ تصور ہے کہ جس نے ریاست کے قانونی تصور کو نہیں کیا لیکن رومی بھی قومی ریاست سے وہ مقصد حاصل نہ کرتے جو کہ آج کے جدید دور میں لیا اور حاصل کیا ہے۔

سوال: اشتراکیت کے نظریات بیان کریں اور مذہب کے بارے میں اس کے خدوخال بیان کریں۔ 1993ء

اشتراکیت کے نظریات اور مذہب

جواب:

دنیا کے اہم مکاتیب فکر اور ان کے خدوخال:

یوں تو دنیا میں بہت سے مکاتیب فکر رائج ہیں لیکن ان میں مشہور نظریات یا [illegible] چار ہیں۔

1- سرمایہ دارانہ نظام Capitalism
2- سوشلزم Socialism
3- کمیونزم Communism
4- اسلام Islamism

ان چار مکاتب فکر میں سے صرف دو مکاتب فکر کے پاس فلسفہ حیات ہے [illegible] محروم ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے پاس نظریہ اور فلسفہ حیات نہیں ان کا فلسفہ صرف [illegible] ہے یعنی سرمایہ دارانہ نظام نہ الحاظ پر مبنی ہے اور نہ لہیات پر جبکہ فلسفہ سے مراد وہ نظریہ [illegible] جو [illegible] آفاق اور انفس کے بارے میں قائم کیا جائے اسے جہاں بینی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے یعنی [illegible] کے بارے میں اس کا فلسفہ لیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں "آفاق اور النفس" یعنی کائنات [illegible] انسان کے بارے میں جو نظریہ قائم ہوتا ہے ہم اس کو فلسفہ حیات کہتے ہیں جبکہ یہ فلسفہ سرمایہ [illegible] نظام میں موجود نہیں سوشلزم اور کمیونزم کے پاس ایک ہی فلسفہ حیات ہے کائنات اور [illegible] مطابق ان کے پاس یکساں خیالات ہیں لہذا ان کا فلسفہ حیات بھی ایک ہی ہے جبکہ دوسری [illegible] دونوں کے مقابلے میں اسلام آتا ہے۔

اسلام کا اپنا ایک فلسفہ حیات ہے کرہ ارضی کے متعلق اپنے خیالات [illegible] اسلامی نظریات کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نظریاتی لحاظ سے کمیونزم اور سوشلزم [illegible] مشترک نظریات کا مقابلہ اسلام سے ہے۔

کمیونزم اور سوشلزم کا فلسفہ حیات:

کمیونزم اور سوشلزم کے فلسفہ حیات کا بانی کارل مارکس ہے اس کا پیش کردہ نظریہ اس وقت سامنے آتا ہے جب اس پر عمل کرنے کے لئے کوئی حکومت نہ تھی جب اس نظریے کی اپنی حکومت قائم ہوئی اور ان نظریات پر عمل ہونا شروع ہوا تو سو فیصد کارل مارکس کے نظریات پر عمل نہ ہو سکا۔ طرح نظریات اور عمل میں فرق آگیا کیونکہ بعض چیزوں پر تو عمل نہ ہوا بعض [illegible] اس طرح نظریے کے علمبردار اپنے مرتب کردہ نظام کی طرف چند قدم آگے بڑھے اور پھر [illegible] جس مقام

پر ا وں نے قیام کیا اس کو سوشلزم کا نام دیا گیا۔ سوشلزم کا پہلے وجود نہ تھا۔ صرف کمیونزم کا ہی وجود تھا ئن ۔ اور نظریات کے فرق نے ایک درمیانی منزل کا تعین کر دیا۔ اس کا نام سوشلزم ہے اس طرح ان تنوں نظاموں کا فلسفہ اور نظریہ یکساں ہے کارل مارکس نے حیات کے بارے میں ابتدا میں جو یہ ۔ کیا اس کو ڈائیکیلٹک تھیوری کا نام دیا گیا جس سے مراد جدلیاتی نظریہ ہے کارل مارکس کے نظریہ کی تین اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

1 فلسفہ

2 تضاد

3 تاریخ (ارتقا)

نظریہ جدلیاتی اور تاریخ :

یہ ڈائیلکٹک ہیں لفظ (Dialectic) ڈائیکٹک' یونانی زبان کا لفظ ہے جو کہ لفظ ڈائلگو سے ہے ڈائلگو سے مراد جدلی طرز استدلال ہے جدلیات کو ہم اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ فرض کریں دو آدمی آپس میں مناظرہ کرتے ہیں اور مناظرہ کرنے والا اپنے مدمقابل سے سوال کرتا ہے وہ جواب ہے کہ مقابل کے جواب کی روشنی میں اس پر دلیل قائم کرنے کو جدلیات کہتے ہیں یعنی کسی ناشے سوال کرنا جواب لینا اور اس کے جواب کو دلیل بنا کر پیش کرنا اس کو جدلیات کہتے ہیں۔ اپنے مقابل کے مسلم کو جسے وہ تسلیم کرتا ہے اسی ہی مسلم کو دلیل بنانا اسے جدلی طرز استدلال کہتے ہیں یہ لفظ ۔ ف استدلال کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی لفظ ڈائیکٹک Materialism Dialectical ۔ جب کانٹ کا دور آیا تو اس نے اس پر تھوڑی سی ترمیم کرلی اور اس کے بعد کانٹ کی طرح ہیگل جرمن فلسفی فاختہ نے پہلی مرتبہ اسی ڈائیلکٹک کو صرف جدلی طرز استدلال سے نکال کر عینیت (تصورتیں) میں لے آیا۔ "عینیت" (تصور) یعنی کائنات کے مادی موجودات میں بھی ٹکراؤ اور جدل ہے اس طرح ڈائیلکٹک کو عالم افکار سے نکال کر عالم عینیت میں لا کھڑا کیا۔ عینیت سے مراد یہ ہے کہ افکار سے خارج میں کسی چیز کا موجود ہونا۔

اس کے بعد ہیگل نے یورپ میں پہلی مرتبہ ڈائلیکٹ کو ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا ہیگل کا خیال ہے کہ کائنات کی ہر شے دو متضاد چیزیں موجود ہیں۔

ہر شے سے مراد مادی اور غیر مادی اشیا شامل ہیں افکار ہوں' عقائد ہوں' نظریات ہوں یا مادی اشیا ہوں سب کے اندر دو متضاد چیزیں ہیں یعنی ہر چیز کے اندر اس سے بڑھ کر ایک نئی چیز پنہاں ہے ابتدائی مرحلے میں ہر چیز کا اپنا وجود ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر سے ایک اور موجود سر اٹھاتا ہے پھر پہلے موجود اور نئے موجود کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک تیسری چیز وجود میں آتی ہے اور یوں کائنات ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔

اسی طرح ہیگل کے مطابق کائنات کی ہر چیز دو متضاد چیزوں پر مشتمل ہے پہلی چیز جو وجود میں

آتی ہے اس کو تھسز کہتے ہیں اور پھر اس کے مدمقابل جو چیز سر اٹھاتی ہے اس کو اینٹی تھسز کہتے ہیں
اور اینٹی تھیسز کی آپس میں جنگ ہوتی ہے اور دونوں میں کش مکش پیدا ہوتی ہے جس سے نتیجہ
اینٹی تھیسز غالب آجاتا ہے اور پھر ان دونوں سے بالاتر ایک اور چیز وجود میں آتی ہے جسے سنتھسز کہتے
ہیں یعنی تھسز وجود کا پہلا مرحلہ ہے جب کہ سینتھسز وجود میں آتا ہے تو یہ نئے ارتقائی عمل کے لئے
اس کا ابتدائی مرحلہ بن جاتا ہے یعنی پھر یہ تھسز کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس طرح لامتناہی سلسلہ
جاری رہتا ہے۔

ہیگل مادری طبیعت کا قائل تھا یعنی اس کے نظریات میں میٹافزیکلی تھی۔ کارل مارکس نے
کانٹ فاختہ اور ہیگل کے نظریات سے فائدہ اٹھایا اور ڈائلکٹیک نظریہ سے مادری مادہ کو حقیقت قرار دیا
اور دیگر مفکرین کے نظریات کہ ہر چیز کی بنیاد مادہ ہے مارکس نے کہا کہ کائنات صرف مادہ ہے اس کے
سوا کچھ نہیں اس نظریہ کو پیش کرنے کے لئے اس نے ڈارون کے نظریہ سے بھی مدد لی اس طرح دوسرے
نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نظریہ پیش کیا جو بعد میں مارکسزم کے نام سے مشہور ہوا۔ مارکس کا
خیال ہے کہ کائنات تضادات سے بھری ہوئی ہے اور موجودات اور مادے کے اندر ترقی اور حرکت
کے عوامل موجود ہیں تمام اشیاء میں ترقی اور حرکت کے عوامل خود اس ہی کے اندر موجود ہیں اور
جب ترقی اور حرکت کے عوامل خود مادے کے اندر موجود ہیں تو ہمیں باہر سے کسی خالق کی تلاش کی
ضرورت نہیں۔ ہیگل کا فلسفہ کہ کائنات کی ہر شے کے اندر بھی متضاد چیزیں پائی جاتی ہیں یا دوسرے
الفاظ میں یہ کہ ہر شے کے اندر اس سے بہتر ایک چیز پنہاں اور وہ ہے تھسز اینٹی تھسز اور سینتھسز یہ
تمام ایسے عوامل ہیں جو خود مادے کے اندر موجود ہیں اور ترقی و حرکت کے لیے یہ کافی ہے جب
حرکت اور ترقی کے عوامل خود مادے کے اندر موجود ہیں تو پھر ہمیں کسی بیرونی عامل کا قائل ہونے کی
کوئی ضرورت نہیں ہے اس طرح ترقی اور حرکت کے لئے تمام عامل کا قائل ہونے کی کوئی ضرورت
نہیں ہے اس طرح ترقی اور حرکت کے لئے تمام عامل خود مادے کے اندر موجود ہیں اس طرح وہ
اشیاء کی ترقی اور تحریک کے لئے غیر مادی عامل یعنی میٹافزکس کے مفکر ہیں اور کسی مادری طاقت
مادہ خود ترقی کرتا ہے اسی سینتھسز اور اینٹی تھسز کے فلسفہ سے تضاد کے عامل جو مادے میں موجود ہیں
مادے کو روبہ ترقی رکھنے اور اس طرح کسی خالق کی ضرورت ہیں۔

ڈائلکٹیک نظریئے کے اہم اصول

تضاد

حرکت

اشیاء کا باہمی ارتباط

دفعتاً انقلاب

مادے میں عنصر تضاد :

سب سے پہلا اصول تضاد ہے یعنی کائنات میں مادے کے علاوہ کوئی اور چیز موجود نہیں اور مادہ تضادات کا حامل ہے لہٰذا اس فلسفے کے تحت تمام مادی اشیاء میں تضادات موجود ہیں اسی طرح افکار میں بھی تضادات ہیں کیونکہ افکار ان کی نظر میں مادہ ہے۔ اسی طرح نظریے میں بھی تضادات موجود ہیں۔ چونکہ دنیا میں مادے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، اس لئے سب میں تضاد ہے اور یہی تضاد کائنات کی ہر چیز کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے کا سبب ہے یعنی تھسز اینٹی تھسز اور سینتھسز کے تضادات کائنات کی ہر چیز کو متحرک رکھتے ہیں یوں تضاد عامل حرکت ہے تضادات عامل ترقی ہیں ہم اس نظریہ کا تجزیہ کریں گے کہ واقعی کائنات میں مادے کے علاوہ کوئی چیز نہیں

ہمارے نزدیک کائنات میں بعض چیزیں مادی ہیں اور بعض غیرمادی غیرمادی اشیاء میں تضاد نہیں ہے مادی اشیاء میں بھی ایسا نہیں ہے کہ دو متضاد عناصر ایک جگہ بیک وقت جمع ہو جائیں ڈائلکٹ نظریہ کے مطابق مادی چیزوں میں تضادات کا اجتماع ہے مارکس کا خیال ہے کہ ہر چیز کے اندر اس سے بہتر ایک چیز- چیزوں میں تضادات کا اجتماع ہے مارکس کا خیال ہے کہ ہر چیز کے اندر اس سے بہتر ایک چیز موجود ہے یعنی اس کا وجود اور پھر ان دونوں کے درمیان کشمکش اس کا معنی یہ ہے کہ دو متضاد چیزیں بیک وقت موجود ہیں اس کے ثبوت کے لئے وہ بجلی کی مثال دیتے ہیں کہ اس کا ایک سرا مثبت ہے اور دوسرا منفی جب ان دونوں کا ملاپ ہوتا ہے تو بجلی پیدا ہوتی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ دو متضاد چیزیں نہیں ہیں- بلکہ یہ مختلف چیزیں ہیں- مختلف اور متضاد چیزیں ہوتی ہیں- مثلاً شیرینی اور سفیدی اس میں سفیدی بھی ہے اور شیرینی بھی یہ دونوں ایک جگہ جمع ہیں اور اس لئے جمع ہے کہ یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں اور مختلف چیزیں بیک وقت ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں حرارت اور ٹھنڈک سیاہ اور سفید یہ دو متضاد چیزیں ہیں ایک چیز ساری کی ساری سیاہ بھی ہے اور اسی لمحے میں وہ تمام کی تمام سفید بھی ہے- ایسا ہونا ممکن ہے بحث تو اس بات میں ہے کہ اس طرح دو متضاد چیزوں میں بحث کرو کہ ایک جسم میں بیک وقت سیاہی اور سفیدی کا اجتماع یا گرمی اور سردی کا اجتماع ممکن ہے بجلی کی منفی اور مثبت کو چھوڑو وہ متضاد نہیں ہیں وہ دو مختلف چیزیں ہیں اگر ان کو دو متضاد چیزیں مان لیں تو پھر ان میں تھسز اور اینٹی تھسز کیا ہے اور سینتھسز کیا ہوا

مثال جنگ میں تضاد :

ماؤ اپنے نظریات کی مثال کے لئے جنگ کو پیش کرتا ہے ہم تو کہتے ہیں کہ ایک ہی چیز میں بیک وقت دو متضاد چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں- اب جنگ میں حملہ تو کسی طرف سے ہوتا ہے اور دفاع کسی اور طرف سے فتح کسی کی ہوتی ہے شکست کسی اور کی یہ مختلف چیزیں ہیں آپ ان کو جمع اس طرح کر کے دکھائیں کہ ایک کو فتح بھی ہو اور اسی لمحے میں شکست بھی ایک شخص دفاع بھی کرے اور

اسی وقت میں حملہ آور بھی ہو یوں تو علیحدہ علیحدہ مقامات پر بے شمار متضاد چیزیں موجود ہیں۔

نظریات میں تضادات کی مثال ماؤ کا خیال ہے کہ جب انہوں نے مارکسزم کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس کی افادیت سے ناواقف تھے لیکن بعد میں اس کو بہتر سمجھا۔ یعنی جہل علم ... کیا اور یہ دونوں متضاد چیزیں اور اگر ضد کی ضد میں نکر ہو تو تضاد پیدا ہوتا ہے لیکن ان ... میں بہتری کی امید کس طرح کی جاتی ہے اور ان کے درمیان سینتھسز کہاں ہے اس طرح نظر ... خود غرضی پر مبنی ہے اس کا اصل ہدف سادہ لوح انسان ہے تاکہ مخصوص گروہ کے ذریعہ ... حکومت قائم ہو۔

اسلام نے جن اصولوں پر تقسیم دولت کا نظام قائم کیا ہے اس کا ذرا بھی مشابہ مارکسزم ... نہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ مارکسزم اور اسلام کے نظریات تقسیم دولت کے ... ایک دوسرے کے برعکس ہیں کسی بھی ریاست کو چلانے کے لئے سیاسی امور کے ساتھ ... امور بھی اہم حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا محمد مصطفیٰ نے جب مدینہ النبی میں پہلی اسلامی ریاست قائم ... تو انسانی امتیازات کا خاتمہ کر دیا اور اسلامی ریاست کے قیام کے لئے تین اصول وضع کئے۔

1- آئین و قانون مساوات

2- آئین و قانون اخوت و بھائی چارہ

3- آئین و قانون مساوی دولت

یہی وجہ تھی کہ اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرے کے روپ میں سامنے آیا اس ... اسلام کے ماننے والوں کے پاس جو کچھ تھا بخوشی ریاست کے نام کر دینے کے لئے تیار تھا جب ... کے دل میں دوسرے کے لئے ہمدردی اور محبت کے جذبات ہوں تو معاشرہ خود بخود مثالی بن ... ان اسلامی اصولوں کے تحت ایک ایسے معاشرے کی بنیاد قائم ہوئی جس معاشرے میں انفرادی اور ... ذمہ داریوں کو شخصی شعور حاصل ہوا یہی انفرادی شخصی شعور تھا جس نے خود کو ایک ... کے سامنے خود کو اطاعت کے لئے پیش کیا۔

قرآن مجید میں ہے کہہ دو اگر تم خدا سے محبت کرتی ہو تو میری پیروی کرو خدا ... سے محبت کرے گا اور تمہیں بخش دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا ... میں زکوۃ دینے والے سب تھے لیکن زکوۃ لینے والا کوئی نہ تھا۔ یہ وہ نظام تھا جو کہ محبت اور قربانی ... کے جذبے پر مبنی تھا زندگی کے ہر ایک شعبے کے لئے اسلام کے زریں اصول انسان اور انسانیت کی ... بہترین رہنمائی کر سکتے ہیں۔

جبکہ مارکسزم ایسا کرنے میں ناکام رہا ہے بلکہ روس اس کو اختیار کرنا والا منتشر ہو گیا۔

مارکسزم کی کشش :

مارکسزم کی ناکامیوں اور خامیوں کے باوجود انسان کی کثیر تعداد اس کو باقی نظام ... سے بہتر

تھا۔ مارکسزم سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کا شدت سے احساس دلاتی ہے مارکس کا خیال ہے سرمایہ دارانہ نظام دراصل اپنے مقاصد سے ہٹ کر کام کرتا ہے اس نظام کا مقصد معاشرے کی بہتری ہوا چاہئے تھا لیکن اس نظام نے معاشرے میں نااتفاقی اور بدعنوانی کو جگہ دی مارکس کا خیال ہے کہ یہ نظام معاشرے کے ہر فرد میں یہ بات شدت سے پیدا کر دیتی ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد سرمائے کو جمع کرنا نہیں بلکہ معاشرتی اصلاح ہے۔

Marx Believed that no society could supplant another until that other had developed fully all the potential that was in it. Capitalism was impossible until feudalism had completely run its course and capitalism is Marx thought subject to the same course of evolution. No social order ever disappears before all the productive forces for which there is room in it have been developed. The argument here is clear cut and unqualified.

Marx's theories in order to maintain their viability. This demanding task was handled with considerable competence by Nicolai lenin yet if one looks at countries which are termed communistic, Russia, and China being major examples.

The house of Socialism has always been a commodious but quarrelsome one.

Marx himself devoted a great deal of time and energy to a defense of his sentific socialism and to an attack upon those of his fellow socialists who disagreed with him. In 1872, following a long and bitter doctrinal dispute between Marx and the anarchist, Michael Bakunin the international Association of working men which Marx had helped to found in 1864, collapsed marx and Bakunin agreed upon many points, but the anarchists rejected marx's Program of political action and his argument that a dictatorship of the proletariat would have to precede an anarchist and

comm un stic community bakunin's view was that man had already been prepared, by a long and arduous evolutionary development to live a life free from governmental outhority and that it was only necessary to stage a revolution that would destroy.

ارتقائے اشتمالیت مابعد مارکس

Destroy the existing state to achieve such an idyllic existence marx regarded this view as arrant nonsense of the radical and utopian kind which had long damaged the socialist cause. It was, he thought a far cry from his own scientific practical and hardeaded proposals. Marx says that socialists. generally embraced the principle of revolution when they were convinced that it constitued their only chance of success.

مارکس ازم کے حامی مفکرین نے بعد ازاں مارکسزم میں کمی بیشی کی اور بعد کے مفکرین کے نظریات ایک دوسرے کے اتنے متضاد ہیں کہ مارکسزم ان سے الگ نظر آتی ہے۔ درحقیقت مارکسزم ایک ایسا نظام ہے جس کو واضح طور پر نہ ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی نفی کی جا سکتی ہے۔ مارکسزم کے دعویداروں نے مارکسزم کو ایک درست اور مکمل نظام ہے لیکن بعد کے مفکرین میں اختلاف کیا جاتا ہے۔ ان مفکرین نے انیسویں صدی کی اشتمالیت کو بیسویں صدی کے حالات کے مطابق ڈھالنے کی تگ و دو کی لیکن مکمل طور پر مارکس نے اصولوں کو بھی مفکر غلط قرار نہیں دیتا بلکہ ان کا خیال ہے مارکس کی تصانیف الہامی کتب کا درجہ رکھتی ہیں جن میں توجیہہ کی ضرورت ہے اس بنا پر فروشیف سٹالن، لینن اور ماؤ زے تنگ نے مارکسیت کو پسند کیا گرچہ ان مفکرین اور ہمنواؤں کے آپس میں شدید اختلافات تھے لیکن پھر بھی ہر مارکسیت کو درست سمجھنے کے داعی تھے۔

سوال: کارل مارکس نے نظریہ تاریخ کی مادی تعبیر پر بحث کریں۔

سوال: مارکسزم کیا ہے اس نے ماوزے تنگ اور چینی انقلاب کے عمل کو کیسے متاثر کیا۔

سوال: مارکس کا نظریہ قدر زائد بیان کریں (2002 ,2006 ,2007 ...)

Karal Marx کارل مارکس

پس منظر:

جواب: ۱۹ ویں صدی کے ابتدائی ایام میں مغربی یورپ میں صنعتی سرمایہ دارانہ نظام مضبوطی سے قدم جما چکا تھا۔ خاص کر یہ نظام انگلینڈ میں پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب سرمایہ دار کی کافی حد تک حوصلہ افزائی ہو رہی تھی وہ صنعتی انقلاب برپا کرنے کے دعویدار تھے۔ کلاسیکل سکول کے رکن جو کہ آدم سمتھ کے نظریات کے پیروکار تھے اس چیز کو نہ پسند کرتے تھے لیکن اس کے لیے وہ مناسب روئیں کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔

رابرٹ مالتھس Robert Malthus (1766 to 1834) نے مستقبل میں کرہ ارض پر انسانی آبادی کے بڑھنے کے ساتھ معاشی ضروریات کے بڑھنے کا نظریہ بڑے مفصل انداز میں پیش کیا اور ڈیوڈ ریکارڈو (David Ricardo) (1772 to 1823) معاشی ضروریات کا آبادی کے بڑھنے کے ساتھ اپنے انداز میں نظریہ پیش کیا انہی دنوں معاشرے میں صنعتی سرمایہ دار ایک نئے طبقہ کی حیثیت متعارف ہو چکے تھے۔ صنعتی مزدور کم اجرت پر زیادہ محنت سے ان کے لئے سرمایہ کا انتظام کر رہے تھے کئی انگریز مصنف کارل مارکس سے پہلے اس غیر منصفانہ معاشی سوسائٹی سے نالاں تھے۔ ولیم تھامسن (William Thomas) جان گرے (John Gray) تھامس ہیگسن (Thomasc Hadg) اور مزدور طبقہ کو ایک محنت کش طبقہ کے روپ میں پیش کیا جو اپنے مالکان کے لیے سرمایہ مہیا کرتے تھے ان دنوں انگلینڈ اور فرانس میں آٹو پین سوسائٹی جو کہ ہنری ڈی سینٹ سائمن چارلس اور لوئیس بلینک پر مشتمل تھی انہوں نے کہا کہ ذاتی جائیداد غربت کا سبب بنتی ہے۔

حالات زندگی:

سرمایہ دار طبقہ اور مزدور کی کش مکش کے دوران جرمن میں ایک ایسا یہودی پیدا ہوا جس کا نام کارل مارکس تھا۔

کارل مارکس 5 مئی 1818ء کو جرمنی کی ریاست پرشیا کے صوبہ رائن لینڈ (Rhenish) کے علاقے ترویز (Treves) میں پیدا ہوا اس کا باپ ایک ابھرتا ہوا وکیل تھا جبکہ اس کے ماں اور باپ دونوں یہودی تھے۔ دوسرے یہودی خاندانوں کی طرح پرشیا (Prussia) میں نپولین کوڈ (cod) کے قیام سے فائدہ اٹھایا لیکن یہودیوں کے خلاف خاص عناصر امتیاز روا رکھے ہوئے (Mosliemic)

تھے اپنے روپے گئے ذریعے تاہم اس دور کی حکومت نے کارل مارکس کے ننھے ذہن [illegible] تلخیاں بھر دی تھیں۔

جس کی وجہ سے اس کا ذہن ایک انقلابی سوچ کا حامل ہو گیا۔ جب کارل مارکس کی عمر چھ سال ہوئی تو اس خاندان کے افراد نے یہودیت سے کنارہ کشی اختیار کر کے عیسائیت کو اختیار کر لیا کارل مارکس بچپن ہی سے ذہین فطین بچوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے ابتدائی تعلیم ترویش (Treves) کے گرامر سکول میں حاصل کی 1835ء میں بون کی یونیورسٹی میں جانا شروع کیا۔ بعد میں برلن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا جہاں اس نے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی اور اس پر فلسفے کے اثرات نمودار ہونا شروع ہوئے اس نے جینا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی جہاں سے اس نے 1841ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس وقت اس کی عمر صرف 23 سال تھی اس کے اساتذہ اس کی قابلیت اور صلاحیت کے معترف تھے۔

مارکس کی خواہش تھی کہ وہ بطور استاد کے پیشہ اختیار کرے مگر اس کے انقلابی خیالات کی وجہ سے یونیورسٹی کی اتھارٹی نے اس کو بطور پروفیسر منتخب کرنے سے انکار کر دیا۔ حکومت اس کی انقلابی سوچ کی وجہ سے اس کو ناپسندیدہ شخصیت خیال کرتی تھی کارل مارکس نے اتنی [illegible] یونیورسٹی اعلیٰ ذہانت کے باوجود روزی کمانے کے لئے مجبوراً صحافت کے شعبہ کو اختیار کیا۔ اگرچہ یہ شعبہ اس کا پسندیدہ نہ تھا لیکن اس کے ذریعے وہ اپنے نظریات کو دوسروں تک منتقل کر سکتا تھا۔

اس دوران اس نے مزدور طبقہ کی ایک جماعت زنتنگ (Zeitung) بنائی 1842ء میں کارل مارکس ایک اخبار کا ایڈیٹر بن گیا لیکن حکومت کو اس پر پابندیاں عائد کرنا پڑیں اس دوران کارل مارکس نے جینی وون (Jenny Vonwestphalen) سے شادی کی Jenny [illegible] ایک سول سرونٹ اور حد درجہ کے اعلیٰ طبقہ کی بیٹی تھی جس نے اپنے طبقہ کو کارل مارکس کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔

حالات نے کارل مارکس کو اشتراکی نظام کا زبردست حامی بنا دیا۔ صحافت کا پیشہ اس کے نظریات کو تقویت دینے کے لیے سود مند تھا۔ اس دوران انقلابی سرگرمیوں کے سبب حکومت پریشان نے اس کو جلا وطن کر دیا اس کے والدین نے اس کو ابتدائی تعلیم میں مذہبی۔ نسلی اور دیگر تعصبات سے نفرت کی تعلیم دی تھی۔ اور معاشرتی انصاف کی حمایت اس کی خاندانی روایت تھی۔ وہ جرمن باشندوں کی طرح سلطنت روس کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ پرشیا (Prussia) سے جلا وطنی کے بعد فرانس میں قیام کیا اس دوران اس کی ملاقات ماہر سیاسیات پراؤ ڈھن (Proudhan) سے ہوئی جس نے اس کی سوچ اور نظریات کو دیکھتے ہوئے انقلابی تحریروں کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ پیرس میں اس کے قیام کا عرصہ 1843ء سے 1849ء پر محیط ہے چنانچہ مارکس نے افلاس کا فلسفہ (Philosophy of Poverty) نامی کتاب کے برعکس ایک کتاب فلسفے کا افلاس (Poverty of Philosophy) شائع کی اس میں مارکس نے اشتراکیت کی حوصلہ افزائی [illegible] کتاب

ں شاعت کے بعد اس کے حلقہ احباب میں وسعت پیدا ہوئی ایک جرمن صنعت کار کا بیٹا فیڈروک ا-ئنگلز (Friedrich Engels) اس کا گہرا دوست بن گیا ا-ئنگلز کا خیال تھا کہ اس کے خاندان کی قسمت کو بنانے والے مزدور ناانصافی کا شکار ہیں اس لیے وہ مزدوروں کو ان کی محنت کے مطابق اجرت دلانے کے لئے کوشاں تھا جب مارکس کی ملاقات پہلی دفعہ ا-ئنگلز سے ہوئی دونوں ایک دوسرے کو مل کر مسرت محسوس ہوئے- مزدوروں کے حقوق کے بارے میں یکساں خیالات ان کو گہرے دوستوں میں بدل دیا ا-ئنگلز مارکس کے نظریات سے خاصا متاثر تھا- اور ایک کولیگ کی حیثیت سے کئی معلومات فراہم کیں اور ان کی دوستی مارکس کی وفات تک قائم رہی- ا-ئنگلز مارکس کا نہ صرف ایک دوست ایک پیروکار اور کوورکر (Co-worker) تھا بلکہ اس نے مارکس کے مالی حالات سدھارنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی-

چونکہ ان دنوں مارکس اپنے خاندان کے ہمراہ کافی غربت اور افلاس زدہ زندگی گزار رہا تھا- اس کے بچے بھوک اور افلاس کی وجہ سے بیماری سے لڑتے ہوئے چھوٹی عمر میں ہی چل بسے تھے- جبکہ مارکس کی بیوی دائمی مریضہ بن گئی-

184ء میں مارکس Marx اور ا-ئنگلز Engels نے مل کر ایک کتاب Manifesto Communist اشتمالی منشور کے نام سے تحریر کی جو کہ 1948ء میں شائع ہوئی- دونوں جوان انقلابی سرگرمیوں میں بہت زیادہ جذباتی طور پر منسلک تھے-

مارکس نے اس کتاب کے ذریعے غیر طبقاتی معاشرے کی تشکیل پر زور دیا اور واضح کیا کہ کن اصولوں کو اختیار کرکے سرمایہ وارانہ نظام سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے اور اس میں اشراکیت کی حوصلہ افزائی کی اور جب اس ملک میں انقلاب ٹوٹ پڑا مارکس دوبارہ جرمنی آیا اور اس نے ایک اخبار میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا نیو زیٹنگ Neue Rheinshezeitung کارل مارکس کا انقلابی نظریات کو تقویت دینے والا رسالہ تھا- حکومت نے اس کی سرگرمیوں کے سبب کارل مارکس کو گرفتار کیا لیکن ہمدرد جیوری نے اس کو اس کی ذہانت اور قابلیت کے سبب آزاد کرکے اس ملک سے چلے جانے کا حکم دیا- مئی 1849ء میں حکومت نے اس کو ایکس پل Expelled کر دیا-

فرانس میں قیام کی اس کو اجازت تھی لیکن حالات کچھ اس قدر گھمبیر تھے کہ اس نے اس کو نظر انداز کرکے اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں رہائش اختیار کی اور زندگی کے آخری دم تک یہاں مقیم رہا حالات کی ستم ظریفی نے اس کے اندر مزید تلخیاں پیدا کر دیں- 1864ء میں وہ انٹرنیشنل ورکنگ مین ایسوسی ایشن تنظیم سے منسلک ہو گیا لندن میں وہ جنرل کونسل کا بھی ممبر رہا اور اس تنظیم کا ایک اہم قائد شمار کیا جانے لگا- وہ اپنی زندگی اور کمائی کا تمام سرمایہ تحقیق اور اشاعت تحریر پر صرف کر دیتا تھا جبکہ لیکن افلاس اور جسمانی کمزوری کے باوجود وہ اپنی زندگی میں ہی یورپی محنت کشوں کا قائد تسلیم کیا جانے لگا- لندن میں قیام کے دوران بھی مارکس نے صحافت کے پیشے کو ہی اپنے لئے بہتر سمجھا- اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے حلقہ احباب میں دانشور بڑی تعداد میں شامل ہو

چکے تھے جو کہ اس کے بوسیدہ گھر میں اس کے قریب بیٹھ کر فخر محسوس کرتے تھے اور [illegible]کس کے علم سے فیض یاب ہوتے تھے مارکس آخر کار 14 مارچ 1883ء کو وفات پا گیا اور لندن میں دفن ہوا
ا۔ینگلز نے مارکس Mark کے چھوڑے ہوئے مقالے مکمل کروا کر شائع کرائے

تصانیف مارکس :

کارل مارکس Marx کی زندگی تلخ تجربات کا پیکر رہی چونکہ وہ اشتراکی ذہنیت [illegible] مالک تھا اور طبقات کی تقسیم سے نالاں تھا۔ اس نے متعدد کتب اور مقالے تحریر کئے جس کی وجہ [illegible] اس کی کمائی کا زیادہ حصہ اس کی تحریروں پر صرف ہو جاتا اور اس کو اپنے خاندان سمیت غربت [illegible] افلاس کے ساتھ زندگی بسر کرنا پڑتی ا۔ینگلز نے اس کی خاندانی حالت کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی اور کافی مالی معاونت کی لیکن وہ کتابیں شائع کروا اور اپنے نظریات دوسرے لوگوں تک پہنچ [illegible] خوشی محسوس کرتا۔

اس کی چند ایک کتب درج ذیل ہیں۔

1- Eleve[illegible]th[illegible]ses of fever bach 1845
2- The G[illegible]n Idialogy (with Engels) 1846
3- Pove[illegible]ty [illegible] Philosophy 1847
4- The C[illegible]ass [illegible]truggles in france 1850
5- The C[illegible]iti[illegible]e of Political Economy 1859
6- Das C[illegible]apit[illegible] 1883

ان کتب میں مارکس کے دوست فیڈرک ا۔ینگلز نے بھرپور معونت کی یہی [illegible] کہ ان کتب کو فیڈروک ا۔ینگلز اور مارکس کی مشترکہ کاوشوں کا ثمر کہا جاتا ہے۔

جبکہ چند ایک کتب ایسی ہیں جس میں مارکس نے انفرادی کام کیا اور اپنے [illegible] دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی تگ و دو کی مثلاً:

1- اشتمالی منشور	Comm[illegible]un[illegible] Mani Fisto
2- فلسفے کا افلاس	Pove[illegible]ty [illegible] Philosophy 1847
3- سیاسی اقتصادیات پر تنقید	Critic[illegible]e [illegible]f Political Economy 1859
4- سرمایہ	Das [illegible]ap[illegible]al 1883

مارکس کی ان کتب کو عالمی سطح پر کافی پزیرائی اور شہرت حاصل ہوئی مارکس [illegible] سیاسی فلسفہ کا نچوڑ ان کتب کو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اشتمالی منشور Communist Manifesto 1849 : مارکس نے اس مقالے [illegible] سرمایہ دارانہ نظام کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور جتایا کہ ماضی میں سرمایہ دار طبقہ نے مزدور کا استحصال کر [illegible]

کے اقتدار کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اپنی ذہانت کے بل بوتے پر آج تک نہ صرف سرمایہ پر قابض ہیں بلکہ اقتدار بھی ان کے قبضہ میں ہے یہی وجہ ہے کہ مزدور تو غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں اور امیر طبقہ معاشرے میں بلند مقام حاصل کر لیتا ہے مارکس کی تصنیف نے عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ طبقات کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور وہ اس کے مخالف بن گئے۔ اس کو شائع کرانی میں اس کے دوست فیڈرک اینگلز کا گہرا ہاتھ ہے۔

فلسفے کا افلاس Poverty of Philosophy :

کارل مارکس نے اپنی اس کتاب میں رابرٹ کی کتاب افلاس کے فلسفے پر نکتہ چینی کی اور اس کے اشتراکی فلسفے کو خام خیالی کا نام دیا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے فلسفہ نہ تو اشتراکی فلسفے کے اصولوں کے مطابق ہے اور نہ ہی تاریخ جدلیات سے اس کی کوئی مطابقت ہے کارل مارکس نے فلسفے کے افلاس کو دلائل کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی۔

سیاسی اقتصادیات پر تنقید Critique of Political Economy :

Marx نے اپنی اس تصنیف میں جدلیاتی مادیت کی واضحات کی اور بتایا کہ مزدور دن رات اپنے خون پسینہ کی کمائی سے کس طرح ایک اعلیٰ طبقہ کی تجوریاں بھرنے کا سبب بنتے ہوئے ہیں اور کس طرح ایک اعلیٰ طبقہ کم اجرت پر ان کو زیادہ محنت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔
اور ایک مزدور غربت اور افلاس کی مجبوری کے سبب سرمایہ دار کی ناانصافی کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتے۔

سرمایہ Das Capital :

مارکس نے اس کتاب میں معاشی مسائل پر بڑی فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے اس کتاب میں سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافیوں' بدعنوانیوں کے علاوہ اس میں پائے جانے والے اہم اور بنیادی فرق کو بھی واضح کیا ہے مارکس کا خیال ہے کہ یہی فرق اس نظام کے تنزل کا سبب بن سکتا ہے مارکس کا خیال ہے کہ حقیقی آزادی کا اصول اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک معاشی مساوات کا قیام عمل میں نہ لایا جائے اور سرمایہ کی تقسیم مساوی بنیاد پر نہ ہو۔ مارکس کا خیال ہے کہ مزدور کا استحصال اس کی حق تلفی ہے۔
دنیا میں کئی انقلابات رونما ہوئے لیکن کسی نے بھی مزدور کا دفاع نہ کیا بلکہ ہمیشہ سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کی جس کی وجہ سے مزدور تنگ دستی کا شکار ہو کر رہ گئے اور صنعت کار عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اگرچہ ملک کی صنعتی ترقی میں زیادہ ہاتھ مزدور کا ہوتا ہے لیکن اس کا اجر مزدور کو نصیب نہیں اس لئے اس صنعتی ترقی کا کوئی فائدہ نہیں جو حقدار کو اس کا حق فراہم کرنے سے

محروم رہے۔

مارکس کے فلسفے کا ماخذ :

Marx مارکس معاشرہ میں پائی جانے والی معاشی' معاشرتی اور سیاسی ناہمواریوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اس بنا پر وہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں انقلاب کا حامی تھا۔ معاشرتی ناانصافیوں اور معاشی استحصال نے مارکس کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے جس کی وجہ سے وہ انقلابیوں سے وابستہ ہو کر جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔

زمانہ طالب علمی میں مارکس نے ہیگل کے نظریات کو بڑی توجہ سے پڑھا اور اس کے نظریہ اضدادیت Dialectics کو اپنے فلسفہ کی بنیاد قرار دیا ہیگل کے مطابق دنیا کی کوئی چیز بھی مکمل کی صورت اختیار کرنے سے پہلے ارتقائی مراحل طے کرتی ہے اور ان مراحل کے دوران اس پر مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں آہستہ آہستہ وہ مختلف مراحل سے گذرنے کے بعد تصور کامل کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

جبکہ مارکس کا خیال ہے کہ ارتقائی منازل سے متعلق عینیت کا نظریہ Idea Theory حقیقت پر مبنی نہیں کیونکہ تمام تغیراتی مراحل اور تبدیلیوں کی وجہ سے مادی (Material) ہے۔ اگر ہم تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کریں تو معلوم ہوگا کہ مارکس کے نظریات پر ماضی کے مفکرین کی گہری چھاپ ہے گرچہ مختلف مفکرین نے اپنے نظریات کو الگ الگ پیش کیا جس کو جمع کرنے کا سہرا مارکس کے سر جاتا ہے۔ مثلاً مارکس کا نظریہ اشتراکیت ماضی میں بھی موجود تھا۔ اور افلاطون اور ارسطو نے مثالی ریاست کے تصور میں طبقات کی تقسیم کے دوران میاورانہ اصولوں پر بھی زور دیا اسی طرح تاریخی مادیت کا نظریہ سب سے پہلے اشتراکی مفکر پیرنگٹن نے پیش کیا

اور طبقاتی کشیدگی کا نظریہ سائمن کا پیش کردہ ہے اور بابائے معاشیات آدم سمتھ نے قدر زاید کا نظریہ پیش کیا اور بعد میں اشتمالی انقلاب کے اصول مارکس نے 1789 کے فرانسیسی انقلاب سے حاصل کئے۔ لیکن اس کے باوجود کارل مارکس کی خوبی ہے کہ اس نے تمام نظریات کو جمع کر کے ایک گلدستہ کی شکل دی اور کارل مارکس یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ سرمایہ دارانہ نظام معاشرے کے بنیادی مقاصد کے قطعاً خلاف ہے۔

مارکس نے قدیم یونانی مفکر ارسطو کے برخلاف انسان کو سیاسی کی بجائے معاشی حیوان کا نام دیا اور نظام زندگی کا مرکز صرف مادیت کو گردانا وہ کائنات کی تمام تر تبدیلیوں کا محور مادہ کو تسلیم کرتا ہے۔ اور مارکس کا خیال ہے کہ واقعی انسان ہمدرد اور نیک ہے لیکن انسان خطا اور مفاد پرستی کے مجموعے کا نام بھی ہے کیونکہ ایک مادہ اس کو خود غرضی اور مفاد پرستی کی طرف راغب کرتا ہے اور وہ ہر کام مادی فائدے کی وجہ سے انجام دیتا ہے اسی وجہ سے وہ انسان کو مفاد پرست قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں معاشرے کی فلاح صرف نظام اشتراکیت کے ذریعے ممکن ہے کیونکہ یہ نظام ایک منصفانہ اور مساویانہ اصول فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔

۔ رکس کا خیال ہے کہ مزدوروں کی طرز حیات تبدیل کرنے کے لئے معاشرے میں صرف سرمایہ دارں کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہی لازم نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اشتراکی انقلاب کا عملی ثبوت فراہم کیا جائے۔ سیاسیات کی تاریخ میں اسلام کے بعد اس نے ایک منفرد ضابطہ حیات اپنے نظریہ اشتمالیت کی صورت میں پیش کیا۔

کمیونزم یا مارکسزم Communism or Maraism :

کمیونزم کو مارکسزم کا نام دیا جانے لگا کیونکہ مارکس نے کمیونزم یعنی نظریہ اشتمالیت کو پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا نظریہ مارکسی سے مراد نظریہ کمیونسٹ بھی ہے۔ یعنی مارکسزم اور کمیونزم ایک ہی اصولوں کے دو نام ہیں۔ کمیونزم دراصل نظریہ اشتراکیت Socialism کی ایک نظریاتی صورت ہے۔ مارکس کو اشتمالی نظریہ پیش کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ سرمایہ دارانہ نظام نچلے طبقے کا استحصال بے دردی سے کر رہے تھے۔ مارکس اس وقت کے نظام معیشت کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ سرمایہ دارانہ نظام معاشرہ میں طبقاتی جنگ کا سبب ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے نمبر ایک بورژوا یعنی امیر طبقہ اور نمبر 2 مزدور طبقہ ان دونوں طبقات کے درمیان اقتصادی کشیدگی مسلسل جاری ہے۔ اور معاشرے کو طبقاتی جنگ سے بچانے کے لئے اشتمالی اصولوں کو لاگو کرنا لازم ہے۔ انہی نظریات کی بنیاد پر مارکس کو اشتراکی مذہب کا سردار اور پیغمبر کہا جانے لگا۔ اور کمیونزم کو مارکسزم کا نام دے دیا گیا۔ آج مارکس کا یہ نظریہ عملی شکل اختیار کر کے کرہ ارض کی نصف آبادی پر حکمرانی کر رہا ہے۔ سوویت یونین روس اور عوامی جمہوریہ چین نے بھی اس نظریہ کو اختیار کر کے دنیا میں نام پیدا کیا۔ 1917 کا عظیم روسی انقلاب اور 1949ء عوامی جمہوریہ چین کا انقلاب مارکس کے نظریہ کا عملی ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ کئی مشرقی یورپ کی ریاستی اشتراکی ممالک کہلانے پر فخر محسوس کرتی ہیں۔

بورژوا اور پرولتاری طبقہ

Bourgeoisic Class and Proletariat Class

بورژوا اور مزدور طبقہ بورژوا اور پرولتاریہ طبقہ :

اگر مارکس کے نظریات کا مطالعہ کریں تو اس کے نظریات کا موضوع دو الفاظ بورژوا اور پرولتاریہ بار بار استعمال ہوتے نظر آتے ہیں۔ مارکس کا خیال ہے کہ معاشرہ ابتدا سے ہی طبقاتی کشیدگی کا شکار رہا ہے۔ اس کی وجہ دو طبقات کا امتیازی فرق ہے۔ ایک طبقہ پرولتاریہ مزدور اور محنت کش طبقہ پر مشتمل ہے اور دوسرا طبقہ مراعات یافتہ سرمایہ دار پر مشتمل ہے اس سرمایہ دار طبقہ کو بورژوا طبقہ کا نام دیا گیا یہ طبقہ محنت کش طبقہ سے مسلسل بدسلوکی اور ناانصافی کرتا چلا آرہا ہے۔ جبکہ مزدور

وسائل کی کمی کے سبب نہ تو اپنے مسائل پر قابو پا سکتا ہے اور نہ ہی بورژوا طبقہ سے اپنے حق تلفی کا حساب مانگ سکتا ہے۔ بورژوا طبقہ چونکہ خود کو تمام ذرائع پیداوار کا مالک ظاہر کرتا ہے اور محنت کش طبقہ اپنی افلاس کے سبب معمولی اجرت کے عوض سخت کام کرنے کو تیار ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بورژوا طبقہ محنت کش طبقہ کی مجبوری سے ناجائز فائدہ حاصل کرتا ہے اور ان کو بنیادی حقوق سے محروم کرکے اپنے زیر سایہ رہنے پر مجبور کرتا ہے اور ان کو ان کی محنت کا مناسب معاوضہ بھی نہیں دیتا ہے اور نہ ہی ان سے ہمدردی کرتا ہے، بلکہ اپنی سہولیات اور مراعات کے سبب اقتدار پر قابض ہوکر ریاست کے اختیارات بھی خود استعمال کرتا ہے اور ان اختیارات کے ذریعے مزدور کو جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے لہٰذا بورژوا طبقہ معاشرے کا ظالم ترین طبقہ تصور کیا جاتا ہے۔

مارکس ازم کے بنیادی اصول

1789ء، 1830ء اور 1848ء کے انقلاب فرانس نے درمیانہ درجہ کے لوگوں کو کافی فائدہ پہنچایا کیونکہ ان درمیانے درجہ کے لوگوں کا انقلابات کے بعد مختلف قسم کی جائیداد کے مالکانہ حقوق میسر آئے۔ اور یہ طبقہ بورژوای کلاس میں شمار ہونے لگا۔ 1789ء کا انقلاب اگرچہ آزادی مساوات اور اخوت کا دعویدار تھا لیکن اس میں بری طرح معاشرتی ناانصافی برتی گئی۔ انقلابات کے دوران جان اور مالی قربانیوں کو پیش کرنے والے بنیادی حقوق سے محروم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے اقتصادی مساوات قائم نہ ہو سکی۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد غریب اور مزدور پیشہ طبقہ کی حالت اس قدر بری تھی کہ مارکس کو اشتمالیت کے اصول وضع کرنے پڑے۔ مارکس نے اپنی کتاب سرمایہ کی پہلی جلد میں معاشرتی ناانصافی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ امیر طبقہ اپنے لیے نفیس کپڑا اور بہترین کے لئے عمدہ نقاب حاصل کرنے کے لئے انسانی گوشت کو بری طرح عذاب کا شکار کرتا ہے۔ ایک طبقہ تو آسائشوں سے مرصع خوبصورت گھروں میں آرام کی زندگی بسر کرتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ کی کیفیت کچھ یوں ہے کہ بریڈ فورڈ میں 1500 مکعب فٹ کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں دس انسان زندگی بسر کرتے ہیں اور بعض گھروں میں تو 435 بستروں پر 1450 انسان سوتے ہیں اور بستروں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ چیتھڑے لٹکے ہوئے ہیں بعض لوگ تو بستر کے بغیر سوتے ہیں بعض گھروں میں تو تنگ و تاریک کمروں میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مل کر ایک ہی جگہ رات بسر کرتے ہیں اور اس قدر گھناؤنی زندگی میں صرف بیماری اور موت کے سائے ہی ان کے مددگار ہوتے ہیں۔ بچوں کی حالت کچھ اس طرح سے ہے کہ نوٹنگھم میں پندرہ بیس بچے ایک بارہ فٹ کے کمرے میں اکٹھے زندگی بسر کرتے ہیں۔

غربت اور افلاس کے مارے ان بچوں سے سرمایہ دار لوگ پندرہ گھنٹے تھکا دینے والا کام لیتے ہیں اور بچے اپنی افلاس کے سبب اتنے تواتر اور سرعت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں کہ ان کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں سستی کرنے پر نکال نہ دیئے جائیں اور چھوٹی عمر کے بچوں کو ان چو بچے

رات کو بستروں سے نکال کر کام پر لگا دیا جاتا ہے جہاں وہ رات کے گیارہ بجے تک محنت کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے جسمانی اعضا کمزور اور چہرے زرد ہوتے ہیں لیکن اس کا معاوضہ ان کو مکمل خوراک کی صورت میں بھی نہیں دیا جاتا- مارکس کا خیال ہے کہ اس قسم کی ناانصافی جنگ و جدل کو جنم دیتی ہے اور پھر معاشرہ خلفشاری کا شکار ہو جاتا ہے- مارکس کے نزدیک اس انسانیت سوز حالات کا ذمہ دار خود انسان نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں تبدیلی ضروری ہے تاکہ انسان پر سکون زندگی بسر کر سکے- مارکس اس وقت کے حالات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد اشتمالیت کے بنیادی اصول پر بحث کرتا ہے جو کہ درج ذیل ہیں-

جدلیاتی مادیت

Theory of Dialectic Materialism

جدلیات Dialectic کے معنی تصادم یا کشیدگی کے ہیں کارل مارکس کا پیش کردہ نظریہ جدلیات دراصل ہیگل کا نظریہ ہے کارل مارکس نے جدلیات کی بنیاد مادہ پر رکھی جبکہ ہیگل نے جدلیات کی بنیاد تصور Ideal پر رکھی مارکس کے نزدیک مادیت ہی جدلیات کی بنیاد ہے اس نے خود کہا "میرے نزدیک مادی دنیا کے علاوہ اور کوئی آئیڈیل نہیں مادیت ہی انسانی ذہن میں منعکس ہو کر مختلف خیالات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے-

پروفیسر کول کے نزدیک ہیگل کا خیال ہے کہ کائنات خدا کی منطق کا مظہر ہے اس منطق کی رو سے کائنات دائمی تصادم اور کش مکش کے سبب قائم ہوئی- یعنی جدلیات ہی کائنات کی تخلیق کا سبب ہے- ہیگل کے نزدیک تصورات و خیالات کے درمیان کشیدگی پائی جاتی ہے کسی خاص خیال کے خلاف دوسرا جوابی خیال Antithesis پیدا ہوتا ہے پھر دونوں خیالات کے درمیان کشیدگی پیدا ہوتی ہے- اس کے نتیجے میں دونوں خیالات ایک دوسرے سے ملاپ کرتے ہیں اور اس طرح ایک نیا خیال جنم لیتا ہے- اس نئے خیال کو ہیگل نے امتزاج Synthesis کا نام دیا کچھ عرصہ بعد اس نئے خیال کے تضاد میں ایک اور نیا خیال پیدا ہوتا ہے اور اس طرح ان میں تضاد پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی زندگی کے ساتھ جاری رہتا ہے جبکہ مارکس کا خیال ہے کہ کائنات کی تمام تر تبدیلیاں مادی وجوہات کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں اور انسان کی نشوونما مادی اشیاء کے مرہون منت ہوتی ہے- اگرچہ مارکس ہیگل کے نظریہ جدلیات سے کافی متاثر تھا لیکن وہ تصورات کی جگہ مادیت کو دیتا ہے مارکس ہیگل کے فلسفہ جدلیات سے بے حد متاثر تھا تصور Ideal کسی بھی صورت میں اصل نہیں بلکہ مادہ ہی اصل ہے- کیونکہ مادی اشیاء ہی تصورات کو جنم دیتی ہیں- ہیگل کے برعکس کارل مارکس نے کائنات کی تمام تر تبدیلیوں کا بنیادی محرک بھی مادہ ہی کو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ کائنات کی تمام تر تبدیلیاں اور انقلابات محض مادی مسائل کی بنیاد پر رونما ہوتے ہیں اور تمام تر کشمکش جنگ و جدل اور تصادم مادیت کی وجہ سے ہی ہوتا ہے یعنی کہ مارکس کائنات کی تمام تبدیلیوں کی بنیاد تصوراتی کش مکش کی بجائے

مادی کشیدگی کو قرار دیتا ہے اس کے خیال میں تمام تبدیلیوں کا محرک مادہ ہی ہے۔

مارکس نے جدلیاتی نظریہ Dialectical Materialism کا نظریہ پیش کر کے اشتمالی معاشرے Communist Society کو اس کا حل بتایا۔ اس کا خیال ہے کہ اشتمالی معاشرہ ہی معاشرتی مسائل کے حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اشتمالی معاشرہ ہر طرح کے عیب سے پاک معاشرہ ہے۔ اس معاشرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں طبقات کی تقسیم کا نام تک نہیں اور یہ معاشرہ پیداوار کے نظام کو اس طرح قائم کرے گا کہ ایک انسان دوسرے کی محنت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ بلکہ خود اس کی اپنی ذات کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ اور اس کو اس کی محنت کے عوض مناسب اجرت اور صحیح معاوضہ بھی حاصل ہو جائے گا اور اس طرح سرمایہ دار (بورژوا طبقہ) ناجائز مراعات حاصل کرنے سے دور رہے گا۔ اور سرمایہ کی ذخیرہ اندوزی کا امکان بھی ختم ہو جائے گا چونکہ اس طرح اشتمالی معاشرہ سے سرمایہ دارانہ نظام کی حوصلہ شکنی ہو جائے گی۔ مارکس کا خیال ہے کہ بورژوا اور پرولتاری طبقہ کی کش مکش کا حل صرف، اشتمالی معاشرے کے وجود سے ہی ممکن ہے۔

ماحصل :

اس نظریے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ 1849ء میں کارل مارکس سرمایہ دارانہ نظام کی حوصلہ شکنی کرنے میں مکمل طور پر کامیاب ہو گیا۔ اور پرولتاریہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی جدلیات کا تصور بھی بدل گیا مارکس کا خیال ہے اشتمالی معاشرہ امن و سکون اہم کرنے والا معاشرہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ احساس محرومی اور احساس کمتری جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں ختم ہو جائے گی سرمایہ دولت مند اور مراعات یافتہ طبقہ کے ہاتھوں سے نکل کر تمام لوگوں میں یکساں منقسم ہو جائے گا۔

تاریخ کا مادی نظریہ

Theory of Materialistic International Interpretation of History

کارل مارکس Marx نے تاریخ کا مادی نظریہ اپنی مشہور کتاب Dascapital میں بڑے مفصل انداز میں پیش کیا۔ اگر اس نظریہ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی ہیگل سے مستعار لیا ہوا نظریہ ہے مارکس کا خیال ہے کہ انسان کے مذہبی' سماجی' معاشی' معاشرتی اور اخلاقی اقتصادی اور سیاسی خیالات میں اور اس کے بنائے ہوئے اداروں میں تسلسل کے ساتھ ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور انسانی خیالات اعمال اور افعال میں تبدیلیاں رہتی دنیا تک رونما ہوتی رہیں گی اور مخصوص قوت جو ان تبدیلیوں کا سبب بنتی ہے ہیگل کا مطلق تصور نہیں بلکہ زندگی کا مادی ماحول ہے

مارکس کا خیال ہے کہ انسانی شعور مادی ماحول کا تعین نہیں کرتا بلکہ مادی حالات انسانی شعور کو متعین کرتے ہیں۔ مارکس کا خیال ہے اقتصادی و معاشی عوامل انسانی امور کو انجام دینے میں زیادہ سود مند ہوتے ہیں بہ نسبت اخلاقی مذہبی اور سماجی امور کے۔ اس کی مثال مارکس نے امریکہ میں غلامی کے خاتمہ سے دی ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ یہ غلامی کا خاتمہ کسی انسانی ہمدردی کے سبب نہیں بلکہ معاشی وجود کی بنیاد پر ہے۔ جب امریکہ کی شمالی ریاستوں نے محسوس کر لیا کہ غلاموں کی محنت آزاد مزدور کی محنت سے معاشی طور پر زیادہ مفید نہیں تو انہوں نے غلاموں کو آزادی فراہم کرنے کا تہیہ کیا اور معاشرے میں انقلاب برپا کر کے غلاموں کو آزادی عطا کی ہیگل کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب قومی تمدن کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ اور انسانی تہذیب کے نشوونما میں مختلف اقوام کی تمدنی زندگی کا کچھ حصہ رہا ہے۔

Theory of Materialism of History

مختلف اقوام کے درمیان مختلف تصورات کی وجہ سے کشمکش رہی ہے اور اس کشیدگی کی وجہ سے انسانی تاریخ آزادی کے تصور کے حصول کی جانب گامزن رہی مارکس کے نزدیک انسانیت قوموں کی بجائے طبقوں میں بٹی ہوئی ہے اور جدلیات کا عمل قوموں کے مابین نہیں بلکہ طبقات کے درمیان جاری ہے اور ان طبقوں کے درمیان کشیدگی جاری ہے اور یہ کشیدگی کسی قوم کی فتح پر ختم نہ ہوگی بلکہ پرولتاریہ طبقہ (مزدور طبقہ) کے حقوق کی فراہمی پر ختم ہوتی۔ مارکس کا خیال ہے کہ معاشی بنیادوں پر انقلابات رونما ہوتے ہیں یہ انقلابات اس وقت جاری رہیں گے جب تک پرولتاریہ (مزدور) طبقہ اپنے حقوق مکمل طور پر حاصل نہیں کرلیتے۔ ہیگل کا خیال ہے کہ جس طرح تاریخ میں تبدیلیوں کی بنیاد اقتصادی وجوہات ہیں بالکل اسی طرح افراد کی آزادی کا انحصار معاشی ترقی پر ہے اگر معاشرہ اقتصادی لحاظ سے خود کفیل ہے اور معاشرے میں معاشی مساوات قائم ہیں تو آزادی فعال ہے بصورت دیگر آزادی کا تصور بے معنی ہے مارکس کا خیال ہے کہ پیداوار کا ایک مفید طریقہ مکمل سماجی تعلقات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یعنی مارکس کے نزدیک انقلابی تحریکات کی حیثیت ایسی ہے جیسی کہ ہیگل کے نزدیک ہے کہ ایک تصور کے بعد دوسرا تصور قابض ہو جاتا ہے۔ مگر مارکس کہتا ہے کہ سیاسی ادارت میں تبدیلی ور انقلابات کی تحریکات دراصل سماجی تعلقات کی نئی صورتیں ہیں جو پیداوار کو نئے طریقوں سے آہنگ کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ تاریخ کی مادی توجیہ کے لحاظ سے انسانی معاشرہ چار ادوار پر مشتمل ہے۔ (1)۔ انسانی غلامی کا دور (2)۔ جاگیرداری معاشرہ (3)۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتمالی معاشرہ

مارکس کا خیال ہے کہ مادی حالات وقت کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اہم ترین مادی وجوہ تخلیقی قوتیں ہیں۔ مادی وجود جاندار اور بے جان دونوں پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ ان میں جسمانی اور دماغی محنت کشوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے تخلیقی قوتوں میں بنیادی حیثیت ان حالات کو حاصل ہے جن کے تحت اقتصادی پیداوار ہوتی ہے۔ ان حالات

میں ریاست کی نوعیت ملکی قوتیں اور معاشرتی گروہ شامل ہیں یہ حالات سیاسی قانونی سماجی مذہبی اخلاقی اور فلسفیانہ نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں اس طرح یہ قوتیں جہد مسلسل کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے رواں دواں رہتی ہیں۔

اس طرح نئے تصورات اور نئی انجمنیں وجود میں آتی ہیں۔ المختصر یہ کہ مارکس کا خیال ہے کہ اگر تاریخ کے مادی نظریہ پر نظر ڈالی جائے تو معاشی مسائل نے وقت کے ساتھ ساتھ انسانیت کو دو طبقات میں تقسیم کر دیا بورژوا اور پرولتاریہ طبقات کے درمیان ایک متوسط طبقہ نے ان دونوں کے درمیان رابطے کا کام کیا۔ بورژوا طبقہ نے اپنی آسائش کی خاطر پرولتاریہ طبقہ کو محنت کی بھٹی میں جھونک دیا۔ اور ابتداء ہی سے مادی ضروریات نے ان دونوں کے درمیان جہاں خلا پیدا کر دیا وہاں ایک دوسرے کے لئے تفاوت بھی ابھر کر سامنے آئی اور یہ کشیدگی معاشرے میں انقلابات کا سبب بنی یعنی معاشرے میں تضاد کی بڑی وجہ اقتصادی مسائل ہیں۔ مارکس نے تاریخ کے مادی نظریہ کے ذریعے معاشیات کو سیاسیات پر حاوی قرار دیا۔ مارکس کا خیال ہے طبقاتی کش مکش اپنے عروج پر پہنچ کر اشتمالی انقلاب برپا کرتی ہے۔ مارکس نے یہ اصول پیش کرکے زندگی کی پیچیدگیوں کو سادہ انداز میں پیش کیا۔

نظریہ طبقاتی کشمکش

Theory of Class Struggle

مارکس کا خیال ہے کہ انیسویں صدی جاگیردارانہ نظام کے عروج کی صدی تھی اس دور میں تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اور اس دوران تاجر پیشہ افراد نے قرون وسطیٰ کے لوگوں کو مزدور بنا کر خوب دولت کمائی۔ اس دوران سیاسی اقتدار بدستور جاگیرداروں کے پاس رہا۔ مارکس کا خیال ہے کہ تاریخ کی ارتقا مذہب، رسم و رواج، تہذیب و تمدن کی وجہ سے نہیں بلکہ معاشی تبدیلیوں کا سبب ہے۔ معاشی نشیب و فراز طبقات کو جنم دیتے ہیں اور پھر یہ طبقات آپس میں چپقلش کا شکار ہوتے ہیں اور اس طرح یہ کشیدگی نسل در نسل جاری رہتی ہے۔ مارکس کے خیال میں ہر طبقہ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی پہچان طبقات کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔

فیڈرک اینگلز کا خیال ہے کہ ریاست کی ابتدا اس وقت ہوئی جب طبقاتی کشیدگی کو کوئی معاشرہ ابتدائی حکومت خود اختیاری کے اصولوں کے مطابق حل کرنے میں ناکام رہا۔ اور سب طاقت ور تنظیم کو معاشرے میں فوقیت دینا لازمی امر بن گیا۔

مارکس کے نزدیک بھی قبائلی معاشرے کے اختتام سے طبقاتی کشیدگی کا آغاز ہوا اور اس کشیدگی کے سبب انسانیت آگے کی طرف گامزن رہی۔ معاشی نظام نے جب طبقات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تو ان طبقات کے درمیان مقابلے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ اور پرولتاریہ کی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ طبقے کے بورژوا کلاس میں شامل ہو کر پر آسائش زندگی گزارے اور یہ خواہش مزدور طبقے میں سخت محنت پر اکسانے لگی اور وہ دن رات کی محنت سے بورژوا جماعت میں شامل ہونے کا خواب

دیکھنے لگا۔

لیکن اس اقتصادی نظام کی غلط پالسی کے سبب معاشرہ جاگیردار اور سرمایہ دار کو حاکم کے روپ میں پیش کرتا ہے جبکہ مزدور طبقہ کو ایک محکوم طبقہ کی شکل دے دیتا ہے اور اس طرح ظاہری یا باطنی طور پر ان دونوں طبقات میں کشیدگی برقرار رہتی ہے قدیم رومی ادوار میں غلاموں اور امرا کے درمیان جب کشیدگی بڑھ گئی تو غلام طبقہ اپنے حقوق کے لیے انقلاب برپا کرنے پر مجبور ہو گیا اور پھر یہ کامیاب رہے مارکس کا خیال ہے کہ طبقات کی تھوڑی بہت تفریق کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ایک جانب جاگیردار ہو اور دوسری طرف مزدور طبقہ جو بے حد مفلسی کا شکار ہو تو پھر یہ افلاس زدہ گروہ آہستہ آہستہ بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ لیکن جاگیردار اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے بلکہ وہ مظالم ڈھانے کے نئے نئے طریقے دریافت کرتے رہتے ہیں۔ سرمایہ دار مزدور طبقہ کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں کم معاوضہ کے عوض زیادہ محنت طلب کرتے ہیں یہی وجہ ہے پرولتاریہ غریب رہ جاتے ہیں اور بورژوا کلاس مزید عروج حاصل کرتی ہے اور حکمران طبقہ سرمایہ کا زیادہ حصہ خود حاصل کرتا ہے اور سیاسی سماجی اور قانونی حیثیت سے اپنی مراعات کو برقرار رکھتا ہے جبکہ محنت کش طبقہ و معاشی نظام کی ترقی سے اپنی جائز کمائی حاصل کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا مارکس کا خیال ہے کہ ابتداء میں سیاسی اقتدار جاگیردار کے پاس تھا لیکن بعد میں یہ درمیانہ طبقہ کی طرف چلا گیا لیکن بورژوائی اور پرولتاری کی کش مکش اقتدار کو بعد میں پرولتاری طبقہ کی جھولی میں بھی ڈال سکتی ہے جس کے بعد سرمایہ داری حق تلفی کرنے والوں کو سزا ملے گی۔ اور پھر نیا معاشرہ جنم لے گا۔ جس میں طبقات نام کی کوئی چیز نہ ہوگی بلکہ سب مساویانہ زندگی گزاریں گے۔

قدر فاصل کا نظریہ

Theory of Surplus Value

Frame work of marx

Superstructure	Law	Philosophy
	forms and	Moral codes
	Principles of	Religion, Ar
	Government	
	Political Theory	
	other aspects of social culture	

Eco mi	Relations of production	Social relationships
(Ma er Fou dat on		Class structure (Command and obey) (owners + workers)
	force of production	Resources Technology

قدر فاضل نظریہ کی کارل مارکس نے کچھ اس انداز میں کی کہ کسی شے کی قیمت فروخت اور اس کے بنانے کی قیمت یعنی لاگت Cost price میں جو فرق ہوتا ہے اس کو قدر فاضل کا نام دیا جاتا ہے۔

دراصل کارل مارکس نے جب آدم سمتھ بابائے معاشیات اور مسٹر ریکارڈو کی معاشی اصولوں کا اور مزدور طبقہ کی حالت کا جائزہ لیا تو اس نے نتیجہ نکالا کہ انسان کی صرف کردہ مشقت حقیقی طور پر بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں معاشرہ میں ذرائع پیداوار پر صرف مخصوص طبقہ کی حکمرانی ہوتی ہے اور مزدور اپنی محنت سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ دیتا ہے سرمایہ دار اپنا خام مال مزدور کو مہیا کرتا کیونکہ اس کے پاس اتنا سرمایہ جمع ہوتا ہے کہ وہ اس سے خاصی مقدار سے خام مال حاصل کرکے جمع کر سکتا ہے۔ اس خام مال کے ذریعے محنت کش طبقہ سرمایہ دار کی چیزیں تیار کرتا ہے اور تیار شدہ چیزیں تبادلے یعنی (Exchange value) کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن محنت کش طبقہ کی بدقسمتی ہے کہ اس کی محنت اور تیار شدہ مال کی قیمت میں تناسب (Proportion) صحیح نہیں ہے اور مزدور کے معاوضہ اور چیزوں میں بہت زیادہ امتیاز باقی ہے جو قدر فاضل کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اور یہ قدر فاضل یا فاضل سرمایہ پھر سرمایہ دار کی جاگیر میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے حالانکہ سرمایہ دار اپنے زیادہ فائدے کا حقدار نہیں ہوتا۔ اور زیادہ منافع یا مناسب منافع جو کہ سرمایہ دار کو حاصل ہوتا ہے حقیقتاً مزدور کا حق ہوتا ہے کیونکہ پیداوار میں اضافے کا سبب مزور کی محنت ہوتی ہے چونکہ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا لہٰذا یہ طبقاتی کشیدگی کا سبب بن جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار کسی بھی سرمایہ میں رقم لگا کر جب مزدور کو محنت کرنے پر مجبور کرتا ہے تو اس دوران اس کا مقصد محض منافع حاصل کرنا ہوتا ہے وہ ان ہاتھوں کی قدر نہیں کرتا جو اس کو منافع فراہم کرنے کا سبب بنتے ہیں وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ ایک محنت کش نے اس کی چیز کو تیار کرنے میں کتنی محنت صرف کی ہے۔ بلکہ اس کا تو صرف خیال ہوتا

کہ چونکہ سرمایہ ہمارا تھا لہٰذا ہم منافع کے حق دار ہیں اور مزدور کی افلاس نے خود اس کو محنت کرنے پر مجبور کیا ہے اس سے ہمیں سروکار نہیں۔

کارل مارکس اس طرح سے مزدور کی بے بسی کی وجہ سے سرمایہ دار کو ظالم اور محنت کش کو معاشرے کے سامنے ایک مظلوم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے بلکہ اس کا خیال ہے کہ اس طرح کا عمل اور فعل انجام دے کر سرمایہ دار فطری ہمدردی سے باغیانہ سلوک کر رہے ہیں اور ان کا یہ فعل فطرت کے منافی ہے۔ کارل مارکس کا خیال ہے کہ اس فاضل سرمائے کی وجہ سے معاشرے کے اندر برائیاں جنم لیتی ہیں اور دولت تمام لوگوں میں یکساں تقسیم ہونے کی بجائے سمٹ کر چند مخصوص لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ اگر دولت کی تقسیم مساوی بنیادوں پر ہو تو پھر ذاتی جائیداد کے اصولوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن اگر دولت کی زیادتی انسانی ذہن میں خلل پیدا کر دے اور وہ ظالم اور جابر حکمران کی شکل اختیار کر لے تو پھر یہ جائیداد اور سرمایہ بے کار ہے۔ جبکہ مزدور طبقہ ایک فاضل پرزہ کی طرح خود کو تسلیم کرتا ہے جو بے کار ہونے پر یا ٹوٹ جانے پر بے دردی سے مشین سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

کارل مارکس کا خیال ہے کہ قدر فاضل یا فاضل سرمایہ کا حقدار صرف مزدور اور محنت کش طبقہ ہے اور پورے فاضل سرمائے پر کسی سرمایہ دار کا قابض ہونا مزدور کی حق تلفی کے برابر ہے۔

مارکس کا خیال ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب سرمایہ دار محنت کش کو فاضل سرمائے سے اس کا حق دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ کیونکہ مارکس نے مزدور کو سرمایہ دار کی کمزوری سے روشناس کر دیا ہے۔ اور مزدور کو ان کے حقوق سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ اور کارل مارکس کا خیال ہے کہ دنیا کی بڑی صنعتوں پر ایک دن مزدور کی اجارہ داری ہوگی یہ پیشن گوئی روس کے انقلاب کے ذریعے درست ثابت ہوئی ہے۔

کارل مارکس کے نظریہ قدر فاضل کا تنقیدی جائزہ

بہ روایت کارل مارکس کے نظریہ قدر فاضل کو بھی سیاسی فلاسفروں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ مفکرین کا خیال ہے کہ مارکس نے تاریخ کی مادی ارتقا کا سبب اقتصادی مسائل کو گردانا اور دیگر انسانی افعال جیسے مذہب اخلاق اور سیاست کو اس سے الگ کر دیا یہ ایک غلط خیال ہے کیونکہ کسی بھی معاشرتی ارتقا میں معاشی امور کے علاوہ بھی دیگر امور اہم کردار ادا کرتے ہیں اور قدر زائد کا نظریہ پیش کرتے وقت کارل مارکس نے نظریہ کا محور محنت کش طبقہ رہا اور اس نے دیگر طبقات کو نظرانداز کر کے صرف محنت کش طبقات کے مسائل کو اجاگر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے کارل مارکس کے نزدیک محنت کش طبقہ ریاست کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مال اعلیٰ درجے کا دماغ کی وجہ سے خوبصورت ہے۔ اور مزدور کی زندگی کا محور محض اجرت حاصل کرنا ہے اور روزی کمانا ہے اور مزدور یا محنت کش طبقہ ہی ایسا طبقہ ہے جو کہ سماجی مسائل کو حل کرنے کا سبب بن

سکتا ہے۔ ریاست میں امن و سکون کے لئے محنت کش طبقہ کے حقوق کی حفاظت کرنا ضروری ہے حالانکہ کسی بھی معاشرے میں مزدور اور سرمایہ دار کے آپس میں مسائل کے علاوہ کئی ایسے مسائل بھی ہیں۔ جو زندگی میں اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر شعبہ دفاع جس میں تمام اہم امور سرانجام دیتی ہے اس کا محنت کش طبقہ سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مزدور کی برابری نہیں کی جا سکتی۔

جبکہ کسی بھی معاشرے کا زیور اس کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا ہے۔ شعبہ [illegible] پر نظر دوڑائیں تو اس میں مزدور کی شمولیت بے معنی نظر آتی ہے جبکہ کارل مارکس نے سرمایہ فاضل کا حقدار صرف محنت کش طبقہ کو ٹھہرایا ہے کیونکہ یہ فاضل سرمایہ مزدور کی محنت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا اگر سرمایہ دار اپنا سرمایہ نہ لگاتا تو مزدور فاضل سرمایہ کیسے اور کیونکر حاصل کر پاتا سرمایہ لگانے (Investment) سے ملک کی صنعت اور پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے مزدور کی خالی جیب اور خالی محنت سے نہیں جب ایک سرمایہ دار ملک کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے اپنا سرمایہ مزدور کو فراہم کرتا ہے تاکہ وہ بھی روزی حاصل کر سکے اور پھر اس کے جواب میں اگر سرمایہ دار کو فاضل سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے تو اس میں مزدور کی محنت کا کوئی عمل دخل نہیں اس لیے مفکرین کا خیال ہے کہ اس پر مارکس کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر مزدور کو برابر حصہ فراہم کر دیا جائے تو سرمایہ دار کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا یہ ایک نامناسب سا فعل ہے یہ صحیح ہے کہ مزدور پیداوار کو بڑھانے کے لیے جسمانی مشقت کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن صنعت کار بھی تو پیداوار کے اضافے کے لئے سوچ اور ذہن کو بروئے کار لاتا ہے مفکرین کا خیال ہے کہ اس لئے یہ ثابت کرنا کہ سرمایہ دار مزدور کی حق تلفی کر رہا ہے یا یہ کہ مزدور کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے غلط ہے کیونکہ سرمایہ دار کا اپنے سرمائے کو بڑھانے اور پیداوار میں اضافے کا حق ہے اگر مزدور اس پر نالاں ہیں تو یہ ایک حسد کے سوا اور کچھ نہیں اور اس طرح ایک ایسا اشتراکی معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس میں سرمایہ دار کے بغیر سرمایہ ہو۔

Theory of Socialism Revolution

نظریہ اشتمالی انقلاب :

مارکس کی کتاب Communist Manifesto نظریہ اشتمالی انقلاب کی مکمل تشریح کرتی ہے یہ کتاب مارکس نے کیمونسٹ لیگ کے کہنے پر لکھی۔ اس کتاب کو کیمونسٹ پارٹی کا مسلک Creed کہا گیا بقول مارکس مزدور کے انقلاب کا سب سے اہم کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ سرمایہ دار پر مکمل فتح حاصل کرے اور سیاسی اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن یہ کام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک مزدور طبقہ مکمل طور پر متحد نہ ہو جائیں۔ مارکس چونکہ جمہوریت پسند ہے وہ کسی ریاست کی

کامیابی کے لیے جمہوری حکومت کو اہم سمجھتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ چونکہ ریاست اور معاشرہ میں مزدور طبقہ (Proletariat) کثیر تعداد میں موجود ہوتا ہے اور اگر یہ بورژوا طبقہ پر حاوی ہو جائے تو پرولتاریہ کے ذریعے جمہوریت قائم کی جا سکتی ہے۔ مارکس کے خیال میں پرولتاریہ باقاعدہ منظم ہو کر بورژوا طبقہ پر حاوی ہو سکتے ہیں اس طرح اشتمالی انقلاب عمل میں آسکتا ہے۔ اس اشتمالی انقلاب کے کئی یک ، ماصد ہیں۔

انقلاب کے مقاصد

مقاصد انقلاب Purpose of Revolution :

رل مارکس کا خیال ہے کہ پرولتاریہ (مزدور طبقہ) کی یہ باقاعدہ منظم جماعت باہم مل کر جب اقتدار پر قابض ہو جائے تو حکومت کی باگ ڈور اپنے کندھوں پر ڈال لے۔ اور سرمایہ دار طبقہ کی تمام جائید کو حکومت کی تحویل میں لے لے بقول مارکس سرمائے کو حکومتی تحویل میں لینے کا کام بتدر بجا انجام دے یعنی جو سرمایہ بورژوا کلاس میں منقسم ہے اس کو آہستہ آہستہ حکومتی تحویل میں لے کر سرمایہ دار طبقہ کا خاتمہ کر دے تاکہ ریاست پر مساوی اصول لاگو ہو سکیں۔

قلابی مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مزدور طبقہ کے لئے لازم ہے سرمائے کے ساتھ ساتھ پیداواری ذرائع کو بھی اپنی تحویل میں لے جس کی افادیت مارکس کے نزدیک یہ ہے کہ پیداوار ۔۔ بھی قبضہ گروپ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کا کلی صفایا ہو جائے گا۔ رکس کے خیال میں اشتمالی انقلاب کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے چند اقدامات کا کرنا لازم ہے جو کہ درج ذیل ہیں۔

انقلابی اقدامات

Revolutionary Steps

نجی ملاک کا خاتمہ Personal Possession Resticted.

مساویانہ معاشی نظام کا قیام Equationary Economical Code Established

تمام ذرائع آمدورفت و ابلاغ قومی تحویل میں All the Sources of Transportation and Communication under Govt

فرسودہ نظام کا خاتمہ Old system finished

یکساں اقتصادی نظام کا قیام :

مساویانہ معاشی نظام کا قیام مارکس کے نزدیک اقتصادی توازن کو برقرار رکھنے کا سبب ہے۔

لہذا لازم ہے کہ زیادہ سرمائے پر زیادہ ٹیکس اور لگان وصول کیا جائے تاکہ دولت چند مخصوص لوگوں میں منتقل ہونے سے بچ سکے اور یہ ٹیکس قومی خزانے میں ایمانداری سے جمع کر دیئے جائیں تاکہ ملک و قوم کو فلاح کی طرف گامزن کیا جا سکے۔

فرسودہ اور روایتی نظام کا خاتمہ :

انقلابی اقدام میں ایک اور قدم یہ ہونا چاہیے کہ ماضی اور تاریخ کے روایتی اور فرسودہ نظاموں کو یکسر فراموش کر دیا جائے اور ان کی جگہ جدید نظریات کو پروان چڑھایا جائے تاکہ اس طریقہ کار سے پرانے جاگیردارانہ نظام کا بھی خاتمہ ہو سکے کیونکہ یہ نظام طبقاتی تضادات کو جنم دیتا ہے۔

ذاتی جائیداد کا خاتمہ :

مارکس کے نزدیک ذاتی جائیداد معاشرے میں بے سکونی کی علامت ہے جس سے دشمنی عداوت اور جھگڑے جنم لیتے ہیں لہذا اشتمالی انقلاب کے بعد ایک قدم پرولتاری یہ اٹھائیں کہ تمام ذاتی جائیداد کو کلی طور پر ضبط کر کے قومی اور ملی تحویل میں لے لیں۔

اشتمالی نظام مخالفوں کی جائیداد حکومتی تحویل میں

Al thi Possession of Violator Shauld be Handi Cappes

بقول مارکس ریاست کے اندر جو عناصر اور ذرائع اشتمالی نظام کی مخالفت کرتے ہیں ان کی کلی جائیداد کو ضبط کر کے حکومتی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ ان کو اشتمالی نظام کے خلاف طاقت بننے کا موقع نہ مل سکے۔

ذرائع ابلاغ و رسل و رسائل حکومتی تحویل میں کارل مارکس کا خیال ہے کہ اشتمالی نظام کو چلانے کے لئے پرولتاری کا فرض ہے کہ وہ ریاست کے جملہ ذرائع ابلاغ پر مکمل تسلط قائم کرے اور ذرائع رسل و رسائل اور ذرائع آمدورفت کو حکومتی تحویل میں دلانے کی بھرپور سعی کرے تاکہ ان ذرائع پر بھی حکومتی تسلط قائم ہو اور یہ سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بننے سے بچ جائیں اگر سرمایہ دار (بورژوا) اس پر قابض ہیں تو ان کی اجارہ داری کو ہر ممکن طریقے سے بتدریجا ختم کیا جائے تاکہ وہ انقلاب کے خلاف آواز اٹھا سکنے کے قابل نہ ہوں اس طریقہ اور اقدام کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انقلاب دشمن عناصر کسی طور بھی اپنی اجارہ داری قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

ترقی صنعت و حرفت مارکس کا خیال ہے کہ اشتمالی انقلاب کے بعد اگر پرولتاری طبقہ صنعت و حرفت کی طرف بھرپور توجہ دے تو یہ اس کا سب سے اہم قدم ہوگا۔ صنعتی میدان میں جدید فنی آلات کو نہ صرف متعارف کرائے بلکہ اس کو استعمال کے قابل بھی بنائے تاکہ ملک ترقی کی راہ پر

گامزن ہوئے۔

فروغ زراعت :

مارکس کا خیال ہے کہ اشتمالی نظریات کے حامی افراد کے لئے ضروری ہے کہ اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد زراعت کی طرف توجہ دیں کیونکہ ریاست کی معاشیات میں زراعت اہم کردار ادا کرتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ روایتی طریقہ کار کو ختم کر کے جدید زرعی طریقوں کو متعارف کرایا جائے۔ اس پر کافی وسائل صرف کر کے زرعی مسائل کو حل کرنے میں رہنمائی کی جائے اس طرح معاشرے کے اندر پیدا ہونے والی غربت ختم کی جا سکتی ہے۔

مساویانہ تعلیمی نظام Equal System of Educaion :

بقول مارکس مزدور طبقہ اقتدار سنبھالنے کے بعد ایک کام یہ بھی کرے کہ پورے معاشرے میں یکساں نظام تعلیم کو متعارف کرائے۔ تاکہ ہر طبقہ کے لوگوں کے بچے یکساں مساوی تعلیم سے بہرہ مند ہو سکیں

اگر ملکی وسائل زیادہ ہوں تو پورے معاشرے کے بچوں کو مفت تعلیم کی سہولیات فراہم کی جائے مارکس کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نے طبقاتی نظام تعلیم پیدا کر کے معاشرے میں کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ امیر اور غریب کے فرق نے تعلیم میں بھی کافی تفریق پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے چھوٹی عمر ہی کی بچوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کا فرق جڑ پکڑ لیتا ہے چنانچہ معاشرے کو اس امتیاز سے چھٹکارا دلانا پرولتاری کا فرض ہے۔

روحانی و مذہبی جذبات و لگاؤ کا خاتمہ :

مارکس پرولتاری طبقہ کو معاشی اقدامات کرنے کے لئے تجویز دیتے ہوئے کہتا ہے۔ چونکہ مذہب اور روحانیت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو جذباتی کر دیتی ہے چنانچہ پرولتاری طبقہ فرض ہے کہ ریاست اور معاشرہ سے اس قسم کے لگاؤ کو جڑ سے اکھاڑ دے، کیونکہ اس سے مفاد پرست بورژوا کلاس تو فائدہ اٹھا سکتی ہے لیکن یکساں اصولوں پر مبنی معاشرہ نہیں۔

ماحصل بحث :

مارکس کے انقلابی نظریات اور اشتمالی انقلاب کی طرف غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مارکس مکمل طور پر اپنی تمام ہمدردیاں مزدور طبقہ کے ساتھ رکھتا ہے مارکس کا خیال ہے کہ سیاسی اقتدار پر قابض ہو کر پرولتاری طبقہ اپنی حالت کو بہتر بنا سکتا ہے اور سیاسی اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ضروری ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جو اشتمالی نظام کے لئے سود مند ہوں اور سرمایہ دارانہ نظام

کے منافی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں یکساں اصول نافذ [illegible] ے اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے تمام پیداوار اور سامان تجارت کو ملکی تحویل میں لے کر سرمایہ دار [illegible] تہی [illegible] امن کر دے تاکہ وہ کسی بھی صورت میں مزدور طبقہ کا دوبارہ استحصال نہ کر سکے اور پرولت [illegible] ن کا [illegible] ض ہے کہ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ہر طرح کے فرض اور طمع کو بالائے طاق رکھ د [illegible] تاکہ [illegible] حاشرے کی کشیدگی اور چپقلش ختم ہو جائے۔

انقلاب کے پہلو انقلاب کا نقطہ نگاہ A[illegible]pects of Revolution

مارکس کا خیال ہے کہ پرولتارین معاشرے کو سدھارنے کا کام بخوبی انجام [illegible] سکتا ہے اس لیے مارکس نے ان کو انقلابی اقدامات کی تجویز پیش کی۔ اس انقلاب کا نقطہ نظر دو حصو [illegible] پر [illegible] مشتمل ہے یعنی اس کے نظریہ انقلاب میں دو طرح کے پہلو سامنے آتے ہیں۔

ارتقائی نقطہ نظر 1- Ev[illegible]lut[illegible]ary Aspect

انقلابی نقطہ نظر 2- R[illegible]vo[illegible]tionary Aspect

ارتقائی ترقی ارتقائی پہلو :

مارکس کے اشتمالی انقلاب کو ارتقائی اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اشتراکی [illegible] حاشر [illegible] نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لینے کے لئے ارتقائی ترقی پر زور دیتا ہے۔ اس کا خیال [illegible] کہ [illegible] دی اور وجوداتی ترقی یکساں طور پر چلیں تو جلد ہی کامیابی کی طرف بڑھ سکتی ہیں۔ دوسرے [illegible] ں میں ارتقائی اس بنا پر بھی مارکس اس انقلاب کو کہتا ہے کیونکہ معاشرتی اور سیاسی اداروں میں تبد[illegible] فوراً [illegible] واقع ہونا ناممکن ہوتی ہے۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مارکس کے انقلابی نقطہ نظر کو اس لیے [illegible] ن ارتقائی کہا جا سکتا ہے کیونکہ مزدور طبقہ اپنے سیاسی اور معاشرتی و معاشی مقاصد کی تکمیل لڑائی جھگ[illegible] ے سے نہیں کرے بلکہ پرامن طریقہ سے انجام دیتے ہیں۔

انقلابی نقطہ نظر Revolutionary Aspects :

اگر مارکس کے اشتمالی نظام کا مطالعہ کریں تو اس میں انقلاب کا ایک نقطہ نظ[illegible] یہ نظ[illegible] آتا ہے کہ یہ معاشرے کو کلی طور پر تبدیل کرنے کا خواہش مند ہے مارکس کا خیال ہے [illegible] ایسی ریاستیں جہاں اشتمالی نظام قائم کرنا مشکل ہو۔ ان ممالک میں سیاسی اور معاشی تبدیلیاں خونی انقلا[illegible]ب [illegible] ذریعے لائی جائیں۔

اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتمالی نظام کو قائم کرنے کے لئے مارکس [illegible] نی انقلاب کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ جنگ و جدل کے بغیر ایسے معا[illegible] ے [illegible] سنوارنا قدرے مشکل ہوتا ہے لہٰذا اس کے نقطہ نظر کو انقلابی بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ زیادہ [illegible] انقلابات جنگ

و جدل اور تصادم کے ذریعے کامیاب ہوتے ہیں۔ دوسرا اس بنا پر بھی ہم اس کے نقطہ نظر کو انقلابی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ سرمایہ دار اور مزدور طبقہ کے مفادات اور مقاصد کو ایک دوسرے کا مخالف گردانتا ہے لہٰذا اس خیال کے تحت دونوں طبقات میں مصالحت کا پیدا ہونا تو ناگزیر ہوتا ہے۔ اس لیے اشتمالی نظام کے قیام کے لئے بورژوا اور پرولتاری طبقہ میں تصادم ایک لازمی امر ہے اور اس تصادم کے بدلہ کسی ایک کو کامیابی اور دوسرے کو شکست نصیب ہوتی ہے لہٰذا اگر پرولتاری طبقہ اتحاد قائم کر لے تو پھر یہ سرمایہ دار طبقہ پر اپنا تسلط قائم کر سکتا ہے۔ اس طرح اشتمالی نظام کا نفاذ عمل میں آسکتا ہے۔

انقلابی مراحل

مارکس کا خیال ہے کہ محنت کش طبقہ کو معاشرے میں سبقت حاصل کرنے کے لئے دو مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اگر ان دو مراحل سے نہیں گزرے گا تو اس کی سبقت ممکن نہیں۔

پہلا مرحلہ : First Statge

مارکس کا خیال ہے کہ ابتدا میں مزدور طبقہ صرف انقلاب کے حامیوں کے ساتھ دست تعاون بڑھائے کیونکہ ایک متوسط طبقہ اس کشیدگی اور چپقلش کے آغاز میں انقلاب برپا کرنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے ان کی رہنمائی کے سبب انقلابی اگلا قدم کامیابی سے اٹھا سکتے ہیں اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلی کا سب سے پہلے فائدہ یہی متوسط طبقہ حاصل کرتا ہے اس کے بعد اقتدار پرولتاری طبقہ میں منتقل ہو جاتا ہے اور اس طرح اقتدار کی تبدیلی سے معاشرے کے درمیانے طبقہ کو آزادی معاشیات نصیب ہو جاتی ہے جس کے اثرات آہستہ آہستہ پرولتاری طبقہ تک پہنچ جاتے ہیں اور سرمایہ داروں جاگیرداروں اور پادریوں کی سیاسی قوت کا یکسر خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن انقلاب کے ابتدائی ایام میں ہونے والی تبدیلی کسی کامیابی کی نوید نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے غیر مساویانہ رویہ سرمایہ داروں کی ذہنیت اور طرز عمل سے ختم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس غیر مساویانہ رویہ کی تبدیلی کے لئے ایک اور مرحلہ کی ضرورت ہے جس کے بعد ہی یہ تبدیل ہو سکتا ہے۔

دوسرا مرحلہ : Second Stage

مارکس کا خیال ہے کہ انقلاب کا دوسرا مرحلہ معاشی تبدیلی پر مشتمل ہوتا ہے یعنی اقتصادی انقلاب معاشرے میں تبدیلی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ جب بورژوا کلاس سیاسی اقتدار سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ پرولتاری طبقہ اقتدار پر متمکن ہوتا ہے تو تمام سرمایہ اور تجارتی اور صنعتی پیداوار پرولتاری طبقہ کے زیر تسلط آجاتی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے مقاصد یکسر ختم ہو جاتے ہیں اور یہ سرمایہ دارانہ نظام اپنی مکمل بدعنوانیوں اور ریشہ دوانیوں کے ساتھ زمین بوس ہو کر رہ جاتا ہے مارکس کا خیال ہے کہ انقلاب کے دوسرے مرحلے میں اقتصادی تبدیلی ہی اہمیت کی حامل ہے اور اقتصادی تبدیلی ہی عوام کی فلاح کی ضامن بن جاتی ہے۔

حاصل بحث :

مارکس کے نظریہ انقلاب، کا ماحصل کچھ اس طرح ہے کہ پرولتاری طبقہ ابتدائی انقلاب کے ذریعے جب اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے تو سرمایہ دار اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور تمام نجی جائیداد ملکی تحویل میں چلی جاتی ہے اور پرولتاری طبقہ معاشی اور اقتصادی انقلاب برپا کر کے معاشرے کو خوش حال بنانے کی سعی کرتا ہے۔ اور معاشرے کو یکساں روزگار فراہم کرتا ہے اور حقدار کو اس کی محنت کے مطابق اجرت مہیا کی جاتی ہے۔ اور معاشرے کی فلاح کے لئے سرمایہ دار سے تمام سرمایہ حاصل کر کے تمام لوگوں میں یکساں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور لوگوں کی شخصیت کی تعمیر کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ خوش حالی آزادی اور مساوات کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

اشتمالی انقلاب کے تنقیدی جائزہ :

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مارکس کے دیگر نظریات میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح اس نظریہ اشتمالی انقلاب میں بھی خامیاں ہیں۔ مثلاً مارکس کا خیال ہے کہ پرولتاری طبقہ سرمایہ دار طبقہ کی جائیداد کو ملکی اور قومی تحویل میں لینے کے لئے اقتدار پر پوری طرح قابض ہو جائے اور اگر اقتدار پر قبضہ ناممکن ہو اور اشتمالی انقلاب کی راہ میں رکاوٹیں پیش آئیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ خونی اور مسلح انقلاب کے طریقہ کار کو اختیار کرے جس میں انقلاب کے خلاف پیدا ہونے والی تمام قوتوں کو بری طرح کچل دیا جائے اور بقایا نہ ذہنیت کا اچھی طرح قلع قمع کر دیا جائے یہی وجہ ہے کہ مارکس کے، اس انقلابی طریقہ کار کو جمہوریت اور امن پسند عناصر نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ گرچہ مارکس کا تجویز کردہ انقلاب 1917ء میں روس میں لیکن اس وقت روس صنعتی طور پر پسماندہ ہو چکا تھا۔ لیکن یہ انقلاب آج کے روس کے حصے بخرے کرنے کا سبب بھی بن گیا۔ دوسری طرف یورپ کی وہ ریاستیں جہاں صنعتی انقلاب کے اثرات نمایاں تھے وہاں آج تک اشتمالی انقلاب برپا نہ ہو سکا۔ مثال کے طور پر انگلستان، جرمنی، امریکہ جیسے ممالک صنعتی میدان میں کافی ترقی کر چکے تھے لیکن وہاں کے مزدور پیشہ ور طبقہ نے کبھی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کی۔ عالمی امن پسندوں کا خیال ہے کہ خونی انقلاب انسانیت کی توہین ہے جبکہ مارکس ... انہ طریق کار پر انقلاب کی کامیابی کے بعد عمل کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ یہ طریقہ کار صرف باغی قوتوں کے پھیلنے تک باقی رہے گا۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ... حکمرانوں کو حکم چلانے کی عادت ہو پھر وہ اس عادت سے مجبور ہو جاتے ہیں۔

نظریہ اقتدار مزدور : Theory of proletarians Dictatiorship

بقول مارکس ریاست اور حکومت کے اندر پائی جانے والی کشیدگی اور معاشی چپقلش کا علاج

صرف سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے سے ممکن ہے اس طرح معاشرے کے اندر پائی جانے والی نہ صرف طبقاتی کشمکش ختم ہو جائے گی بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے برعکس ایک ایسا نظام حکومت قائم ہو جائے جس کے معاشرے پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ مزدور طبقہ سرمایہ دار کو اقتدار سے محروم کرکے اپنی آمریت قائم کرے۔ اور پھر نئے اشتراکی نظام کے تحت اداروں کی تشکیل نو کرے۔ مارکس کا خیال ہے کہ عوام اس وقت تک کوئی وقعت نہیں رکھتے جب تک پیداوار کے ذرائع پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے عوام کی قدر و قیمت اسی صورت میں ہے جب معاشرے سے طبقاتی فرق مکمل طور پر مٹ جائے۔ مارکس کا خیال ہے کہ جب تک امیر اور غریب طبقہ کا تصور معاشرے میں قائم رہے گا۔ ریاست میں کشیدگی باقی رہے گی کیونکہ ریاست اور اس کے تمام ادارے سرمایہ داروں کی مراعات کا دفاع کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مزدور طبقہ غلام بنا رہتا ہے اور اس معاشرے میں حق تلفی ہوتی ہے۔

جب مزدور طبقہ باہمی اتحاد سے سرمایہ دار کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا یہ صرف مزدور طبقہ کی فتح نہ ہوگی بلکہ جمہوریت کی فتح ہوگی کیونکہ جمہوریت کثیر طبقہ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے نہ کہ مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ذریعے اس لئے ضروری ہے کہ پرولتاری اپنی آمریت قائم کریں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کرکے معاشرے میں پیدا ہونے والے انتشار و خلفشار کو نہ صرف ختم کریں بلکہ مساوی حقوق فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی ادا کریں۔

تنقیدی جائزہ:

اگر مارکس کے اس نظریہ کا تنقیدی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مارکس کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مزدور طبقہ ایک خونی انقلاب کے بعد معاشرے کو پرامن اور پرسکون بنا دے گا۔ بلکہ ان کے ظلم و استبداد کی چنگاریاں سدا سلگتی رہیں گی اور یہ بھی انسانی فطرت کے بالکل برعکس ہے کہ "برائی کا خاتمہ صرف برائی سے ہی ممکن ہے کیونکہ بعض اوقات اگر برائی کا جواب بھلائی میں دیا جائے تو اس کے زیادہ بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جب مزدور (پرولتاری) اقتدار کی کرسی پر جم جائے گا تو پھر رضاکارانہ طور پر معاشرے کی فلاح کی خاطر اس سے دست بردار بھی ہو جائے گا چونکہ مزدور طبقہ جو برساہا برس سے ظلم کی چکی میں پستا چلا آیا ہے وہ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد کس جذبہ کے تحت اقتدار سے کنارہ کشی اختیار کرے گا۔ کیونکہ سرمایہ دار نے اس کے ساتھ کبھی ہمدردانہ سلوک روا نہیں رکھا۔ اس کے حقوق کی پامالی کا سبب بنا تو پھر وہ کسی کو خاطر میں کیونکر لا سکتا ہے وہ جائیداد اور سرمایہ جو کہ مزدور کی اپنی محنت سے حاصل کیا ہوا ہے اور جس پر سرمایہ دار اپنی طاقت کے ذریعے قابض تھے پرولتاری آمریت کے قائم ہونے کے بعد سرمایہ دار سے یہ سرمایہ حاصل کرکے مزدور طبقہ کیونکر چاہے گا کہ وہ اس کو دوبارہ یکساں طور پر معاشرے میں تقسیم کر دے۔

مارکس کا یہ بھی غلط ہے کہ جو قوت ظلم و جبر کے ذریعے قائم ہوئی وہ ظلم اور جبر کا خاتمہ کر سکے

نہیں۔ کیونکہ انسان کی طبیعت میں سرکشی پائی جاتی ہے وہ کسی وقت بھی سرکشی اختیار کر سکتا لیکن اگر اس پر ایک برتر طاقت کا خوف موجود ہو تو وہ ایسا کرنے سے اجتناب کرتا ہے اور حکومت کا ادارہ اس کو ہمہ وقت انصاف مہیا کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے اس کے علاوہ لوگوں کے باہمی جھگڑے اور معاشرتی اداروں کے مسائل کے حل کے لئے بھی ایک برتر طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کو اشتمالی طاقت پیش کرنے سے قاصر ہے۔

نظریہ پرولتاری آمریت

Theory of Proleterian Dictator Ship

مارکس معاشرے کی کشیدگی کو ختم کرنے کا ذریعہ صرف پرولتاری آمریت کے قیام کو خیال کرتا ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ اگر معاشرے میں امن و سکون کو قائم کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دار کی اجارہ داری کو ایک خونی انقلاب کے ذریعے ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد پرولتاری کا فرض ہے کہ وہ اقتدار پر قابض ہو کر اپنی آمریت قائم کرے تاکہ معاشرے سے طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو اور اس کی جگہ یکساں اصولوں کے قوانین رائج ہوں اور پرولتاری آمریت محض آمریت ہی نہ ہوگی بلکہ یہ ایک جمہوریت کے مترادف ہوگی کیونکہ پرولتاری طبقہ کثیر طبقہ کی نمائندگی کا فرض ادا کر رہا ہوگا۔ پرولتاری آمریت کے قائم ہونے سے بورژوا طبقہ کا خاتمہ ہو جائے گا جس کے بعد جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا اور تمام نجی سرمایہ حکومت کی تحویل میں چلے جانے کی وجہ سے کسی کو ذاتی جائیداد پر فخر کرنے کا موقعہ نصیب نہ ہوگا اور جس کی وجہ سے کوئی طبقہ بھی اپنی برتری قائم نہ رکھ سکے گا۔ بلکہ تمام معاشرے کے تمام افراد کو برابر تسلیم کرے گا۔

تنقیدی جائزہ مارکس کے نظریہ پرولتاری حاکمیت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ پرولتاری آمریت محض انصاف فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ سرمایہ دار بھی قوانین کی حکمرانی پر عمل درآمد کروا سکتے ہیں مارکس کا یہ سوچنا خام خیالی پر مبنی ہے کہ جو آمریت خون ریزی کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے وہ امن و سکون قائم کرنے کی بھی ذمہ دار ہوتی اور معاشرے میں امن قائم ہونے کے بعد اپنی اجارہ داری رضاکارانہ طور پر ختم کر دے گی۔

تصور خاندان کا اختتام :

مارکس کا خیال ہے کہ نجی جائیداد اور ذاتی سرمایہ خاندان کے تصور کو اجاگر کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے لہذا پرولتاری آمریت کے قیام کے بعد جب نجی سرمایہ قومی تحویل میں چلا جائے گا تو پھر خاندان کے قیام کا بھی خاتمہ ہو جائے گا دراصل نجی سرمایہ خاندان میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ سرمایہ

دار اپنی جائیداد اور سرمایہ کے لئے وارث کے خواہش مند ہوتے ہیں تاکہ ان کا سرمایہ ان کے خاندان اور وارث میں منتقل ہو جائے۔

مارکس کا خیال ہے کہ تمام قومی بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ جب ریاست کی ذمہ داری ہو گا تو خاندان کا تصور اس طرح سے ختم ہو جائے گا اور طبقاتی کش مکش بھی اس طرح اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔

مارکس کا خیال ہے کہ معاشرے میں طبقات کی تقسیم کا باعث خاندان بھی ہوتے ہیں لہذا خاندان برائی اور خلفشار کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

تنقیدی جائزہ :

مارکس کے اس خیال کو بعض مفکرین نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ سرمایہ دار اپنے سرمائے کے تحفظ کے سبب خاندان کو ہوا دیتے ہیں اور پرولتاری آمریت کے قائم ہونے کے بعد خاندان کا تصور ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اگر سرمایہ دار کی جائیداد قومی تحویل میں چلے جانے کے بعد پرولتاری آمریت کے قیام کے ساتھ طبقاتی تقسیم ختم ہو بھی جائے گی تو پھر پورا معاشرہ بھی تو ایک خاندان کی حیثیت میں ایک قانون اور ایک آئین پر جمع ہو جائیں گے اور معاشرے کے تمام افراد ایک خاندان کی صورت اختیار کر لیں گے دوسرا یہ کہ خاندان کا مقصد سرمائے کا تحفظ نہیں بلکہ یہ ایک فطری امر ہے ہر فرد اور ہر والدین اپنے خاندان کی تکمیل و تشکیل چاہتا ہے۔

مارکسیت کے اہم اصول :

اگر کارل مارکس کے نظریات کا تجزیاتی جائزہ لیں تو اس کے فلسفہ سیاست سے درج ذیل اصول ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

1- پرولتاری آمریت   پرولتاری کی حوصلہ افزائی

2- سرمایہ دار بورژوا طبقہ پر تنقید   بورژوا کی حوصلہ شکنی

3- اشتراکی معاشرے کے اہم مقاصد

کارل مارکس کا خیال ہے کہ سرمایہ دار طبقہ معاشرے میں کشیدگی کا باعث ہے محنت کش طبقہ کی حق تلفی کر کے اپنی نجی جائیداد میں اضافہ تو کر سکتا ہے لیکن مزدور کی حوصلہ افزائی نہیں یہی تصور پھر طبقات کو جنم دیتا ہے اور معاشرے میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز پیدا ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ سرمایہ دار کی نجی ملکیت کو قیومایا جائے اور ان کو الگ مقام دینے کی بجائے دوسروں طبقہ کی صف میں برابر کھڑا کر دیا جائے جس سے اشتراکی معاشرہ جنم لے گا اور یہ معاشرہ پرولتاریہ کو آمریت اور حکمرانی کے مواقع فراہم کرے تاکہ یہ محنت کش طبقہ اپنے ساتھ کی گئی حق تلفیوں کا بدلہ اس طرح لیں کہ تمام سرمایہ دار سے اس کی نجی جائیداد حاصل کر کے قومی خزانہ میں جمع کروائے اور

پھر یہ شتراک معاشرہ تمام افراد کو یکساں اور صلاحیت کے مطابق نہ صرف روزگار فراہم کرے بلکہ دیگر زندگی کی سہولیات فراہم کرنا بھی اشتراکی نظام کی ذمہ داری ہو اور حکومت تمام معاشرتی افراد کے لیے یکساں اصول اور قوانین نافذ کرے۔ تمام بچوں کو برابر سمجھے اور ان کی تعلیم و تفریح کا یکساں انتظام کرے اور ان حقوق سے سب کو یکساں فیض یاب کرے۔

سوال: لینن کے بارے آپ کیا جانتے ہیں لینن ازم بیان کریں۔1994ء

لینن Lenin

جواب: The Man and His work. Viladimir Iiyich ulynor lenin
جدید دور کی سیاست میں تغیر پیدا کرنے والا پہلا شخص ہے جس نے معاشرے میں اہم تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔

In carrying the revolution or the establishment of an official government no one played a more important role than Niccolai lenin the leader of Bolsheviks.

لینن کا اصلی نام ولائیڈیمر ایلیچ اولیانوف تھا۔ لینن 9 اپریل 1870ء کو ... سمبرسک (Simbirsk now vlyanovst) میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین تدریس کے ... منسلک تھے اور معزز اور قابل احترام لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے اس کے والدین کے ہاں ... بچے پیدا ہوئے اور وہ تمام کے تمام انقلابی بنے لینن کا بڑا بھائی انیس سال کی عمر میں انقلابی تنظیم ... کردار ادا کرتا رہا اور زار کی قتل کی سازش کے الزام میں سزائے موت کا حقدار ٹھہرایا گیا ... وقت لینن کی عمر تقریباً سترہ برس تھی کہ اس واقعہ نے لینن کے ذہن پر گہرا اثر کیا اور وہ حکومت ... خلاف انقلابی تنظیم میں شامل ہو گیا وہ زمانہ طالب علمی میں ایک ذہین اور قابل طالب علم کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس نے تعلیم کے ہر میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی بچپن میں اس نے ... سکول Sdimbirsk lymnaisium School میں داخلہ لیا اور 1887ء میں گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی پھر اس نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کازن Kazan یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ لیکن انقلابی سیاسی سرگرمیوں کے سبب اسے کازن Kazan یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔

بعد میں اس نے 1891ء میں سینٹ پیٹر برگ St petersburg یونیورسٹی سے ... کی ڈگری حاصل کی لینن نے شہر Samara کے مقام پر بہت تھوڑا عرصہ کے لئے قانون کی پریکٹس کی لیکن اس کی حقیقی دلچسپی انقلابی سرگرمیوں میں تھیں۔ چنانچہ 1894ء میں وہ سینٹ پیٹر برگ St petersburg واپس آیا اور اس نے یہاں آکر انقلابی پمفلٹ Pamphlets لکھنے شروع کئے اور ایک اشتراکی اخبار جاری کرنے کی تیاری میں تھا کہ دسمبر 1895ء میں اس کو گرفتار کر کے ایک سال کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا اس کو 1897ء سے 1900ء تک تین سال کے عرصہ کے لئے سائبیریا Siberian exile میں جلا وطن کر دیا گیا۔ 1898ء میں لینن نے ایک انقلاب پسند خاتون (Nadezhda krupskayen) سے شادی کی جس نے لینن کی زندگی کے ہر دکھ سکھ کو بانٹا۔ سائبیریا میں جلا وطنی کے دوران لینن نے ایک کتاب معاشی امور پر لکھی جس کا نام تھا ڈیلومنٹ آف کیپلزم ان رشیا The Development of Capitalism in Russia چونکہ اس کو جلا وطنی

کے دوران تحریر و تقریر اور مطالعہ کی مکمل اجازت تھی اور یورپی روس میں موجود اس کو اپنی جدائیداد کی آمدنی کا حصہ بھی حاصل ہو رہا تھا تو اس کو یہ جلاوطنی زیادہ مہنگی نہ پڑی۔ 1900ء سے 1917ء تک وہ مغربی یورپ کے ممالک میں رہا۔ لینن سوئٹزر لینڈ گیا جہاں اس نے اسکرا Iskra (The spark) اخبار نکالا۔ 1905ء کے روسی انقلاب کے وقت وہ قلیل عرصہ کے لئے روس آیا۔ اس کا اعتدال پسند اشتراکی رہنماؤں سے شدید اختلاف تھا۔ کرینسکی (Kerensky) کے دور حکومت میں اس کو سزائے موت کی سزا سنائی گئی جس کی وجہ سے وہ روس چلا گیا اور 1917ء تک دوبارہ واپس نہ آیا اس کی انقلابی تگ و دو کا نتیجہ تھا کہ روس میں بالشویک (Boshevik) اور مینشویک (Menshevik) برانچیں قائم ہوئیں۔ اور مارکس کے نظریات کا پرچار کیا گیا۔ پھر ایک اور اخبار Pravada پراودا نکالا۔ جس میں کیمونزم کی بھرپور تائید کی گئی لینن کے نظریات مارکس اور اینگلز کے نظریات کی ترجمانی کرتے تھے۔ 1917ء میں جرمن حکومت نے اپنی کوششوں سے اس کو روس بھجوانے کا انتظام کیا جرمن حکومت کا منطق یہ تھا کہ یہ روس کی فوج کی طاقت میں کمی کا سبب بنے گا۔ گرائر نے روس پہنچ کر بالشویک (Bolsheivik) انقلاب کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا۔ اس کی یہ سرگرمیاں حکومت کے تخت تک آگ کا شعلہ بن کر پہنچ گئیں۔ اور معاشرے کے اندر بغاوت کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ لینن کی گرفتاری کے احکام جاری ہوئے تو وہ ملک کے اندر روپوش ہو گیا اور اپنی انقلابی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ آخر کار 24 اکتوبر 1916 کو اس نے روسی سامراج کا تختہ الٹ دیا۔ 25 اکتوبر 1917ء کو کانگرس کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں اقتدار عوام کے ہاتھ سپرد کرنے کا اعلان کیا۔ اور پھر لینن کو نئی ریاست کا سربراہ منظور کر لیا گیا۔ لینن کا خیال تھا کہ یہ حکومت عوام کی بھرپور قربانیوں کا ثمر ہے چنانچہ اس نے روس کا سرکاری نام بدل کر یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک (USSR) رکھ دیا۔ اور خود 21 جنوری 1924ء تک یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک کا سربراہ رہا۔ وہ 1922ء میں شدید بیمار ہوا اور اس بیماری کے سبب 21 جنوری 1924ء کو وفات پا گیا اس کی جگہ جوزف سٹالن نے لی۔

اس کی وفات پر سرکاری سطح پر جو اعلان ہوا اس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

"وہ انسان فوت ہو گیا جس کی اعلیٰ قیادت میں ہماری جذبات اور لگن سے بھرپور پارٹی نے نہ صرف انقلاب برپا کیا اور انقلاب کا سرخ جھنڈا فضا میں بلند کیا۔ اس نے ہر رکاوٹ کا بہادری سے مقابلہ کیا اور مزدور طبقہ کو اس کے حق سے نوازا کیمونسٹ انٹرنیشنل کا بنیاد رکھنے والا اور محنت کش طبقے سے جذباتی لگاؤ رکھنے والا شخص آج اس دنیا میں نہیں رہا۔"

1961ء میں لینن کی خدمات کے اعتراف میں نو ہزار لینن دستاویزات پر مشتمل لینن کی تصانیف کا مکمل مجموعہ ماسکو سے شائع کیا گیا۔ لینن نے روس کی نئی خارجہ پالیسی تشکیل دی اور اس نے اپنے منصوبہ کے مطابق پوری کرہ ارض پر کیمونزم کو پھیلانے کا تہیہ کیا تاکہ مزدور طبقہ کی فلاح و ترقی ہو سکے یہی وجہ تھی کہ اس نے مزدور کی بین الاقوامی یکجہتی پر زور دیا لینن کا خیال تھا کہ

مزدور اور محنت کش طبقہ کی تشکیل کردہ پارٹیاں ملک و قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہیں۔
لینن کو بارھا اعلان کرنا پڑا کہ اس کرہ ارض پر سب کچھ انسان کی بہبود کے لئے ہے یہی نعرہ لے کر وہ مزدو طبقہ کی طرف بڑھا اور ان کو تخت تک پہنچا دیا۔
لینن کے سیاسی نظریات کی ترویج کا سبب سوویت روس میں سوشلزم کی تعمیر، صنعت و زراعت اور سائنس و ٹیکنالوجی کو عروج حاصل ہوا۔ اور وہ کرہ ہستی پر ایک نئی دنیا کے روپ میں متعارف ہوئے۔

لینن کی تصانیف :

لینن نے اپنی سیاسی زندگی میں بے شمار کالم لکھے اور اپنے نظریات کو کامیاب بنایا۔ ان میں سے اس کی چند مشہور کتب درج ذیل ہیں۔

1- روس میں سرمایہ داری نظام کا ارتقا

1- Development of capitalism in Russian

2- Democracy and Dictatorship of the Prolatariate 1919

3- شہنشاہیت سرمایہ داری کا آخری مرحلہ

3- Imperialism in the last phase of capitalism 1916

4- اشتراکیت اور جنگ

4- Socialism and war 1915

5- کیا کرنا چاہیئے

5- What is to be Done 1920

6- ریاست اور انقلاب

6- State and Revolution 1918

7- مادیت اور علمی تنقید

7- Materialism and kampirico criticism 1909

مادیت اور علمی تنقید :

لینن کی ان تصانیف کو جہاں اس کے دور میں شہرت اور قدر و منزلت حاصل ہوئی اس کی اہمیت آج کے جدید دور میں بھی بالکل ویسی ہے۔
اگر ان تمام کتب کو بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری کی ساری مارکسزم کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اس میں لینن نے محنت کش طبقہ کو اقتدار کا مالک گردانا ہے اور صنعتی انقلاب کو ریاست کی ترقی کا ضامن قرار دیا ہے۔

لینن کا سیاسی فلسفہ

Lenin's Political Philosophy

اس میں شک نہیں ہے کہ لینن مشہور مفکر کارل مارکس کے نظریات و خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ لیکن وقت اور حالات کے مطابق اس نے نظریات میں رد و بدل کی اور اس کی تبدیلی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ روسی حالات تبدیلی کے خواہاں تھے۔ لینن کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام آمریت اور بادشاہت کی انتہا ہے اس کا خیال ہے کہ سرمایہ اور پیداوار یکساں طور پر بڑھتے ہیں جس کے نتیجے میں تین چیزیں سامنے آتی ہیں۔

1. بین الاقوامی سطح پر سرمایہ دار ریاستوں میں جنگ
2. سرمایہ دار کا خود اپنا خاتمہ
3. نو آبادیوں کی خامیوں سے افادیت حاصل کرنا۔

لینن کا خیال ہے کہ شہنشاہیت سرمایہ دارانہ نظام کی ایک شکل ہے جو کہ کئی تضادات کا مرقع ہے۔

یہ تضادات اس کے باہمی جھگڑے کا باعث بنتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا خاتمہ یقینی بن جاتا ہے۔ لینن کا خیال ہے کہ معاشرے میں سب سے بڑا تضاد سرمایہ اور محنت کا ہے کیونکہ سرمایہ دار اپنے سرمائے کے ذریعے مزدور اور محنت کش طبقہ کی مجبوریوں سے فائدہ حاصل کرتے ہیں لیکن یہ فائدہ عارضی ہوتا ہے کیونکہ دبی ہوئی چنگاری کبھی آگ پکڑ سکتی ہے اور یہ بے کس و مجبور طبقہ جب برداشت کی حدوں کو چھو جاتے ہیں تو پھر انقلاب برپا کر دیتے ہیں یہ انقلاب عموماً خونی انقلاب ہوتے ہیں جن کے گزر جانے کے بعد ایک پرامن آمریت قائم ہوتی ہے جو کہ پرولتاری اور محنت کش کی فتح ہے اور آمریت خود بخود سرمایہ دار کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس طرح حالات طبقاتی جنگ اور باہمی کشمکش کے بعد بین الاقوامی انقلاب کو جنم دیتے ہیں۔

لینن کے انقلابی اصول :

لینن کا خیال ہے کہ جس تنظیم میں اور تحریک میں انقلابی اصول موجود نہ ہوں وہ تحریک کبھی اپنے مقصود کو حاصل نہیں کر سکتی۔ لینن نے اس اصول کو اختیار کر کے بالشویک تنظیم کی قیادت سنبھالی۔ کارل مارکس نے انقلابی قوتوں کو حوصلہ فراہم کیا تھا لیکن لینن نے عملی طور پر انقلاب برپا کر کے نظریات کو عملی شکل دی۔

لینن نے انقلاب کے لئے جو نظریہ پیش کیا اس کا لب لباب کچھ اس طرح تھا کہ "معاشرتی سطح پر اشتعال اس قدر شدید کر دو کہ لوگ مکمل توجہ اور جوش و جذبہ کے ساتھ آپ کے ہم خیال ہو جائیں اور انقلاب و اشتعال میں عوامی مفاد کو بھی مد نظر رکھیں لیکن بنیادی طور پر آپ کے اپنے

ذاتی مقاصد کار فرما ہوں انقلاب برپا کرنے کے بعد حکمران کو منتخب کرنے کی ذمہ داری انقلابی تنظیم کے
سپرد کی جائے اور حکمران کا فرض ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو پوری آزادی اور ایمانداری سے
مفاد عامہ کے لئے استعمال کرے لیکن اس کا طرز عمل ایک آمر کی حیثیت رکھتا ہو۔ کیونکہ ایک آمر ہی
تمام معاشی افراد پر اپنی گرفت قائم رکھ سکتا ہے لینن کا خیال ہے کہ انقلاب کا آغاز چند ایسے افراد کے
ذریعے ہو جو چالاکی ہوشیاری زمانہ شناسی کی مکمل صلاحیت رکھتے ہوں اور یہ ہم خیال اور مر
لوگ اقتدار پر قابض ہو کر اپنے مقاصد کے حصول کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔

لینن نے اپنی کتاب What is to be done? میں انقلاب کے چار لازمی اصول ذکر کئے
ہے۔ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہ ہوگی جب تک اس کو ایک باصلاحیت قیادت کا تسلسل
حاصل نہ ہوگا۔ تاکہ اگر قائد حکومت یا کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو دوسرا اس کی جگہ فرائض انجام
دے۔ یعنی تنظیم اور تحریک کے کام کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنا ہر صورت ضروری ہے۔

2- جتنا زیادہ معاشرے کے افراد کو اپنی تحریک کا اہم خیال بنایا جائے اور انہیں انقلابی فوائد
سے روشناس کرایا جائے تحریک میں اتنی ہی وسعت اور قوت پیدا ہوتی جائے گی اور اس
طرح تحریک کے کامیاب ہونے کے امکانات زیادہ واضح ہوتے جائیں گے کیونکہ اکثریتی آ ز سے
حکومت جلد متاثر ہوتی ہے۔

3- انقلابی تحریک میں کسی تنظیم کو قائم کرتے وقت اس اصول پر کاربند رہنا چاہئے ایسے
لوگوں کو شامل کیا جائے جو انقلابی امور کو خلوص کے ساتھ انجام دیں۔ اگر ان میں خلوص
اور جذبات نہ ہوں گے تو وہ مشکل وقت میں پیچھے ہٹ جائیں گے۔

4- جہاں پر آمریت برسر اقتدار ہو وہاں ایسے افراد کو انقلاب کے لئے آگے لانا چاہئے جو
حساس نہ ہوں۔ جن میں مائل اور قائل ہونے کا جذبہ نہ ہو بلکہ اگر ممکن ہو تو خونی
انقلاب برپا کرنے کے لئے اراکین تحریک کو جنگی تربیت بھی دی جائے لینن کا خیال ہے کہ جس وقت
انقلابی تحریک ریاست میں اپنے امور انجام دینا شروع کر دے تو اس کی رکاوٹ کے لئے تمام حکومتی
ادارے حرکت میں آجاتے ہیں اس کو مکمل طور پر ختم کرنے کی تگ و دو کرتی ہیں۔

لیکن اگر ان کے سامنے اچھی طرح ڈٹ جائیں اور چند افراد کی قربانی سے بھی دریغ نہ
کریں تو پھر اس انقلاب کی کامیابی کے امکان روشن ہو جاتے ہیں لیکن اگر ان قوتوں کے
سامنے جھک جائیں تو پھر زیادہ عذاب اور مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں اس لیے انقلاب کی جو بھی
تحریک چلائی جائے تو اس کو ہر ممکن اور ہر قیمت پر کامیابی سے ہمکنار کرنا چاہیئے۔ تاکہ آمریت کی
دست برداری سے بچا جا سکے۔

انقلابی تحریک کو کامیاب بنانے کے اصول

اکثریت کی حمایت :

انقلابی تحریک کو معاشرے کے کثیر طبقہ کی حمایت حاصل ہونی چاہئے۔ اور حمایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دیہاتی علاقے میں کسانوں کو اس انقلاب کی افادیت سے آگاہ کریں اور ان کے لئے ایسے منشور کا اعلان کریں جو ان کے لئے فائدہ مند ہو اور شہری علاقے میں مزدور اور محنت کش طبقہ کی حمایت حاصل کریں اور ان کو انقلاب کی افادیت سے آگاہ کرنے کے ساتھ ان کے حق ملکیت کی طریقوں سے آگاہ کریں اور کامیابی کی صورت میں ان کا مکمل خیال رکھنے کا وعدہ کریں تاکہ وہ انقلاب کی بھرپور حمایت کر سکیں۔
اگر حمایت کرنے کے قابل نہ بھی ہوں لیکن اس کے خلاف بغاوت اور رکاوٹ پیدا نہ کریں۔

سرگرمیوں میں اضافہ :

تحریک کی سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہونا چاہئے اور خاموشی اختیار کرنے سے تحریک کی ناکامی کو قریب تر لانے کے اسباب مہیا ہوں گے۔
جتنی جلدی ممکن ہو اس تحریک کو پورے معاشرے میں روشناس کرا دیا جائے۔

حکومتی طبقہ کی اقتصادی بدحالی

اگر حکومت اور حکومت کے اداروں کو مالی اور معاشی طور پر ناکارہ کر دیا جائے تو عوام اس سے بددل ہو کر انقلاب کی حمایت کر دیں گے اور انقلابی تحریک جلد کامیاب ہوگی۔
جنگ و جدل اور خون ریزی سے کام (خون ریزی جائز) اگر عوام میں تحریک کی قوت دیکھنے کی ضرورت ہو تو ضروری ہے حکومت کو ناکام بنانے کے لئے دہشت گردی اور خون ریزی سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔
حکومت کی پالیسیوں کو ختم کرنے اور ناکام بنانے کے لئے ضروری ہے کہ خون ریزی سے کام لیں تاکہ عوام حکومت سے بددل ہو جائیں اور آمریت کے ہوتے ہوئے خود کو غیر محفوظ سمجھیں اگر انقلابی تحریک دہشت گردی اور خون ریزی معاشرے میں کش مکش پھیلانے میں کامیاب ہو گئی تو اس کو اپنے مقاصد میں بھی فتح حاصل ہو جائے گی۔

حکومتی ادارے تحفظ دینے میں ناکام :

عوام کے درمیان اس طرح کے خیالات پیدا کر دینے چاہئیں۔ جس سے ان کو حکومت کے

تمام اداروں میں خامیاں نظر آئیں اور وہ محسوس کریں کہ تمام ادارے ان کو تحفظ فر[illegible] کرنے کی بجائے اپنے مفادات کی فکر میں ہیں اور عوام کا خیال رکھنے کی بجائے اپنے اقتدار کے [illegible] و دو میں ہیں یہ خیال عوام کو انقلاب کا داعی بنا سکتا ہے۔

لینن اور ٹراٹسکی :

لینن مارکسزم سے بے حد متاثر تھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا خواہش مند [illegible] یہی وجہ تھی کہ اس نے کئی ایک مفکرین کو مورد الزام ٹھہرایا کہ وہ مارکسزم کو تبدیل کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں لیکن اگر لینن کے نظریات پر بغور نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ خود لینن بھی [illegible] کے نظریات کو وقت اور حالات کے مطابق ڈھال دیتا ہے اور اس کے نظریات میں اپنے خیالات کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔

ایک مشہور مفکر سیبائن کا خیال ہے کہ "حقیقتاً وہ اپنی اصول پرستی کا زیادہ داعی [illegible] ور اس پر عملی کام بہت تھوڑا انجام دیتا تھا۔ جب وہ کسی طرح کے اصول مرتب کر کے ان پر عمل [illegible] تو اس کو مکمل اعتماد ہوتا کہ وہ اصول اس کے مقاصد میں ضرور مددگار ہوں گے وہ مارکسیت کا دعویدار تو تھا لیکن اس نے ملکی حالات کے مطابق اصولوں کو ڈھال لیا۔ لینن کے ساتھ ٹراٹسکی نے بھی اشتمالی نظریات کے ارتقا میں حصہ لیا لیکن چند ایک سیاسی وجوہات کی بنا پر اشتمالیت پسندوں نے اس کی عظمت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اگر لینن اور ٹراٹسکی کے سیاسی نظریات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا [illegible] لینن نے 1917ء میں جن نتائج کا ذکر کیا وہ ٹراٹسکی نے 1905ء میں اخذ کئے۔ 1917ء تک لینن [illegible] پرامن طریقہ سے تبدیلی کے لئے اعتدال کی راہ اختیار کی رکھی۔ لیکن ٹراٹسکی شروع ہی سے [illegible] طاقتوں کو بھرپور حملہ کا سبق دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ سرمایہ دار اور مراعات یافتہ طبقہ [illegible] پر بزدل واقع ہوا ہے وہ شدید اور خون ریزی کا مقابلہ کسی صورت نہ کر سکے گا۔

اور ٹراٹسکی کو مکمل اعتماد تھا کہ وہ انقلاب صرف محنت کش طبقہ کے ذریعے ہی [illegible] میں [illegible] گا۔ ٹراٹسکی نے اپنے اصولوں کو مشترکہ ترقی کے اصولوں کا نام دیا۔

جبکہ لینن کا خیال ہے کہ انقلاب ایک سخت جدوجہد کے ذریعے ارتقائی منازل طے [illegible] کے کامیاب ہوں گے۔

لیکن لینن ٹراٹسکی کے اس نظریہ کی حمایت کرتا ہے کہ روس میں کسانوں کی [illegible] کے بغیر کسی انقلاب کا ظاہر ہونا ممکن نہیں۔ لینن اور ٹراٹسکی کے اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی [illegible] کہ لینن 1905ء کے بعد کے حالات کو دیکھتے ہوئے اشتمالی نظام سے پہلے سیاسی جمہوریت کو لازم [illegible] دیتا ہے جبکہ ٹراٹسکی اس کی نفی کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ کسی بھی صورت میں جمہوریت ضرو[illegible] نہیں بلکہ اشتمالی نظام کو انقلاب کے فوراً بعد مکمل طور پر نافذ کرنا چاہتا ہے۔

1917ء کے انقلاب کے بعد لینن نے بھی اپنے نظریہ میں جمہوریت کی [illegible] کی [illegible]

1917ء ۔ بعد کے حالات نے اس پر واضح کر دیا کہ جمہوری طرز حکومت بھی عیاری اور بد عنوانی پر مشتمل ہو ہے۔

سبائن تحریر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "آزادی پسند سیاسی اداروں پر بے اعتمادی کا رجحان مغربی مارکسیت کے برعکس ہے"

لینن نے جمہوری طرز حکومت کو بے کار قرار دے کر رد کرنے کے بعد لینن نے جمہوریت کی یہی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہو اسے کمیون اور سوویٹ میں نظر آئی۔ اس کا خیال ہے کہ کمیون اور سوویٹ اگر باہم مل کر آزاد پسندانہ طریقے سے حکومت کے نظام کو چلانے کی کوشش کریں تو ایک مثالی طرز حکومت کا قیام عمل میں آسکتا ہے جس میں بدعنوانی کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔ سبائن کا خیال ہے کہ اس طرح کی جدوجہد خود کو دھوکہ دینے کے سوا کچھ نہیں بعد میں لینن نے جمہوریت کے اس نظریہ کو جمہوری مرکزیت کا نام دیا۔ لیکن اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو اس نظریہ میں جمہوریت کی بہ نسبت مرکزیت کو زیادہ جگہ ملی۔ جبکہ جمہوریت برائے نام تھی۔

لینن کے سیاسی نظریات

لینن کے کلی نظریات میں مارکس اور اینگلز کے نظریات کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ جدلیاتی مادیت اور اقتصادی حالات کا معاشرتی ماحول پر اثر شامل ہیں۔

جدلیاتی مادیت

لینن چونکہ مارکس کے نظریات کا پیروکار ہے اس بنا پر وہ مارکس اور اینگلز کے نظریہ جدلیاتی مادیت کا بھی حامی ہے مارکس کا خیال ہے کائنات جدلیاتی مادیت کی بنا پر آگے کی طرف بڑھی اسی طرح لینن کا خیال ہے کہ "ہر فلسفہ یا مادی ہوتا ہے یا پھر مثالی" ان دونوں فلسفوں کے علاوہ اگر کوئی فلسفہ موجود ہے تو پریشان خیالی پر مبنی ہے جبکہ لینن کا خیال ہے کہ مثالی فلسفہ بدعنوان سماج کی نامناسب شکل ہے [illegible] کے ہر شعبہ میں نافذ کیا جا سکتا ہے اس وجہ سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سماجی علوم اور فلسفہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے غیر جانبدار نہیں اس کا خیال ہے کہ معاشیات کے ماہرین سرمایہ دار طبقہ کی حمایت کرتے ہیں جبکہ فلسفہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ مذہب کی عملی ترویج بہتر ہے جبکہ معاشرتی علوم کے ماہرین جدلیاتی مادیت کے دائرے کو مختلف طبقات سے متعلق گردانتے ہیں یعنی ان کا خیال ہے کہ معاشرہ کئی طبقات کا مرکب ہے یعنی بورژوائی ماہر اور پرولتاری ماہر۔ لیکن سماجی علوم کے ماہر چاہے بورژوائی ہوں یا پرولتاری وہ ایک خاص اصول کی وکالت کرتے ہیں۔ اگرچہ لینن کا یہ نظریہ علوم اور تاریخ سائنسی اصولوں پر مبنی نہیں لیکن روس میں اس طرز عمل کو چند عرصہ قبل تک فروغ حاصل رہا ہے۔

سماجی علوم اور تاریخ کے ماہرین کا شمار مختلف طبقات سے تعلق کے ذریعے ہوتا تھا اور وہ اس

طبقے کے مفادات اور اصولوں کو پرچار کرنے والے سمجھے جاتے تھے لینن کا خیال ہے کہ اف... کا تصور صرف علم و فکر تک محدود نہیں بلکہ یہ تضاد اخلاقی امور میں بھی پایا جاتا ہے اور معاشرے ... اخلاق نام کی چیز ایک اضافی خوبی اور صلاحیت ہے اور اخلاقی اصول بھی کسی خاص طبقے کی نمائندگی ... تے ہیں یہی وجہ ہے کہ لینن جس ضابطہ اخلاق کا داعی ہے اس کے بارے میں اپنے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ "ہم **اپنے اخلاقی اصول پرولتاریوں کی طبقاتی کش مکش کے حقائق اور ضرورتوں سے اخذ کرتے ہیں"**

لینن کا خیال ہے کہ جدلیاتی مادیت کا اصول ہر شعبہ ہائے زندگی میں لاگو کیا جا سکتا ہے۔ اخلاق جو انسان کی ایک خوبی ہے وہ بھی ایک خاص طبقے کی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ اخلاقیات میں بھی تضاد پایا جاتا ہے اور یہی تضاد اس کو دوسرے طبقات سے الگ کر دیتا ہے اور اخلاق کی بھی ... اقسام ہوتی ہیں مثلاً اچھے اخلاق اور برے اخلاق اچھے اخلاق اور برے اخلاق کے سبب طبقات مزید ... اقسام میں تقسیم ہوتے ہیں۔ لینن نے اس طریقہ کار کو روس میں لاگو کیا۔ اور عالم انسانیت کو ... مثال پیش کی اس کا یہ بھی خیال ہے کہ تاریخ لکھنے والوں اور فلسفہ کا علم جاننے والوں کی بھی ... اقسام ہیں جو ان کے طبقات کو ظاہر کرتی ہیں **مختصر یہ کہ لینن نے مارکس کے جدلیاتی مادیت کے اصول کو نہ صرف سراہا بلکہ اور اس کی پیروی [illegible] تمام شعبوں علمی** اور اخلاقی **شعبوں پر بھی کر دیا۔**

تاریخ کا مادی نظریہ :

لینن مارکس نظریہ مادی تاریخ کا بھی حامی ہے مارکس کی طرح اس کو مکمل یقین تھا کہ معاشرتی تضاد اور کشیدگی کے نتیجہ میں آخری کامیابی پرولتاری طبقہ کو ہی حاصل ہو گی مزدور ... آ... کار اقتدار کی کرسی پر متمکن ہو سکیں گے اور سرمایہ دار کو ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہوا سرمایہ آ... کار ریاست کے خزانہ میں جمع کروانا ہوگا۔ اور پرولتاری طبقہ کی طرح محنت کش طبقہ کی ... میں شامل ہو کر اپنی صلاحیتوں کے مطابق امور انجام دینا ہوگا اور مزدور کی حق تلفی کے اصول کو ... شرے سے حرف غلط اور فعل بد کی طرح مٹا کر رہنا ہوگا۔

مذہب Religion :

لینن مارکس کی پیروی کرتے ہوئے مذہب کو معاشرتی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا اس کا خیال ہے کہ مذہب فرد کے دیگر معاملات سے زیادہ اہم نہیں۔ جس طرح مارکس نے مذہب کو سرمایہ دار کا محنت کش طبقہ پر استعمال کرنے والا ایک آلہ کار کہا ہے بلکہ اسی طرح لینن بھی مذہب کو سرمایہ دار کا حامی قرار دیتا ہے اس کا خیال ہے کہ سرمایہ دار اس کو استعمال کر کے غریب اور محنت کش طبقہ کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔

ریاست :

لینن کا خیال ہے کہ مارکس نے ریاست کو طبقاتی نظام کی شکل قرار دے کر صحیح کہا ہے لینن کا خیال ہے کہ ریاست کا مقصد مراعات یافتہ طبقہ کی حکمرانی ہے لینن آخر کار معاشرتی کشیدگی کے سبب اس وجہ بھی ختم ہو جاتا ہے جب ناجائز اصولوں کا خاتمہ ہوگا۔ لوگ برابر اور مساوی زندگی بسر کریں گے تو ریاست کا تصور خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لینن کو مارکس کے نظریات کو عملی طور پر معاشرے میں لاگو کرنے کا ہر موقع ملا۔ جس کو اس نے حقیقی شکل میں پیش کرکے ان نظریات کے حقائق کا ثبوت دیا

لینیزم Leninism اور مارکسزم Marxism میں مماثلت

لینن ازم کا اگر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ دراصل لینن ازم مارکس ازم ہی کا دوسرا نام ہے کیونکہ لینن نے زندگی کے تمام شعبوں میں مارکس کے نظریات کو لاگو کیا اور ان نظریات کی پیروی کی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں سرمایہ دار کو زوال اور سوشلزم اور کمیونزم کو عروج حاصل ہو۔ لینن نے اپنی تحریروں کے ذریعے مارکسزم کا پرچار کیا اور عملی طور پر اس کو لاگو کرنے کی تگ و دو کی۔

نظریہ مارکس زندگی کے تمام شعبوں میں مساویانہ اصول کو لاگو کرنے کا داعی ہے اور نہ ہی مارکسزم اور لینن ازم کے نظریات میں کسی قسم کا جمود ہے۔ لینن کا خیال ہے کہ مارکس ازم کا مطلب ہے کہ اس سے تعین کیا جاسکے کہ کن حالات میں کون سی پالیسی اختیار کرنی چاہیے

لینن ازم انسانی معاشرے کو فروغ دینے کا واحد نظریہ ہے جو زمانے کی ساری آزمائشوں پر پورا اترا ہے اگر تاریخ پر نظر دوڑائیں تو سیاسی تعلیمات نے کبھی بھی مارکسزم اور لینن ازم کی طرح محکم اور مستقل صورت اختیار نہ کی۔ مارکس کے نظریات کا کوئی بھی ایسا پہلو نہیں جو لینن نے توضیح اور تشریح کے لئے تشنہ چھوڑ دیا ہو مارکس، اینگلز اور لینن تینوں کے نظریات کا اہم مرکز مزدور اور محنت کش طبقہ ہے اور ان تینوں کے نظریات سماجی ارتقا کی بہترین عکس بندی کرتے ہیں۔ ان کے نظریات کی مدد سے ماضی اور حال کا اندازہ لگانے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی بھی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ مارکس اور لینن کے نظریات کو بین الاقوامی طور پر ناموری حاصل ہوئی کیونکہ اس نے اپنے علاقہ کے لوگوں اور محنت کش طبقہ کی بات نہ کی بلکہ پوری عالم انسانیت کے محنت کش طبقہ کے فلاح کی بات کی اور ان کو آمریت سے نمٹنے کے طریقہ کار سے روشناس کرایا اور مارکس اور لینن کے نظریات کی وجہ سے روس میں مزدور طبقہ برسراقتدار آیا۔

لینن کے ریاست اور جمہوری طرز حکومت کے بارے میں خیالات :

لینن نے ریاست اور جمہوریت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی بنیاد مارکس کے نظریات ہیں تاہم اس نے مارکس کے ان نظریات کو اپنے الفاظ اور اپنی زبان کا لباس اس طرح پہنایا وہ تحریر کرتا ہے کہ "ریاست ابتدائے آفرینش سے قائم نہ تھی۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو پرانے اشتمالی نظام میں نہ تو ذاتی اور نجی سرمائے کا ذکر ہے اور نہ ہی طبقاتی تقسیم کی کوئی بات پائی جاتی ہے۔"

تو پھر معلوم ہوا کہ جب آغاز زندگی میں اس کی ضرورت نہ تھی تو اب کیا ضرورت ہے کہ معاشرتی افراد سے الگ ایک مخصوص ادارہ قائم کیا جائے جو اقتدار کی نمائندگی کرے۔ اگر معاشرے میں تمام افراد نے پرامن زندگی گزارنی ہے تو تمام بالغ افراد باہم مل کر روز مرہ کے امور کو انجام دیں۔ پھر زمانہ نے ترقی کی تو برادری اور خاندان کا ایک سربراہ اس کی جرات قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر چنا گیا جو معاشرے میں مساوات قائم کرنے کا ذمہ دار تھا۔ لیکن جلد ہی اس سربراہ نے اپنے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر اپنی نجی جائیداد میں اضافہ شروع کر دیا اور پھر معاشری عدم مساوات کے سبب مختلف طبقات میں منقسم ہوگئے۔ جس کی وجہ سے معاشرتی امور منصفانہ طریقے سے حل نہ ہو سکے۔ مختلف طبقات کے مفادات کے درمیان تضادات پائے جاتے تھے۔ جو کشیدگی اور تصادم کا سبب تھے اس کشیدگی کو ختم کرنے کے لئے ایک طاقت کا قیام لازم ہو گیا لیکن یہ طاقت، جو سماج اور معاشرے کے اندر کی پیداوار تھی یہ پورے معاشرے پر حاوی ہوگئی اور اپنی آپ کو سماج سے الگ کر کے معاشرے کی نہ صرف حق تلفی شروع کر دی اور خود اپنے مقاصد سے الگ کر کے پر آسائش زندگی کو ترجیح دی یہ یہی طاقت بعد ازاں ریاست، کہلائی۔ ریاست کی انفرادیت یہ ہے کہ اقتدار کے عہدے سے عوام کو الگ کر دیا اور خود معاشرے سے باہر اپنے امور کو انجام دینے لگی۔

اور ریاست ہمیشہ اپنے افراد کے گروہ پر مشتمل رہی جو مکمل طور پر لوگوں اور معاشرتی امور پر حاکم رہا اس بنا پر لوگ دو گروہوں میں منقسم ہو گئے ایک مراعات یافتہ طبقہ حاکم اور مالک کے نام سے شہرت حاصل کر گیا جبکہ دوسرا طبقہ غلام کی حیثیت سے اپنے امور انجام دینے لگا۔ حکمران طبقہ خود کو معاشرے سے بلند اور ارفع خیال کرتا تھا۔ جبکہ غلام طبقہ معاشرے میں کمزور اور حقیر تصور کیا جاتا رہا۔ حکمران اور برسراقتدار طبقہ کو سیاستدان کا نام دیا گیا جو معاشرے کے دیگر افراد پر ناجائز ذرائع سے حاوی تھا۔ اور ملک کی تمام جائیداد کو نجی جائیداد تصور کرتا تھا اور اپنے اقتدار کو طول دینے اور اپنے قدموں کو مضبوط بنانے کے لئے نت نئے مظالم کا آغاز کرتا رہتا تھا۔ اور بعض اوقات تو اپنے خلاف اٹھنے والی آواز کو اس آلہ کار سے بند کرنا تھا جو خارجی دشمن کے لئے بنائے گئے تھے۔

لینن کا خیال ہے کہ ریاست جس مقصد کے لیے وجود پزیر ہوئی اس مقصد کا حصول بالکل تباہ و برباد ہوگیا جب اس میں رہنے والے افراد باہمی امداد کی بجائے باہمی کشیدگی اور ہوس اقتدار کا شکار ہو گئے۔ اقلیتی طبقہ اکثریت پر غالب آجاتا ہے سرمایہ داری اور استعماریت کے دور میں مساوات اور

انصاف دئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ریاست ایک بھرپور طاقت کی نمائندگی کرتی ہے طاقت کی
مخالفات ت سے ہی کی جاتی ہے تاکہ محنت کش اس پر غلبہ حاصل کر سکیں لینن کا خیال ہے کہ
ریاست ر حکومت میں نمایاں فرق یہ ہے کہ ریاست پرولتاری طبقہ کی ایک تنظیم ہے اور پرولتاری
ایک ریا طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا مقصد ظالموں کو کچلنا ان کی طاقت کا خاتمہ کرنا، معاشرتی
اقتصادیا کا قیام عمل میں لانا اور طبقاتی امتیاز کو ختم کرنا ہے دوسری جانب ہماری حکومت ریاستی تنظیم
کی معرا ہے یعنی اقتدار کے عروج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے ریاست کو حکومت کے ساتھ ملا
دینا ہرگز رست نہیں ہے۔

ذل لینن کمیونسٹ ریاست کے طریق کار اور حربوں کو ظالموں کے خلاف عارضی طور پر
استعمال تے ہیں لیکن ریاست کو ہر حال میں ختم کرنا ضروری ہے کیونکہ ریاست ظلم و ستم پر مشتمل
ایک تنظیم کا نام ہے جبکہ کمیونسٹ اسے تبدیل کرنے کے لئے ایسے ہی ایک اچھے ہتھیار کے طور پر
استعمال نے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔"

رکس کا خیال ہے کہ کمیونزم جونہی ایک طاقت بن کر ابھرتی ہے تو ریاست کے وجود کی
ضرورت تم ہو جاتی ہے کیونکہ کمیونزم کے عروج سے ایک غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس
میں ظلم استبدادیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ہر فرد کو حقیقی آزادی حاصل ہو جاتی ہے ہر
شخص ا قابلیت اور محنت کے بل بوتے پر روزی کماتا ہے تو پھر اس میں کسی قسم کے دفاع کی ضرورت
باقی نہیں رہتی۔ پرولتاری آمریت کی ابتدا سے ہی ریاست کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے پرولتاری
آمریت کا واحد مقصد ہی ظلم کے خلاف جنگ سرمایہ داری نظام کا خاتمہ ہے۔

اور ریاست کے خاتمے کے بعد تمام سرمایہ داری وسائل پر پرولتاریت کا قبضہ ہو جاتا ہے اور
تمام معا ے کی املاک کو یکساں طور پر تقسیم کر دیتا ہے۔ تو پرولتاریت کا خاتمہ خود بخود ممکن ہو جاتا
ہے اور یک میونسٹ معاشرہ وجود میں آجاتا ہے۔

ینن کے نظریہ کے مطابق روس میں عوام کی حکومت قائم ہوئی اس حکومت کے قیام سے
ریاست روس کے محنت کش طبقہ نے یکساں اور مسلسل جدوجہد کے بعد سرمایہ دار پر سبقت حاصل
کی۔ او حکومت کے تمام اراکین عوام کی منشا و رضا سے منتخب کردہ ہیں۔ ریاست کے ارباب اختیار کو
کسی ذ احد کی مرضی سے تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست کا کوئی بااختیار رکن اپنی مرضی سے کوئی
قانون نذ کرنے کا اہل اور مجاز نہیں ہر قسم کے اقدام کے لئے ان کو باقاعدہ حکمران سوشلسٹ یا
کمیونسٹ جماعت کے ساتھ مشورہ کرنا پڑتا ہے چونکہ یہ جماعت عوام پر مشتمل ہوتی ہے اور عوام کی
منتخب دہ ہوتی اور عوام کی فلاح کے لئے سرگرم ہوتی ہے۔ لہذا ارباب اختیار عوام ہوتی ہے اور یہی
مل سوریت ہے۔

نظریہ امپیریلزم :

مارکس کا خیال ہے کہ سرمایہ داری نظام کا انتہائی عروج امپیریلزم کی صورت ظاہر ہوگا۔ جس کی مکمل واضحات لینن نے اپنے نظریات میں کی جبکہ سٹالن نے لینن کے نظریات کو یریلزم اور پرولتاری انقلاب کے دور کی مارکسیت کا نام دیا۔ لینن نظریہ امپیریلزم کے ذریعے یہ وا ن کر نے کی کوشش کی ہے کہ امپیریلزم نے سرمایہ دارانہ نظام کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جب طبقاتی کشمکش قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر ہونے لگی تو سرمایہ داری نظام نے بھی بین الاقوامی رت اختیار کرلی۔ سرمایہ داری کی بین الاقوامی شکل کا نام امپیریلزم ہے جیسا کہ مارکس نے کہا کہ مایہ رانہ نظام کا ارتقا افراد کے ٹکراؤ کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہ تضاد اس نظام کے اندر سے جنم لیتا ہے ا پھر یہی تضاد آخر کار اس کے خاتمہ کا سبب بن جاتا ہے۔ محنت کش طبقہ جن مصنوعات نت صرف کرتے ہیں خود ان سے محروم رہتے ہیں کیونکہ ان کی قوت خرید بہت کم ہوتی ہے جس سرمایہ دار دوسرے ممالک میں اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی تلاش کرتے ہیں مصنوعات کی پیت ونے لگتی ہے پھر انہیں مزید خام مال کی ضرورت محسوس ہوتی ہے پھر خام مال بھی غیر ملکی نڈیوں سے سستے داموں حاصل کیا جاتا ہے اس طرح غیر ممالک میں مقبولیت اور نو آبادیات حاصل نے لئے سرمایہ دار ممالک لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دیتے ہیں اب غیر ممالک میں مقبوضات نو آیات حاصل کرنے کے لئے سرمایہ دار ممالک میں لوٹ کھسوٹ کا بازاگرم کر دیتے ہیں اب ممالک میں وہ تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی سرگرم عمل ہیں اس طرح ری نیا دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک سرمایہ دار بورژوا طبقہ دوسرا پرولتاریہ پر مشتمل اس طرح بورژوا اور پرولتاریہ جب چند بڑی طاقتوں میں منقسم ہو جاتا ہے تو وہ باہمی کشیدگی کو دیتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام بین الاقوامی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جسے لینن نے امپیریلزم کا نام ہے۔

امپیریلزم کے ذریعے بڑی اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں ملک کے اندر اور ملک نے با صنعتی ذرائع اور مزدوروں کی محنت کا ناجائز انتفاع عروج پر پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ سے عوا حکمرانوں کے معاشی اور سیاسی حکم ناموں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے جب کہ نو آبادیاتی نظام بورژ بقہ کے لئے اکثیر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ نو آبادیاتی نظام بورژوا طبقہ کے لئے اکثیر کی حیثیت رکھتا یہ نو آبادیاتی نظام بورژوا طبقہ کی حوصلہ افزائی کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے بقول لینن امپیریلز ولتاریہ کے لئے مصائب و الم کے سوا کچھ نہیں یہ افلاس اور قحط کا سبب بھی بنتا ہے اور اس ساتھ ساتھ بدعنوانی کا مرتکب بھی ہوتا اور یہی نظام دیگر معاشرتی برائیوں کو جنم دینے میں اپنے ے بنیادی کردار ادا کرتا ہے لینن کا خیال ہے کہ ایک وقت ایسا ہوگا کہ جلد ہی بعض ممالک یں پ لتاری اشتراکی نظام کی پیروی کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرکے انقلاب برپا کردیں تاکہ شتمالی اور اشتراکی بنیادوں پر معاشرے کی تنظیم نو ہو سکے۔

لینن کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نہ صرف مزدور کے حق کو غصب کرتا ہے بلکہ چھوٹے سرمایہ داروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر ختم کر دیتا ہے ابتدائی ایام میں یہ فعل ملک کے اندر یعنی داخلی طور پر انجام دیا جاتا تھا لیکن اب یہ خارجی اور بین الاقوامی سطح پر بھی ہونے لگا ہے۔ بورژوا اور پرولتاریہ طبقہ میں کشیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کے اندر ہر نئے سرمایہ دار کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور عالمی سطح پر ترقی یافتہ قومیں ترقی پزیر قوموں کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں تاکہ ان کی حکمرانی اور طاقت عالمی سطح پر برقرار رہے اب ایشیا اور افریقہ کی متعدد قومیں یورپ کے نوآبادیاتی نظام کی مخالفت میں انقلاب برپا کر رہی ہیں جس کی وجہ سے عالمی سطح پر آزادی کی نئی تحریکیں ابھرنے لگی ہیں۔

نظریہ انقلاب :

لینن نے اپنے نظریات کو عملی شکل دے کر روسی سلطنت میں انقلاب برپا کر دیا یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مفکر نے اپنے نظریات کو عملی طور پر معاشرے پر لاگو کر کے پیش کیا ہو۔ لہٰذا اس کے نظریات سائنسی اصولوں کے برابر کا درجہ رکھتے ہیں مارکس کا خیال تھا کہ ہر معاشرے کو تمام ارتقائی عمل سے گزرنا ایک لازمی فعل ہے جبکہ لینن نے اس کے اس نظریہ کی نفی کی اور کہا کہ انقلابی سوچ نہ تو مزدور میں ہے اور نہ ہی کسان میں لہٰذا انہیں نظریاتی رہنمائی کے لئے تعلیم یافتہ اور مستقل مزاج رہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو جدلیاتی اصولوں کے طریقہ کار کو اچھی طرح جانتا ہو۔

اس لئے لینن کا خیال ہے کہ درمیانے طبقہ کے بعض پڑھے لکھے افراد اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یا تو مزدوری اور معمولی محنت کے قائل نہیں ہوتے یا پھر ان کے اندر اپنے حقوق کو حاصل کرنے کا شعور جڑ پکڑ چکا ہوتا ہے لینن اس کا خیال ہے کہ معاشرہ کی تبدیلی کے لئے انقلابی مرحلہ ضروری ہے جو کہ ایک طویل جدوجہد اور صبر آزما امور اور قربانیوں پر مشتمل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لینن کے پیشہ ور انقلابی نظریہ کو مارکس کے نظریات میں اہم ترین اضافہ خیال کیا جاتا ہے جس سے اس نے کارکنوں کی تنظیم اور انقلابیوں کی تنظیم کے درمیان ایک حد مقرر کر دی۔

لینن کا خیال ہے کہ اگر محنت کش اور کارکن انقلابی نوعیت کی تحریک نہیں رکھتے تو ان کی تمام قربانیاں بے معنی ہیں۔

لینن ایک خاص نظریے کے تحت روس میں انقلاب برپا کرنے کا خواہش مند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لینن نے بارہا یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ پرولتاری انقلاب کا بنیادی اور اہم مقصد محض سیاسی اقتدار کا حصول نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو منصفانہ اصولوں پر چلانا ہے۔

محنت کش کی آمریت :

لینن کی تصنیف "ریاست اور انقلاب" پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ لینن کا خیال ہے کہ ہر قسم کی ریاست طبقاتی کشیدگی اور چپقلش کا نتیجہ ہے لیکن وہ ریاست جو اشتمالی انقلاب کے بعد ظہور پزیر ہوگی اس میں طاقت اور دباؤ کا استعمال ناگزیر ہوگا۔ صرف جب محنت کش (پرولتاری) بقیہ حقیقی اشتمالی نظام قائم کرے گا تب ریست آہستہ آہستہ اپنی شکل و ہیئت کو تبدیل کر دے گی۔ لینن کا خیال ہے کہ یہ بالکل حقیقت کہ برعکس ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور بورژوا طبقہ کی آمریت خود بخود آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی لیکن لینن یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کس طرح پرولتاری آمریت غیر طبقاتی معاشرے میں تبدیل ہوئی۔ لیکن بعد میں اس نے کہا کہ بورژوا معاشرے میں جمہوری حکومت ایک اچھا طرز حکومت ہے۔ لینن نے اشتمالی انقلاب کو دو مرحلوں میں منقسم کیا ایک مرحلہ اس نے اشتراکیت کہا جبکہ دوسرے کو اشتمالیت کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا خیال ہے کہ پہلے مرحلہ میں بدعنوانی اور ناجائز ظلم و ستم کچھ حد تک محدود ہو جائیں گے مگر ان کا مکمل طور پر خاتمہ نہ ہو سکے گا جبکہ اشتمالی مرحلہ میں یہ ختم ہو سکتی ہے لیکن لینن کا حقیقت پر مبنی خیال یہ ہے کہ شاید اس عالم انسانی میں دوسرا مرحلہ کبھی نہ آئے۔

پرولتاری آمریت انقلاب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قائم کی جائے گی مارکس کا خیال ہے کہ پرولتاری آمریت انقلاب کی تکمیل کے بعد خود بخود دیانت دارانہ طریقہ سے اقتدار سے ہٹ جائے گی لیکن لینن نے اس کے اس خیال کی نفی کرتے ہوئے کہا ہو سکتا ہے کہ دوسرا مرحلہ کبھی نہ آئے۔ بلکہ یہ پرولتاری آمریت اقتدار پر برسراقتدار آنے کے بعد مستقل رہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی آمریت اور جمہوریت اقلیتی جمہوریت اور بدعنوان آمریت ہے۔ پرولتاری آمریت جو اشتمالی نظام کے لئے ایک عارضی مرحلہ ہے ایک ایسی جمہوریت ہوتی جو اکثریت کی حمایت کے سبب وقوع پزیر ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی آمریت، ناجائز سرمایہ داروں کا مکمل طور پر معاشرے اور ریاست سے خاتمہ کر دے گی۔ لینن کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ریاست ایک ایسا آلہ کار ہے جو محنت کش کو دبانے کے لئے کام آتی ہے جبکہ پرولتاری آمریت تمام طبقات کو برابر کے حقوق فراہم کرتی ہے۔

سوشلسٹ انقلاب اور قوموں کی خود اختیاری :

1916ء میں لینن نے سوشلسٹ انقلاب اور قوموں کی خود اختیاری پر ایک مدلل اور واضح تقریر کی جو روس کے رسالہ Vorbote (وور بوٹ) میں 1916ء میں ہی شائع ہوئی بقول مارکس سامراج سرمایہ داری نظام کے ارتقا کی سب سے اعلیٰ منزل ہے اس میں ترقی یافتہ قوموں کا سرمایہ سرحدوں سے باہر نکل کر عالمی سطح پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے لگتا ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ

یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سرمایہ دار حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لئے پرولتاری طبقہ کی انقلابی تگ و دو وقت کی اہم ضرورت بن کر رہ جاتی ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کوئی ایک قوم کا نام نہیں اور نہ ہی یہ کسی ایک مورچہ کی لڑائی ہے بلکہ شدید طبقاتی جدوجہد کا پورا دور ہے اور اقتصادیات اور سیاسیات کے مسائل کی جنگ جو دو طبقوں کو باہم ملانے کی جدوجہد اور تگ و دو بھی ہوتی ہے۔

اس میں حقیقی لڑائی سرمایہ دارانہ نظام کی نجی جائیداد کو ختم کرنے کے بارے میں ہوتی ہے۔

لینن کا خیال ہے کہ یہ فرض کرنا غلط ہے کہ جمہوریت کی خاطر جدوجہد پرولتاریہ کو سوشلسٹ انقلاب کے راستے سے بھٹکا سکتی ہے اس کا خیال ہے کہ پرولتاری طبقہ اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ جمہوریت کی خاطر اپنی جدوجہد کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری نہ رکھے۔ لینن کا خیال ہے قوموں کی حق خود اختیاری سے مراد صرف سیاسی خود مختاری نہیں بلکہ خود مختیاری سے مراد زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل آزادی ہے۔ سوشلزم کا مقصد چھوٹی ریاستوں میں انسانی معاشرے کی تقسیم کو ختم کرنا ہے قوموں کو صرف ایک دوسرے کے قریب لانا ہی ممکن نہیں بلکہ ان کو باہم ملا دینا بھی ہے۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہم سوشلزم کے اصولوں پر کاربند ہو کر محنت کش اور محکوم طبقہ کی آزادی کی جدوجہد کریں جیسے ہی پرولتاری اپنی آمریت قائم کریں گے تو طبقات کا خاتمہ ہو جائے گا اور ریاست کے تمام افراد کے درمیان باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اگر دیکھا جائے تو طبقاتی جدوجہد جمہوریت کے قدموں میں ہی پل کر جوان ہوتی ہے اور پرامن سرمایہ دارانہ نظام پر مکمل بھروسہ رکھتی ہے لیکن یہ پرامن خام خیالی پر مشتمل ہے۔

قومی خود اختیاری کی جدوجہد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ پرولتاریہ مظلوم اور محکوم افراد کو ایک علاقے کے اندر ان کی منشا کے بغیر بند رکھنے کے جواب میں انقلاب برپا کرے۔ پرولتاریہ طبقہ کا فرض ہے کہ ان نو آبادیاتی علاقوں پر ان قوموں کی سیاسی علیحدگی کی آزادی کا مطالبہ کرے جن کو پرولتاریہ اپنی قوم ظلم و جبر کی چکی میں پیس رہے ہیں اور جب تک پرولتاریہ طبقہ اس قسم کے اصول لاگو کرنے سے قاصر ہے پرولتاری بین الاقوامیت صرف بے معنی اصطلاح کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بغیر ظالم اور مظلوم قوموں کے مزدوروں کے درمیان اتحاد و اعتماد پیدا نہیں ہو سکتا۔ لینن کا خیال ہے کہ جب سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو تو اس وقت ریاست کی ضرورت بھی ختم ہو جائے گی زوال ریاست کے نتیجہ کے طور پر آزاد معاشرہ قائم ہو گا جس میں سماجی ادارے قومی خدمت کے جذبے کے تحت کام کریں گی یہ اشتمالی نصب العین کے حصول کی ابتدا ہوگی اور ایسا معاشرہ قائم ہو گا جس میں طبقات کی تقسیم بالکل نہ ہوگی اور یہ معاشرہ بے ریاست معاشرہ بھی کہلائے گا۔ کیونکہ بورژوا طبقہ کی آمریت کے ساتھ اس ریاست کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور ایسا معاشرہ اشتراکی نظام کے تحت کام سرانجام دے گا۔ ہر شے ضرورت کے مطابق وافر مقدار میں دستیاب ہوگی۔ ہر شخص اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق محنت کرے گا اور ہر فرد کو آزادانہ اور مکمل ترقی کے مواقع فراہم

کئے جائیں گے۔ پروفیسر جز حرمن نے کہا کہ اشتراکی نظام کے داعی گرچہ ظاہری طور پر [illegible] تاری طبقہ کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں لیکن حقیقی طور پر ان کی جنگ پوری عالم انسانیت کی [illegible] کے لئے ہے۔ لینن کا خیال ہے کہ شعوری منصوبہ بندی اور پرولتاری طبقہ کی مضبوط قوت [illegible] سبب یورپ کے صنعتی اصولوں میں اشتمالیت کے اصول لاگو کئے جاسکتے ہیں۔

لینن کا خیال ہے کہ حق خود اختیاری کا حصول صرف انقلاب کے ذریعے [illegible] جب معاشرہ طبقات کی تقسیم سے عاری ہوگا تو حق خود اختیاری خود بخود حاصل ہو جائیں گے

حاصل بحث :

لینن کے نظریات کا ماحصل تلاش کریں تو معلوم ہوگا کہ لینن ایک ایسا بیسویں صدی کا مفکر تھا جس نے کرہ ارض پر ایک انقلاب برپا کرکے پوری عالم انسانیت کو بوکھلا دیا۔ [illegible] سرمایہ دار [illegible] کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا۔ آمریت پسند عناصر کی چولیں ہل کر رہ گئیں۔ شہنشا[illegible] تخت میں دراڑیں پڑتی محسوس ہوئیں۔ کیونکہ لینن گرچہ مارکس کے بعض نظریات میں رد[illegible] کرنے اور حالات و وقعلت کے مطابق ان نظریات کو ڈھل جانے کا قائل تھا لیکن اس کے ساتھ [illegible] مارکس کے نظریہ جدلیاتی مادیت اور تاریخ کے مادی نظریہ کو بخوشی اور فخر سے قبول کرتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ لینن مارکس کے نظریات کو اس وقت کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب رہا۔ یہی چیز اس کو ایک مستقل اور عملی مفکر کی حیثیت سے عالم میں نمایاں کر[illegible] میں کامیاب رہی اس نے اشتمالی انقلاب کو بین الاقوامی سطح پر کامیاب کرنے کی بجائے اس کا آغاز [illegible] سطح [illegible] تبدیلی اس کو عملی طور پر کام کرنے میں مدد دینے لگی۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ [illegible] میں اشتمالی انقلاب قائم کرنا ممکن ہوگیا۔ 1905ء کے حالات کی وجہ سے سیاسی جمہوریت کو اشتمالیت [illegible] لازم قرار دیا لیکن پھر 1917ء میں اس نے اپنے نظریات میں ردو بدل کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوویت تنظیم بذات خود ایک بہترین جمہوری نظام ہے اس کا خیال ہے کہ بورژوائی جمہوریت کی نسبت پرولتاری آمریت کئی درجہ بہتر ہے کیونکہ یہ اکثریت پر مبنی ہے لینن نے ملی تہذیب [illegible] اہمیت نہ دی بہرحال اس نے اقلیتوں کے لئے تہذیبی مساوات کے خیال سے ہمدردی کا اظہار کیا [illegible] عہد میں ملی اور نسلی اقلیتوں کے بارے میں مناسب پالیسی اختیار کی گئی اور ملی ریاست کی [illegible] نظریاتی مملکت کی حمایت کی۔ لینن کے نظریات میں محنت کش طبقہ کی حمایت اور سرمایہ دار [illegible] معاشرے کے لئے زہر قاتل کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔ لینن کا خیال ہے کہ محنت کش طبقہ ریا[illegible] کی علاج کا باعث ہے۔

[illegible] کو منوایا۔

سوال: سوشلزم کے بنیادی نکات بیان کریں ... 2003ء

سوال: سوویت اور چینی نیشنلزم ... 2006ء

سوال: چین میں اشتراکی نظریہ کے بنیادی ... 2007، 2008، 2009ء

ماؤزے تنگ Mao Tse-Tung

جواب : علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" فخر چین اور نامور رہنما و قائد ماؤزے تنگ چین کے صوبہ ہنان Hunan میں 19 نومبر 1893ء کو پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ایک متوسط طبقہ کے کاشت کار گھرانے سے تھا قدرت نے اس کو بلا کی ذہنیت و فکر عطا کی وہ بچپن ہی سے باغیانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ مگر اس کو فہم و فراست کا مرقع کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ابتدائی تعلیم اس نے والدین سے دس سال تک علیحدہ رہ کر معمولی مدرسوں میں حاصل کی بچپن کے ... مختلف طبقات کے بچوں کے درمیان گزارے ان دنوں چین میں بدعنوانیاں عروج پر تھیں معاشرتی برائیاں معاشرے کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ ہر طرف کشمکش اور ... کے بادل چھائے تھے۔ چین بڑی سبک رفتاری سے تاریکیوں اور تنزلیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ لوگوں میں محنت کا جذبہ ناپید ہو چکا تھا۔ ان تمام ملکی حالات نے ماؤزے تنگ کو بے حد متاثر کیا اس کا ... محبت کا جذبہ حب الوطنی سے سرشار حساس دل اور احساس ذہن وطن کی بہتری کا خواہاں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف مفکرین اور فلاسفروں کے نظریات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا مارکس اور لینن کے نظریات و افکار پڑھنے کے بعد اس کے باغیانہ ذہن نے اس کو انقلاب پر اکسایا مگر ... تنگ میدان کار زار میں اس کے اپنے پاؤں بھی مضبوطی سے جم نہ پائے تھے۔ چنانچہ اس نے 18...ء میں پیکنگ جا کر ایک یونیورسٹی میں عارضی طور پر بحیثیت لائبریرین کے کام کیا۔ اور انہی دنوں ... کی ملاقات چینی کمیونسٹ پارٹی کے بانی دو پروفیسروں پروفیسر لی تاچاؤ اور پروفیسر چن تو شیو سے ہوئی۔ اس ملاقات کے دوران ماؤزے تنگ نے ان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بہت فائدہ حاصل کیا۔ ...

... مارکس اور لینن کے افکار نظریات نے اس کے ذہن میں ہلچل مچا دی اس نے تہیہ کیا کہ چینی عوام کی ہر ممکن حالت سدھارنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اس کو انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ... اور اس انقلاب کے لئے اس کو بھرپور عوامی طاقت کی بھی ضرورت تھی اس مقصد کے لئے اس ... ایک باہم منظم تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا چونکہ تن تنہا وہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس ... لئے 1921ء میں چین کے صوبہ ہنان میں ہی اس نے چینی کمیونسٹ پارٹی قائم کرکے خود اس کے ... کی حیثیت سے کام انجام دینے لگا آہستہ آہستہ لوگ اس کی جماعت کے منشور سے آگاہ ہونے لگے چنانچہ اس نے "ٹریڈ یونین" تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس کو مقامی طور پر اس میں کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ کمیونسٹ پارٹی چین میں قومی قیادت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آگئی۔ آخر کار

ایک اکثریتی جماعت کی نمائندگی کرنے لگی- عوام نے اس تنظیم کے اصول اور منشور کو ... تک پسند کیا ماؤزے تنگ نے اس دوران حالات کا جائزہ لے کر یہ جانچا کہ اگر اس ملک کا ... طبقہ خاص کر کاشت کار اور کسان اس جماعت میں مکمل طور پر شامل ہو کر بھرپور اعتماد ... آگے بڑھیں تو ملک کے اندر انقلاب برپا کرنے میں آسانی ہوگی- چنانچہ اس نے کاشت کار ... کو ... کرنا شروع کر دیا- آخر کار 1926ء میں اس نے کسانوں کو بغاوت کرنے پر مکمل طور پر تیار ... اور ... ہر طرح کی قربانی کے جذبہ سے سرشار ہو کر بغاوت اور انقلاب کے میدان میں کود ... کو قتانگ فوج کے ہاتھوں بری طرح کچلے گئے اور حکومت نے ماؤزے تنگ کو باغی قرار دے ... پکڑنے کی کوشش کی تو ماؤزے تنگ نے ملک کے پہاڑی جنگلوں میں پناہ لی- چند عرصہ وہ پہاڑی جنگلوں میں پڑاؤ کرتا رہا-

قدرت نے ماؤزے تنگ کی راہبری کی اور اس دوران اس کی ملاقات ایک ... باغی گروہ سے ہوئی جو خود کو گوریلا کے نام سے موسوم کرتے تھے- ماؤزے تنگ نے ان ... کے ساتھ مل کر اس نے ایک فوج تیار کرنے کا تہیہ کیا اور اس مقصد کے لئے اس نے روسی ... سے امداد طلب کی اور ان کی ہمدردیوں کے ذریعے وہ فوج تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ... 193 تک ماؤزے تنگ نے خفیہ تنظیم کے ساتھ کام کیا اور پھر اس تنظیم کا چیئرمین منتخب ہو گیا-

ماؤز کو قتانگ فوج کو شکست دینے کے لئے بھرپور فوج اور قوت کی ضرورت ... سرخ فوج نے ماؤزے تنگ کی انقلابی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے کمیونسٹ قائد ماؤزے تنگ پر اعتماد ... چنانچہ انہوں نے اپنی سرخ فوج کو من تانگ فوج کے ساتھ جنگ میں شامل کر دی جس میں ... تانگ نے سرخ فوج کو بری طرح ناکام کیا- اور اس کے تمام دفاعی مورچے تباہ و برباد کر دیئے- ماؤزے تنگ ... بچی کچی فوج کے ساتھ شمال مغربی چین بھیج دیا گیا- انہوں نے ایک سال تک خفیہ طور پر ... کو منظم کیا جب فوج پوری طرح میدان میں اترنے کے قابل ہو گئی تو ماؤ کو اس وقت کی تلاش ... سے فائدہ اٹھا کر وہ انقلاب برپا کرتا چنانچہ جاپان نے 1930ء میں منچوریا پر حملہ کر کے ان کو موقع فراہم کر دیا- اور ماؤزے تنگ کے لئے کمیونسٹوں کے دفاع کا یہ بہترین موقع تھا- جاپانی فوج نے ... من تانگ فوج کو بری طرح شکست سے دوچار کیا- دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد چینی کمیونسٹوں اور کومن تانگ فوج کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی- جو ایک سرد جنگ ... شکل اختیار کر گئی بالآخر کومن تانگ فوج کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور کمیونسٹوں نے چین کو ... کا نا ... دیا ماؤزے تنگ اپنے وقت کا ذہین اور دور اندیش شخص تھا- جس نے اپنی صلاحیتوں ... مقام حاصل کر لیا اور اپنی قابلیت کے ذریعے مارکس اور لینن کے نظریات کا دفاع کیا ... کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کر دیا-

جس وقت سامراجیت اپنی مکمل تباہی اور سوشلزم عالمی فتح کی طرف بڑھ رہی ... لینن کے اور مارکس کے نظریات کو ماؤزے تنگ نے زندہ کر دیا- چین کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں ...

تنگ کے خیالات افکار اور سیاسی فکر کو اصولوں کی حیثیت دی گئی۔
1953ء میں ماؤزے تنگ نے سٹالن کی وفات کے بعد نظریاتی قیادت پر زور دیا اور استعماری طاقتوں کو سیاہ عالم کا نام دیا۔ اس نے امید ظاہر کی کہ کمیونسٹ اس دنیا اس سیاہ عالم کا تختہ الٹ دیں گے اور اپنی فتح کے جھنڈے چار سو لہرائیں گے۔
اس نے ملک کی خوش حالی اور ترقی کے لئے دن رات محنت کی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم عرصہ میں چین سپرپاور کی شکل اختیار کر گیا۔ 1955ء میں ماؤزے تنگ اپنے سرکاری عہدے سے سبکدوش ہو گیا لیکن کمیونسٹ پارٹی سے اپنا رابطہ اور تعلق جاری رکھا ماؤزے تنگ نے چین کی عوام کو خوش حال بنایا اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں مضبوطی سے شامل کرنے کے لئے دن رات کام کیا۔ ماؤ کے نظریات کو اس کی تقاریر اور تحریر سے باآسانی سمجھا جا سکتا ہے اور بلاشبہ جدید دور میں ماؤ ایک بہترین قائد کی حیثیت سے اس دنیا میں آیا۔

چینی اشتمالیت:

چین کو دنیا میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک تصور کیا جاتا ہے اور ماؤزے تنگ بنیادی طور پر لینن کے نظریات کا حامی ہے اور چین میں اشتمالیت ماؤزے تنگ کے خیالات پر مبنی ہے اور اگر چین اور روس کی اشتمالیت کا تقابلی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں اس کی اہم وجہ روسی اور چینی اداروں اور سیاسی شعبوں کا اختلاف ہے چین کی ذرائع پیداوار پر نظر دوڑائیں تو یہ ایک زرعی ملک نظر آتا ہے وہاں زمین کی ایک بہت اہمیت مسئلہ تھی اس مسئلہ کو اشتمالیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی چین کی انقلابی سرگرمیوں پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ انقلابی سرگرمیوں کا 1911ء میں ڈاکٹر سن یات سین نے کیا۔ اس نے چین کی عوام کے لئے روزگار کے تین اصول وضع کئے جو کہ معتدل قسم کی اشتراکیت پر مشتمل تھا۔ 1919ء میں جب چین کی سرزمین بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت میں مبتلا ہوگئی تو چینی عوام کسی انقلاب کی خواہش مند تھی جبکہ انہی دنوں روس میں بالشویکوں نے اختیارات حاصل کئے چین کے تعلیم یافتہ اور باصلاحیت لوگوں نے روس کی اشتمالت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور 1918ء میں اشتمالی سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا اس وقت لی تاؤچا ز چین کا عظیم فلاسفر تھا جس کی لائبریری میں ماؤزے تنگ نے بحیثیت لائبریرین کے فرائض انجام دیئے۔ جولائی 1921ء تک پیکنگ کینٹن، شنگھائی اور ہنان وغیرہ میں اشتمالی جماعت قائم ہو چکی تھی۔ اور پرولتاری طبقہ اس کی قیادت میں ابھرنے لگا سن یات سن بھی لینن کے نظریات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے اپنے تین اصولوں میں سے قومیت کے اصول کی خاطر کومن تانگ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ جو چین کے تمام طبقات کی ایک نمائندہ جماعت کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ جس میں اشتراکیوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ اشتراکی اپنی جماعت کے رکن ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پر کومن تانگ میں بھی شامل تھے۔ اس دوران

روس کا ایک اشتمالی رہنما بوردن چین میں آ گیا جس نے سن یات سین کی ہر ممکن امداد ... شروع میں اشتراکیت کے حامی افراد نے کومن تانگ تنظیم میں کئی اہم عہدے حاصل کر لئے۔

ڈاکٹر سن یات سین کی وفات کے بعد جنرل جیانگ کائی شک کو پارٹی کا صدر منتخب ... یا جنرل یانگ کائی شک نے اشتمالیت کے حامی افراد کو اپنی جماعت میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ ... ر کومن تانگ سے انقلابیوں کی کثیر تعداد کو نکال دیا اور اس کی مخالفت اور اس کی تنظیم کی مخالفت کرنے والے افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بوردن واپس روس چلا گیا ماؤزے تنگ چونکہ ... شت ... در طبقہ کا فرد تھا اس نے کسانوں کو باہم متحد کر کے انقلاب پر اکسایا۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ ... وام ... ں بے اطمینانی کی حقیقی وجہ کیا تھی۔ اس دوران ماؤزے تنگ کی پارٹی میں نوجوان طبقہ بڑی ... ی ... ے حصہ لینے لگا۔ جمہوری آمریت قائم کرنے کے لئے کسانوں اور مزدوروں کا اتحاد قائم ہو رہا ... لیکن جیانگ کائی شک اس خطرے کو بھانپتے ہوئے فوجی قوت کو بڑھانے لگا۔ اور ہر حساس شعبے ... سرخ فوج تعینات کر دی۔ 1927ء تک قوم پرست کومن تانگ اور اشتمالی جماعت کے درمیان ... ختلافات مزید وسعت اختیار کر گئے۔ زرعی اصلاحات کے نعرے بلند ہوئے جبکہ اشتمالیوں پر ظلم ... کی ... داستانیں رقم کی جا رہی تھیں خانہ جنگی کی ابتدا ہو چکی اور سرد جنگ کے بادل فضا میں منڈ ... نے لگے اور ماؤزے تنگ کو اپنی فوجی طاقت بڑھانے کا موقع نصیب ہوا۔ 1931ء میں وہ چین کی عبوری حکومت کا چیئرمین منتخب ہو گیا اس دوران جاپان نے منچوریا پر حملہ کر دیا۔ 1931ء میں ہی کومن تانگ تنظیم ... فوج نے مدن اور چھول کے صوبے خالی کر دیئے جس سے اشتمالی تحریک کو حوصلہ ملا۔ ایک طرف ... قوم پرست جاپان سے نبرد آزما تھے دوسری طرف اشتمالی کومن تانگ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ آخر کار 1935ء میں کومن تانگ نے اشتمالیوں کے ساتھ اتحاد قائم ... کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور پھر دونوں ملکی جماعتیں ملکر جاپان کا مقابلہ کرنے لگیں۔

لیکن دوسری عالمی جنگ کے دوران جیانگ کائی شک نے تمام اشتمالی افواج کو تو ... میں جھونک دیا لیکن اپنے جانباز فوجی دستوں کو محفوظ رکھا تاکہ جنگ کے بادل چھٹ جانے کے بعد اشتمالیوں سے نبرد آزما ہوا جا سکے ان سے مقابلہ کر کے ختم کیا جا سکے لیکن قسمت کی خرابی کہ جیانگ کائی شک کی فوج بدعنوانی کی مرتکب ہونے لگی لوگوں کے مقاصد کو اپنے اہم امور سے ہٹا دیا۔ جس کی ... سے دوبارہ عوام میں چپقلش مایوسی اور کشیدگی کے بادل منڈلانے لگے۔

ان حالات نے اشتمالیوں کو انقلاب برپا کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ لوگوں کو اعتماد میں لینا اور ملک کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار وہ وقت آن پہنچا کہ 1949ء ... دنوں میں جیانگ کو اس کے حامیوں سمیت جزیرہ کارموسے (تائی دان) میں پھینک دیا گیا۔

اور چین پر اشتمالیت کا اقتدار قائم ہو گیا ماؤزے تنگ ایک مثالی نڈر کی حیثیت سے برسر اقتدار آ گیا۔

ماؤزے تنگ نے اپنے افعال و کردار اور اپنی علمی بصیرت کے ذریعے چین کو ترقی خوش حالی

کی نئی راہیں دکھائیں۔
چین کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل کر دیا۔ ماؤزے تنگ کے سیاسی فلسفہ کو سمجھنے کے لئے ان کی تقاریر کے اہم اقتباسات درج ذیل ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی :

ماؤزے تنگ نے کہا کہ "انقلاب لانے کے لئے ایک انقلابی جماعت کی ضرورت ہے یہ جماعت مارکسی اور لینی انقلابی طرز پر قائم کی جائے گی اور جماعت کے بغیر مزدور طبقے اور عوام کی قیادت کرنا اور سامراج اور اس کے حواریوں کو شکست دینا ناممکن ہے" چینی کمیونسٹ جماعت کی جدوجہد کے بغیر چینی کمیونسٹوں کو چین کا حقیقی رہنما تسلیم کئے بغیر چین نہ تو قومی آزادی حاصل کر سکتا ہے اور نہ صنعتی اور زرعی میدان میں ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے اور چینی کمیونسٹ پارٹی تمام چینی عوام کی قیادت کا دل ہے اور اس کے بغیر سوشلزم کا نصب العین کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔
ماؤزے تنگ نے مزید کہا کہ ہمیں تنظیم اور اراکین پر مکمل بھروسہ ہے ہر دو بنیادی اصول ہیں اگر ہم انہیں پسماندہ اور کمتر خیال کریں تو کچھ بھی حاصل کر نہ پائیں گے۔
ہمارے نصب العین کے پس پردہ جو طاقت موجود ہے وہ صرف اور صرف کمیونسٹ پارٹی ہے۔
ماؤزے تنگ ایک اور جگہ تحریر کرتا ہے کہ مارکس اور لینن کے فکر و نظریات سے لیس ہو کر چینی کمیونسٹ پارٹی نے چینی عوام کو کام کرنے کی ایک نئی راہ دکھائی۔ ایک ایسی راہ جس نے نظریے اور عمل کو آپس میں ملا کر دو مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرکے انہیں اپنا محاسبہ کرنے کی عادت ڈالی یعنی جس کے ذریعے یہ اپنا احتساب خود کر سکتے ہیں۔ ماؤزے تنگ کا خیال ہے کہ "ہماری پارٹی نے چینی انقلاب سے متعلق ایک عام طریقہ کار وضع کرنے کے علاوہ کام کرنے کے بعض منفرد اصول بھی متعین کئے ہیں لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے کئی کامریڈان خاص اور منفرد اصولوں کو تو یاد کرتے ہیں لیکن عام طریقہ کام کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جس کے بغیر ہم اپنے مقاصد کو بھلا دیں گے۔ اگر ہم عام طریقہ کار کو بھلا دیں گے تو ہم صحیح راہ متعین نہ کر پائیں گے۔
اور جب ہم خاص اور منفرد اصولوں پر گامزن ہو گے تو اپنا توازن کھو کر دائیں بائیں بھٹکتے رہیں گے جس سے ہمارے مقاصد حاصل نہ ہو پائیں گے۔

تحقیق اور مطالعہ :

ماؤزے تنگ ایک دوراندیش قائد تھا جس نے تحقیق اور مطالعے کے بارے میں کہا کہ عملی کام کرنے والے ہر شخص کو نچلی سطح پر حالات کی تحقیق کرنی چاہئے ایسی تحقیق ان لوگوں کے لئے

خاص طور پر لازم ہے جو نظریئے سے واقف ہوتے ہیں لیکن اصلی حالات نہیں جانتے ورنہ دوسری صورت میں وہ نظریئے کو عمل کے ساتھ منسلک نہ کر سکیں گے اگرچہ میرے دعوی "تحقیق کے بغیر کسی کو کچھ کہنے کا حق نہیں" پر تنگ نظر تجربیت کا لیبل چسپاں کر کے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن مجھے آج بھی اس دعوی پر کوئی افسوس نہیں بلکہ آج بھی اس بات پر قائم ہوں کہ تحقیق کے بغیر کسی کو تنقید کا حق نہیں۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب وہ کسی سرکاری عہدے پر فائز نہیں رہتے تو وہ کئی باتوں پر تنقید کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو سو فیصد ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ نامکمل تحقیق پر مبنی تنقید ایک مہمل اور نا سمجھ آنے والی بات ہے۔ اس قسم کے گمراہ سامراجی سفیروں کے ہاتھوں ہماری جماعت کو کئی بار نقصان اٹھانا پڑا ہے سٹالن نے درست کہا تھا کہ اگر نظریے کو انقلابی عمل کے ساتھ منسلک نہ کیا جائے تو وہ بے مقصد ہوتا ہے۔

سٹالن کا یہ فیصلہ بھی درست ہے کہ اگر راستہ انقلابی نظریے سے منور نہ ہو تو عمل اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے کہا کہ میرا مشورہ ہے کہ کسی تنگ نظر کا لیبل چسپاں نہ کیا جائے ماسوائے ایسے باعمل انسان کے جو دور رس نظر نہ رکھنے کی وجہ سے تاریکیوں میں ڈگمگاتا رہتا ہے۔

مزید کہا کہ ایک بنجر زمین چین کو ترقی یافتہ صنعتی چین میں ڈھالنے کے لئے ہماری پارٹی کے منصوبے ہیں جن پر عمل درآمد کے لئے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا چونکہ ہم تجربہ یافتہ نہیں ہیں۔ لہذا ہمیں ایک نئے کھلاڑی کی طرح ہر وقت سیکھنا چاہئے اور سیکھنے کے مراحل سے گزرتے رہنا چاہئے۔

وقت بدلتا رہتا ہے رواجات تبدیل ہو جاتے ہیں لہذا اپنے خیالات کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کے لئے مطالعے کی بے حد ضرورت ہے جو لوگ مارکس کے نظریات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اپنے پرولتاری دعوے پر یقین کامل کی طرح قائم ہیں۔

انہیں بھی مطالعے نئے حالات، اور نئے مسائل کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو کچھ ہمیں نہیں آتا ہم اسی سے سیکھ سکتے ہیں ہم پرانی دنیا کو اچھی طرح ختم نہیں کر سکتے البتہ ایک نئی دنیا کو خوبصورتی سے تعمیر کر سکتے ہیں ہمیں چاہئے کہ کام میں تجربہ کار لوگوں کے اقوال و افکار کا مطالعہ کریں اور بہت اور ہر عمل ہر اطوار جو اچھا ہو کو سیکھنے کے لئے مکمل طور پر سنجیدگی اختیار کریں۔

اگر ہم ایسا کریں تو پھر اسی صورت میں اپنے تجربے کو ایک نمایاں اور مکمل شکل دے کر اسے نظریے اور مقاصد کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے اگر ایسا کریں تو پھر جانبدار تجربہ ہم کبھی حقیقت کا نام دینے کی غلطی کا ارتکاب کبھی نہ کریں۔ اور نہ ہی اپنے کام میں غلطیاں کریں گے مطالعہ کرنا سیکھنے کے برابر ہے لیکن مطالعے کا اطلاق کرنا بھی سیکھنے کے برابر ہے اور یہ سیکھنا پہلا سیکھنے سے زیادہ اچھا ہے۔

ماؤزے تنگ کا خیال ہے کہ جن لوگوں کو اقتصادی امور انجام دینے آتے ہیں ہم ان سے

بھی سیکھ نا چا ئے خواہ وہ کسی طبقہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں ہمیں ان کا احترام بحیثیت استاد کرنا چاہئے اور جو م آ ، تو نہیں آتا اس کے متعلق یہ کبھی ظاہر نہ کریں کہ وہ آپ کو آتا ہے تساہل مطالعے کا دشمن ہے او ساہل سے نجات حاصل کئے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ماؤزے تنگ کا خیال ہے کہ اپنی طرف ہمارا یہ سیکھنے کی ناقابل تسلی خواہش اور دوسروں کی طرف سکھانے کا ان تھک جذبہ ہونا چاہئے

سوال: تضاد کے بارے میں ماؤزے تنگ کے نظریات بیان کریں 1998ء

تضاد کے بارے میں ماؤزے تنگ کے نظریات

Moa Theory on Contradiction

جواب: چین کے عظیم اور انقلابی رہنما چیئرمین ماؤزے تنگ نے "تضاد کے بارے میں" میں فکر انگیز مقالہ ینان کے جاپان دشمن فوجی اور سیاسی کالج میں لیکچروں کی صورت میں پڑھا تھا۔ اس سے قبل ماؤ کا مقالہ "عمل کے بارے میں" منظر عام پر آیا جس کا مقصد عقیدہ پرستی پر مبنی اس غلطی پر قابو پانا تھا جو اس وقت پارٹی کے اندر پائی جاتی تھی۔ ان کے مقالے "تضاد کے بارے میں" کا بھی کم وبیش یہی مقصد تھا کہ ان کے بعض پیروکاروں میں پائی جانے والی عقیدہ پرستانہ سوچ کی غلطی کا مداوا کیا جا سکے۔

ماؤزے تنگ کے نزدیک اشیاء میں تضاد کا قانون یعنی وحدت اضداد کا قانون ہی مادی جدلیات کا بنیادی قانون ہے۔ ماؤ کہتے ہیں کہ لینن نے کہا تھا "جدلیات دراصل اس تضاد کا مطالعہ ہے جو خود اشیاء کی ماہیت میں پایا جاتا ہے" ان کے نزدیک تضاد کا یہ قانون ہی اصل میں جدلیات کی روح ہے اور اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے ماؤ نے لینن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ تضاد کا یہ قانون ہی جدلیات کی ماہیت بلکہ جدلیات کا مغز ہے۔

ماؤزے تنگ تضاد کے مختلف چھ قسم کے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ اور ہم عصر واقعات سے ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ قاری کی اس فلسفیانہ اور مشکل بحث میں دلچسپی نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ماؤزے تنگ کے نزدیک تضاد کے مختلف پہلو درج ذیل ہیں:

1- دو کائناتی تصورات (The Two World Outlooks)

2- تضاد کی ہمہ گیریت (The Universality of Contradiction)

3- تضاد کی تخصیص (The Particularity of Contradiction)

4- اصل تضاد اور تضاد کا اصل پہلو

(The Principal Contradiction and the Principal Aspect of Contradiction)

5- تضاد کے مختلف پہلوؤں کی یکسانیت اور کشیدگی

(The Identity and Struggle of the Aspect of a Condradiction)

6- تضاد میں تخالف کی جگہ

(The Place of Antagonism in Contradiction)

اب ہم ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں کہ ماؤزے تنگ نے تضاد کے ان پہلوؤں کی کس انداز میں وضاحت کی ہے:

1- دو کائناتی تصورات (The Two World Outlooks)

ماؤزے تنگ کے نزدیک کائنات کی نشوونما کے قانون کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک تصور مابعد الطبیعاتی اور دوسرا جدلیاتی تصور ہے۔ مابعد الطبیعاتی تصور کے مطابق کائنات کی نشوونما کمی بیشی یعنی بطور تکرار ہوتی ہے اور دوسرے تصور کے مطابق کائنات کی نشوونما بطور وحدت اضداد (As a Unity of Opposites) ہوتی ہے۔

ماؤ کہتے ہیں کہ چین میں مابعد الطبیعات کو "شیوان شیوائے" (Hsuan- Hsueh) کہتے ہیں۔ خواہ چین ہو یا یورپ تاریخ میں ایک خاص عرصے تک یہ انداز فکر، (مابعد الطبیعاتی تصور) جو تصوریت پسند کائناتی تصور کا ایک لازمی جزو ہے، انسانی فکر میں غالب رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یورپ میں بورژوا طبقے کی مادیت بھی اپنے ابتدائی دور میں مابعد الطبیعاتی ہی رہی ہے۔

مابعد الطبیعاتی کا کائناتی تصور اشیاء کو الگ تھلگ، ساکن اور یک طرفہ خیال کرتا ہے۔ یہ کائنات کی تمام اشیاء، ان کی انواع کو اور ان کی ماہیت کو ازلی طور پر ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور ناقابل تغیر سمجھتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق اگر اشیاء میں کوئی تبدیلی ہوتی بھی ہے تو وہ مقدار میں کمی بیشی یا پھر مقام کی تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ مقدار میں کمی بیشی یا مقام کی تبدیلی کی وجہ اشیاء کے اندر نہیں بلکہ ان کے باہر پائی جاتی ہے۔ یعنی قوت محرکہ بیرونی ہوتی ہے اندرونی نہیں۔

کوئی شے خود کو اپنی ہی قسم کی شے میں دہراتی ہے

مابعد الطبیعاتی تصور کے علمبرداروں کا استدلال ہے کہ کوئی شے اپنے آپ کو صرف اپنی ہی قسم کی شے میں دہرا سکتی ہے مگر کسی مختلف قسم کی شے میں تبدیل نہیں کر سکتی وہ معاشرتی ارتقا کے اسباب کو سماج کے خارجی عناصر مثلاً جغرافیائی حالات اور آب و ہوا سے منسوب کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ استحصال سرمایہ دارانہ مقابلہ اور سرمایہ دارانہ سماج کا انفرادیت پسند نظریہ وغیرہ ابتدائی سماج میں بھی پائے جاسکتے ہیں اور ایسے عناصر ہمیشہ بغیر کسی تبدیلی کے برقرار رہیں گے۔ اس طرح وہ کسی شے کی نشوونما کے اسباب کو اس کے باہر تلاش کرتے ہیں جبکہ مادی جدلیات کے اس نظریے سے انکار کرتے ہیں جس کے مطابق کسی بھی شے کی نشوونما میں اس کے اندر پائے جانے والے تضادات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔

مابعد الطبیعاتی تصور کی تاریخ

ماؤ کے مطابق یہ تصور یورپ میں 17 ویں اور 18 ویں صدی میں میکانکی مادیت کی صورت میں

جبکہ 19 ویں صدی کے آخر اور 20 ویں صدی کے شروع میں عامیانہ ارتقائیت کی صورت میں موجود رہا ہے۔ میکانکی مادیت اور عامیانہ ارتقائیت بورژوا طبقہ کرتا ہے جو گزشتہ سو سال کے دوران یورپ سے درآمد کی گئی ہیں۔ ماؤزے تنگ کے مطابق مابعد الطبیعاتی تصور چین میں بھی موجود تھا۔ جس کی وضاحت اس کہاوت سے ہوتی ہے "جس طرح آسمان نہیں بدلتا، اسی طرح تاؤ بھی نہیں بدلتا۔"

خارجی اسباب صرف میکانکی حرکت پیدا کرتے ہیں

مابعد الطبیعاتی تصور صرف میکانکی مادیت اور عامیانہ ارتقائیت ہی پیش کرتا ہے اور میکانکی مادیت خالص خارجی اسباب کی بناء پر ہوتی ہے اور خارجی اسباب صرف میکانکی حرکت پیدا کر سکتے ہیں۔ یعنی کسی شے کی پیمائش یا مقدار میں ہی تبدیلیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے اس امر کی وضاحت نہیں ہوتی کہ اشیاء کیفیت کے اعتبار سے مختلف کیوں ہوتی ہیں اور ایک شے دوسری شے میں کیوں بدل جاتی ہے۔

جدلیاتی تصور (Dialectical Conception)

مادی جدلیات کا کائناتی تصور مابعد الطبیعاتی تصور کے بالکل برعکس ہے۔ اس تصور کے مطابق کسی شے کی نشوونما کا بنیادی سبب خارجی نہیں بلکہ اندرونی ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں کسی شے کی نشوونما کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ اندر سے اور دوسری اشیاء کے ساتھ اس کے تعلقات سے کرنا چاہیے۔ ماؤ کے نزدیک کسی شے کی نشوونما کا اندرونی سبب اس شے کے اندر پائے جانے والے تضاد میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ یعنی ہر شے میں اندرونی تضاد پایا جاتا ہے جو اس کی حرکت اور نشوونما کا سبب بنتا ہے۔ شے کا اندر کا تضاد ہی اس کی نشوونما کا بنیادی سبب ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ اس کے تعلقات کی حیثیت ثانوی اسباب کی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ دونوں مل کر کسی شے کی نشوونما کا سبب بنتے ہیں۔

سماجی ارتقاء اور جدلیاتی تصور نشوونما

جس طرح کوئی بھی شے اپنے اندر پائے جانے والے تضاد کی وجہ سے نشوونما پاتی ہے اسی طرح سماج کا ارتقاء بھی زیادہ تر خارجی نہیں بلکہ اندرونی یا داخلی اسباب کی پیداوار ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے کئی ممالک ہیں جن کے جغرافیائی اور موسمی حالات تو کم و بیش ایک جیسے ہیں لیکن ان کی ترقی میں بہت زیادہ عدم مشابہت پائی جاتی ہے۔ مزید برآں کسی ملک کے موسمی اور جغرافیائی میں تبدیلی ہوئے بغیر اس میں بہت بڑے پیمانے پر سماجی تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہر خطے کے جغرافیائی اور موسمی حالات تو بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ بدلاؤ سماجی تبدیلیوں کے مقابلے میں غیر اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ جغرافیائی اور موسمی تبدیلیاں تو کہیں لاکھوں ہزاروں سالوں میں جا کر رونما ہوتی ہیں جبکہ سماجی تبدیلیاں تو ہزاروں، سینکڑوں یا چالیس پچاس سالوں میں اور انقلاب کے دنوں میں چند سالوں یا مہینوں میں رونما ہو سکتی ہیں۔ اور ایک بات یہ بھی کہ انقلاب سے سماجی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں مگر موسمی تبدیلیاں اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتیں۔

سماجی ترقی اور تضادات

مادی جدلیات کے مطابق فطرت میں تبدیلیاں زیادہ تر فطرت کے داخلی تضادات کی نشوونما کی بنا پر ہوتی ہیں۔ اسی طرح سماجی تبدیلیاں بھی زیادہ تر سماج کے تضادات کی نشوونما کی وجہ سے ہی ہوتی ہیں۔ یعنی پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کے درمیان تضاد، سماج میں پائے جانے والے طبقات میں تضادات، قدیم اور جدید کے درمیان تضاد، یہاں تضادات کی نشوونما ہی ہے۔ جو سماج کو آگے بڑھاتی ہے اور نئے سورج کے ہاتھوں پرانے سماج کے خاتمہ کے لیے قوت مہیا کرتی ہے۔

کیا مادی جدلیات خارجی اسباب کو نظرانداز کر دیتی ہے

رہا یہ سوال کہ نشوونما کے عمل پر غور کرتے ہوئے مادی جدلیاتی تصور خارجی اسباب کو نظرانداز کر دیتا ہے نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جدلیاتی تصور کی رو سے خارجی اسباب تبدیلی کی شرط ہوتے ہیں اور داخلی اسباب تبدیلی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تبدیلی خارجی اسباب کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ خارجی اسباب داخلی اسباب کے ذریعے زیر عمل آتے ہیں۔ دونوں اسباب کی بنیاد سمجھانے کے لیے ماؤزے تنگ خوبصورت مثال پیش کی ہے کہ خاص درجہ حرارت پر انڈا چوزے میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن کوئی بھی درجہ حرارت پتھر کو چوزے میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس مثال سے واضح ہوا کہ درجہ حرارت محض خارجی سبب ہے جبکہ چوزے میں تبدیل ہونے کا داخلی وصف صرف انڈے میں ہے پتھر میں نہیں۔

جدلیاتی کائناتی تصور کی تاریخ

ماؤزے تنگ کے مطابق جدلیاتی کائناتی تصور قدیم چین میں بھی موجود تھا۔ لیکن قدیم جدلیات کسی حد تک سیدھی سادی تھی اس لیے وہ زمانے کے سماجی اور تاریخی حالات میں کسی طرح کی نظری تشکیل کرنے کے قابل نہیں ہوتی تھی کہ اس کی جگہ مابعدالطبیعاتی تصور نے لے لی جرمن فلاسفر ہیگل نے جدلیات میں نہایت اہم اضافے کیے مگر اس کی جدلیات تصوریت پسندانہ تھی۔

بعدازاں فریڈرک اینگلز اور کارل مارکس نے ہیگل کی جدلیات کے معقول عناصر کو تنقیدی طور پر جذب کر کے جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کا عظیم الشان نظریہ پیش کیا۔ اس کے بعد اس نظریے کو ترقی دینے میں لینن اور اسٹالن نے اہم کردار ادا کیا اور جب یہ نظریہ چین میں پہنچا تو اس نے چین کی فکری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

جدلیاتی کائناتی تصور ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کس طرح مختلف اشیاء میں اضداد کی حرکت کا مشاہدہ کریں، تضادات کو حل کرنے کے طریقوں کی نشاندہی کی جائے۔

2- تضاد کی ہمہ گیریت (Universality of Contradiction)

ماؤزے تنگ کا نظریہ ہے کہ مادی جدلیاتی کائناتی تصور کی دریافت کے ساتھ تضاد کی ہمہ گیریت کی

اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ماؤ کے مطابق تضاد کی ہمہ گیریت دوسرا مفہوم رکھتی ہے۔ ایک یہ کہ تمام اشیاء کی نشوونما کے دوران تضاد موجود رہتا ہے اور دوسرا یہ کہ اشیاء کی نشوونما کے دوران اضداد (Opposites) کی حرکت اول تا آخر موجود رہتی ہے۔

اینگلز اور تضاد کی ہمہ گیریت

اینگلز کے خیال میں اگر سادہ میکانکی تبدیلی تضاد کی حامل ہوتی ہے تو یہ مادے کی حرکت کی اعلیٰ زندگی اور اس کی نشوونما میں اور بھی زیادہ زوردار اور نمایاں ہوتی ہے۔ لہٰذا زندگی بھی ایک ایسا تضاد ہے جو خود اشیاء اور اعمال کے اندر موجود ہوتا ہے اور جو مسلسل خود کو پیدا کرتا اور تحلیل کرتا رہتا ہے اور جب یہ تضاد ختم ہو جاتا ہے تو زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

لینن اور تضاد کی ہمہ گیریت

تضاد کی ہمہ گیریت کے تناظر میں دیکھا جائے تو فکر کے میدان میں بھی ہم تضادات سے بچ نہیں سکتے۔ اعلیٰ درجے کے ریاضی کے بنیادی اصولوں میں سے ایک تضاد ہے اور کم درجے کی ریاضی بھی تضادات سے بھری پڑی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے لینن کی تضاد کی ہمہ گیریت کی وضاحت معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

1- ریاضی میں تفریق اور سالم یعنی + اور - تضادات کو ظاہر کرتے ہیں۔
2- میکانیات میں عمل اور ردعمل تضاد کا مظہر ہیں۔
3- طبیعات میں مثبت اور منفی برق تضاد کا آئینہ ہیں۔
4- کیمیا میں ایٹموں کا امتزاج اور انتشار تضاد کی گواہی دیتے ہیں۔
5- معاشرتی علوم میں طبقاتی جدوجہد کی صورت میں تضادات کا سلسلہ سامنے آتا ہے۔

اس کے علاوہ جنگ میں فتح اور شکست، پیش قدمی اور پسپائی اور حملہ اور دفاع کرنا باہم متضاد عناصر ہیں جو جنگ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پارٹی کے اندر تضادات

پارٹی کے اندر مختلف قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ ان خیالات کے درمیان لگاتار کشمکش اور مخالفت معرض وجود میں آتی رہتی ہے۔ یہ بات پارٹی کے اندر ان تضادات کی عکاسی کرتی ہے جو سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان اور قدیم اور جدید کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ ان تضادات کی پارٹی کے وجود کے لیے اہمیت اس لحاظ سے اجاگر ہوتی ہے کہ ان تضادات کے حل کے لیے نظریاتی جدوجہد کرنا پڑتی ہے جس سے پارٹی کا وجود زندہ رہتا ہے اور اگر یہ تضادات موجود نہ ہوں تو اس طرح کی کسی نظریاتی جدوجہد کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی اور ایسا ہونے کی صورت میں، یعنی جب نظریاتی جدوجہد نہ کی جائے، تو پارٹی کی زندگی ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

تمام اعمال میں تضاد کی موجودگی

تضاد ہمہ گیر طور پر تمام اعمال میں موجود ہوتا ہے۔ خواہ حرکت کی سادہ شکلیں ہوں یا پیچیدہ شکلیں، ہر دور میں تضاد موجود ہوتا ہے۔ تضاد معروضی مظاہر میں ہو یا نظریاتی مظاہر میں موجود ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ تضاد ہر عمل کے ابتدائی مرحلے پر بھی موجود ہوتا ہے۔ تضاد کے ابتدائی مرحلے پر موجود ہونے کی مثال ماؤ نے سوویت یونین میں مزدوروں اور سرمایہ داروں اور مزدوروں اور کسانوں کے درمیان پائے جانے والے تضاد سے پیش کی ہے۔

تضادات کا تسلسل

ماؤ کہتے ہیں پرانی وحدت اور اس کی ترکیبی اضداد نئی وحدت اور اس کی ترکیبی اضداد کے لیے جگہ خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اس طرح پرانے عمل کی جگہ نیا عمل شروع ہو جاتا ہے جس کے اپنے نئے تضادات ہوتے ہیں اور یہ نیا عمل تضادات کی نشوونما کے لیے خود اپنے عمل کا آغاز کر دیتا ہے۔ نئے اور پرانے عمل کا یہ طریقہ عام اشیاء سے لے کر سماجی عمل تک ہر چیز میں موجود رہتا ہے۔ اور یہی عمل مختلف اشیاء کی نشوونما کا سبب ہے۔ ماؤ کہتے ہیں کہ چینی اشتراکیوں کو جدلیات کی تشریح کا یہ طریقہ سیکھ لینا چاہیے۔ کیونکہ یہی وہ اہم ذریعہ ہے۔ ماؤ کہتے ہیں کہ چینی اشتراکیوں کو جدلیات کی تشریح کا یہ طریقہ سیکھ لینا چاہیے۔ کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر چینی انقلاب کے موجودہ حالات، اس کی تاریخ، اور اس کے مستقبل کا درست طور پر تجزیہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

3۔ تضاد کی تخصیص (Particularity of Contradiction)

ماؤ کے نزدیک تضاد کی نوعیت کسی چیز کی نشوونما کے ہر مرحلہ میں مختلف ہوتی ہے یعنی ہر مرحلے میں ایک خاص قسم کا تضاد پایا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی شے کی نشوونما میں اضداد کا حرکت کا پورا عمل، ان کے باہمی تعلقات اور ہر ایک پہلو کے لحاظ سے خاص خصوصیت کا حامل ہوتا ہے جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

حرکت کی ہر شکل کا مخصوص تضاد

ماؤ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حرکت کی ہر شکل اپنے اندر اپنا مخصوص تضاد رکھتی ہے۔ یہ مخصوص تضاد ایک مخصوص شکل کی تشکیل کرتا ہے جو ایک شے کو دوسری سے مختلف بنا دیتی ہے۔ دنیا کی اشیاء میں بے پناہ تنوع پایا جاتا ہے اور یہی تضاد اس تنوع کا بنیادی سبب ہے۔ مثال کے طور پر فطرت میں حرکت کی بے شمار شکلیں ہیں جن میں میکانکی حرکت، آواز، روشنی، حرارت، بجلی، امتزاج اور انتشار وغیرہ شامل ہیں۔ ماہیت کے اعتبار سے ان میں سے ہر شکل دوسری شکل سے مختلف ہے لیکن یہ سب ایک دوسری پر انحصار ضرور کرتی ہیں۔ لہٰذا مادے کی ہر شکل کی مخصوص ماہیت کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اس کے مخصوص تضاد کا پتہ لگانا پڑتا ہے۔

یہ بات سماجی اور نظریاتی مظاہر کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ فطرت کے لیے۔ کیونکہ سماج کی ہر شکل بھی اپنے مخصوص تضاد اور اپنی مخصوص ماہیت کی حامل ہوتی ہے۔

نشو ونما کا ہر عمل کیفیت کے اعتبار سے مختلف

اشیاء کی نشو ونما میں مختلف تضادات کیفیت کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ تضادات کیفیت کے اعتبار سے مختلف طریقوں کے ذریعے ہی حل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ماؤ مندرجہ ذیل مثال پیش کرتے ہیں کہ پرولتاریہ اور بورژوا طبقے کے درمیان تضاد سوشلسٹ انقلاب کے طریقے سے حل کیا جاتا ہے۔ عوام اور جاگیروارانہ نظام کے درمیان پایا جانے والا تضاد حل کے لیے جمہوری انقلاب کے طریق کار کا تقاضا کرتا ہے۔ نو آبادیات اور سامراج کے درمیان تضاد کے حل کا بہترین طریقہ انقلابی جنگ کا طریقہ ہے۔ اسی طرح سوشلسٹ سماج میں مزدور طبقے اور کسانوں کے درمیان تضاد زراعت کو اجتماعی اور مشینی بنانے کے طریقے سے حل کیا جاسکتا ہے۔ ماؤ مزید کہتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی کے اندر موجود تضاد کو تنقید کے طریقے سے حل کیا جاسکتا ہے اور پیداواری قوتوں کو ترقی دے کر سماج اور فطرت کے درمیان پائے جانے والے تضاد کو حل کیا جاسکتا ہے۔

تضاد کے تمام پہلوؤں کی تخصیصی اہمیت

کسی شے کی نشو ونما کے کسی عمل میں تضادات کی تخصیص ظاہر کرنے کے لیے اس عمل میں موجود تضادات کے تمام پہلوؤں کی تخصیص ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بصورت دیگر اس عمل کی ماہیت دریافت کرنا ناممکن ہوگا۔ مثال کے طور پر ہر بڑی شے کی نشو ونما کے عمل میں کوئی ایک نہیں بلکہ بہت سے تضادات کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً چین میں بورژوا، جمہوری انقلاب کے دوران، جس کے حالات نہایت پیچیدہ تھے، چینی سماج کے تمام کے تمام مظلوم طبقوں اور سامراج کے درمیان، عوام اور جاگیردارانہ نظام کے درمیان، پرولتاریہ اور بورژوا طبقے کے درمیان اور مختلف رجعت پسند حکمران گروہوں کے درمیان تضاد موجود ہے۔ یہ تضادات چونکہ مختلف طبقات کے درمیان ہیں، ہر طبقے کے مفادات اور مقاصد مختلف ہیں، اس لیے ان تضادات کے بارے میں ایک ہی رویہ اختیار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہر ایک تضاد دوسرے سے مختلف ہے اور اسی طرح ان کی تخصیص موجود ہے۔

تضاد کی تخصیص کے مطالعہ کے لیے ٹھوس تجزیہ

کسی بھی قسم کے تضاد کی تخصیص کا مطالعہ کرتے ہوئے، مادے کی ہر شکل کے اندر تضاد، اس کی نشو ونما کے ہر عمل میں تضاد، ہر عمل میں تضاد کے پہلوؤں کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں موضوعیت پسند نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا ٹھوس طریقے سے تجزیہ کرنا چاہیے کیونکہ ٹھوس تجزیے کے بغیر کسی تضاد کی تخصیص کا علم نہیں ہوسکتا۔

4- اصل تضاد اور تضاد کا اصل پہلو

(The Principle Contradiction and Principle Aspect of a Condradiction)

ماؤ کے نزدیک اگر کسی عمل میں متعدد تضادات موجود ہوں تو ان میں سے ایک اصل تضاد ہوتا ہے اور

باقی تضادات کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔

اصل تضاد

ماؤ کا کہنا ہے کہ تضادات میں سے اصل تضاد ہی رہنما اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ لہٰذا جس چیز میں دو یا اس سے زیادہ تضادات ہوں ان سب سے ہمیں ہر حال میں تضاد کو تلاش کرنا چاہیے اور جب یہ اصل تضاد ہاتھ لگ جاتا ہے تو پھر تمام مسائل حل کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ اصل تضاد کو گرفت میں لیے بغیر مسائل کے حل کی کوشش اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہوتا ہے۔

ماؤزے تنگ اس ضمن میں سرمایہ دارانہ سماج کی مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سماج میں دو تضادی قوتیں، پرولتاریہ اور بورژوا طبقہ، اصل تضاد کی تشکیل کرتی ہیں۔ جبکہ دیگر تضادات جن میں باقی ماندہ جاگیردار طبقے اور بورژوا طبقے کے درمیان تضاد، کسان ادنیٰ بورژوا طبقے اور بورژوا طبقے میں تضاد، غیر اجارہ دار سرمایہ دار اور اجارہ دار سرمایہ داروں میں تضاد شامل ہیں، سب کے سب اصل تضاد سے متعین یا متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ سماج میں پائے جانے والے مسائل کے حل کے لیے پرولتاریہ اور بورژوا طبقوں کے درمیان پائے جانے والے اصل تضاد کو گرفت میں لینا ضروری ہوتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اصل پہلو وہ ہوتا ہے جو تضاد میں رہنما کردار ادا کرتا ہے۔ کسی شے کی نوعیت کا تعین زیر نظر تضاد کے اصل پہلو سے ہوتا ہے۔ جو کہ غالب حیثیت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔

2۔ تضاد کے اصل اور غیر اصل پہلو کی تبدیلی

تضاد کے پہلوؤں کی حیثیت جامد نہیں رہتی بلکہ بدلتی رہتی ہے۔ یعنی تضاد کے اصل اور غیر اصل پہلو ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور اسی تبدیلی کے مطابق شے کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ اگر کسی تضاد کی نشوونما کے کسی خاص مرحلے میں اگر الف اصل پہلو ہے اور ب غیر اصل پہلو تو کسی دوسرے مرحلے میں وہ ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں، مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ سماج میں سرمایہ داری نے پرانے جاگیردارانہ عہد کی ماتحت قوت کی حیثیت تبدیل کر کے غالب قوت کی حیثیت حاصل کر لی ہے اور اسی کے مطابق سماج کی نوعیت بھی جاگیردارانہ سے تبدیل ہو کر سرمایہ دارانہ ہو گئی ہے اور نئے سرمایہ دارانہ دور میں جاگیردارانہ قوتیں اپنی سابقہ غالب حیثیت سے تبدیل ہو کر ذیلی حیثیت میں آ گئی ہیں اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور مثال چین کی لے لیجیے۔ جس تضاد نے چین کو نیم نو آبادی کی سطح پر پہنچا دیا ہے، اس میں سامراج کو اصل حیثیت حاصل ہے وہ چینی عوام پر ظلم کرتا ہے اور چین ایک آزاد ملک سے ایک نیم نو آبادی ملک میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ صورت حال ضرور بدل جائے گی۔ دونوں فریقوں کی کشمکش میں چینی عوام کی طاقت جو پرولتاریہ کی قیادت میں بڑھتی جا رہی ہے چین کو لازمی طور پر دوبارہ ایک نیم نو آبادی ملک سے آزاد ملک میں تبدیل کر دے گی۔ اس طرح سامراج کا تختہ الٹ جائے گا اور پرانا چین ایک نئے چین میں

تبدیل ہو جائے گا۔

کمیونسٹوں کے لیے راہ عمل

تضادات میں عدم توازن کی مختلف حالتوں، اصل اور غیر اصل تضادات اور تضاد کے اصل پہلوؤں کا مطالعہ ایک ایسا ناگزیر طریقہ ہے جس کے ذریعے جس کے ذریعے ایک انقلابی سیاسی پارٹی اپنے مختلف امور کے بارے میں حکمت عملی اور تدابیر کی پالیسیوں کا درست طور پر تعین کرتی ہے۔ یہی طریقہ تمام کمیونسٹوں کے لیے راہ عمل ہے اور انہیں آگے بڑھنے، اپنے اختلافات ختم کرنے اور صحیح راہ کا تعین کرنے کے لیے اسی پر عمل پیرا ہونا چاہیے کیونکہ اس پر عمل کر کے ہی وہ انقلابی کوششوں کی صحیح روح کو سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں

5- تضاد کے مختلف پہلوؤں کی یکسانیت اور کشمکش

(The Identity and Struggle of the Aspects of a Contradiction)

ماؤ کہتے ہیں کہ تضاد کی ہمہ گیریت اور تخصیص کو سمجھنے کے بعد اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے کہ تضاد کے مختلف پہلوؤں کی یکسانیت اور کشمکش کا مطالعہ کیا جائے۔ وہ یکسانیت اور وحدت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی شے کی نشوونما کے عمل میں تضاد کے دونوں پہلوؤں میں سے ہر ایک پہلو کا وجود دوسرے پہلو کے وجود کی دلالت کرتا ہے اور دونوں پہلو ایک وجود میں، ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں اور ساتھ ہی مخصوص حالات میں دونوں متضاد پہلوؤں میں سے ہر ایک پہلو خود کو اپنی ضد میں تبدیل کر لیتا ہے۔

لینن نے بھی ان کے بارے میں ایسی ہی بات کی ہے جب وہ کہتا ہے "جدلیات ایک تعلیم ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اضداد کس طرح یکساں ہو سکتے ہیں اور کن شرائط کے تحت وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے میں تبدیل کرتے ہیں اور یکساں ہو جاتے ہیں۔ اور انسانی ذہن کس وجہ سے ان اضداد کو مردہ اور منجمد نہیں بلکہ زندہ اور اپنے آپ کو ایک دوسرے میں تبدیل کرنے والا سمجھتا ہے۔"

اسی طرح ہر عمل کے متضاد پہلو ایک دوسرے سے کشمکش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ یہ متضاد پہلو تمام انسانی سوچ میں بھی موجود ہوتے ہیں مگر ان کی مدت مختلف ہوتی ہے۔ کسی سادہ عمل میں اضداد کا صرف ایک ہی جوڑا ہوتا ہے جب کہ کسی پیچیدہ عمل میں ایک سے زیادہ جوڑے ہوتے ہیں

تضاد کے پہلوؤں میں پائی جانے والی یکسانیت کو ایک اور انتہائی آسان اور عام فہم مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ کوئی متضاد پہلو اپنا الگ تھلگ وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس کی تکمیل اور صحیح ادراک کے لیے اس کے متضاد کا معبود ہونا ضروری ہوتا ہے جیسے کیا زندگی کے ساتھ موت کا تصور نہ کیا جائے تو زندگی اپنا آزاد وجود قائم رکھ سکتی ہے کیونکہ زندگی کے بغیر موت نہیں، موت کے بغیر زندگی نہیں، بلندی کے بغیر پستی نہیں، پستی کے بغیر بلندی نہیں، خوشی کے بغیر غم نہیں، غم کے بغیر خوشی نہیں۔ خوش قسمتی کے بغیر بدقسمتی نہیں، بدقسمتی کے بغیر خوش قسمتی نہیں۔ اندھیرے کے بغیر اجالا نہیں، اجالے کے بغیر اندھیرا نہیں، جز کے

جیر کے بغیر آجر نہیں، مزارع کے بغیر زمین دار نہیں، زمین دار کے بغیر مزارع نہیں، بورژوا طبقہ یہ نہیں، پرولتاریہ کے بغیر بورژوا طبقہ نہیں۔ مزدور کے بغیر سرمایہ دار نہیں، سرمایہ دار نہیں تو مزدور کے بغیر دشواری نہیں اور دشواری کے بغیر سہولت نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمام اضداد کی یکی ہے۔ مخصوص حالات میں تو ہر متضاد پہلو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں جبکہ دوسری طرف باہم ہم متعلق ہوتے ہیں اور ان میں پایا جانے والا یہی کردار یکسانیت کہلاتا ہے۔

و کہتے ہیں کہ بات تضاد کے مختلف پہلوؤں کے ایک دوسرے پر انحصار پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ حالات میں کسی شے کے اندر موجود پہلوؤں میں سے ہر ایک پہلو خود کو اپنی ضد میں تبدیل بھی کر لیتا کی یکسانیت کا ہی ایک مفہوم ہے۔ مثال کے طور پر پرولتاریہ طبقہ جو ایک زمانے میں محکوم ہوتا ہے پرولتاریہ کے ساتھ کشمکش کے نتیجے میں) کے ذریعے حکمران میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بورژوا طبقہ ہوتا ہے محکوم بن جاتا ہے یعنی اپنی حیثیت کو اس حیثیت میں بدل دیتا ہے جو ابتداء میں اسی کی ضد کو س سے ثابت ہوا کہ تمام متضاد اشیاء باہم متعلق ہوتی ہیں۔ نہ صرف مخصوص حالات میں وہ ایک ہی ساتھ موجود ہوتی ہیں بلکہ دوسرے کے مخصوص حالات میں وہ اپنے آپ کو دوسرے میں تبدیل بھی کر دیتی ہیں۔

6- تضاد میں مخاصمت کی حیثیت

(The Place of Antagonism in Contradiction)

کشمکش اور مخاصمت میں بھی ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے۔ اضداد میں موجود کشمکش ہی ایک خاص پہنچ کر مخاصمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ طبقات کے درمیان مخاصمت، اضداد کی کشمکش کے ایک ار کی حیثیت سے موجود رہتی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں استحصالی اور زیر استحصالی طبقے کے ئے جانے والے تضاد پر غور کرنا ہوگا۔ ایسے متضاد طبقات ایک ہی سماج میں طویل عرصے تک ایک رہتے ہیں۔ ایسے طبقات خواہ غلامانہ سماج میں ہوں، جاگیردارانہ سماج میں یا پھر سرمایہ دارانہ سماج دوسرے کے ساتھ کشمکش میں رہتے ہیں تاہم دونوں طبقوں کے درمیان تضاد اسی وقت کھلی مخاصمت ہے۔ یہاں تک کہ انقلاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جب یہ ترقی کر کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ جاتا رحلے پر پہنچ کر تضاد محض کشمکش ہی نہیں رہتا بلکہ مخاصمت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

کشمکش کی مختلف شکلیں

تضاد اور کشمکش ہمہ گیر اور مطلق ہوتے ہیں لیکن تضادات کو حل کرنے کے طریقے یعنی کشمکش کی شکلیں یت میں اختلافات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ کچھ تضادات کا خاصہ کھلی مخاصمت ہوتا ہے مگر کچھ وتے۔ اشیاء کی ٹھوس نشوونما کے مطابق کچھ تضادات جو ابتداء میں غیر مخاصمانہ ہوتے ہیں آہستہ آہستہ

مخاصمانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں اور کچھ تضادات ابتداء میں مخاصمانہ ہوتے ہیں مگر آہستہ آہستہ مخاصمانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

ماؤ تضاد کی مخاصمت واضح کرنے کے لیے چینی کیمونسٹ پارٹی اور سوویت کیمونسٹ پارٹی کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "سوویت یونین کیمونسٹ پارٹی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ لینن اور سٹالن کی صحیح فکر اور ٹرانسکی اور نجارن کی لغو فکر کے درمیان تضادات شروع میں مخاصمانہ صورت میں ظاہر نہیں ہوئے تھے لیکن بعد میں وہ مخاصمانہ صورت اختیار کر گئے۔ اسی طرح چینی کیمونسٹ پارٹی کی تاریخ میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں۔ جیسا کہ ابتداء میں ہماری پارٹی کے بہت سے کامریڈوں کی صحیح فکر اور چھن تو شیو اور چانگ کو تھاؤ کی لغو فکر کے درمیان تضادات بھی مخاصمانہ صورت میں ظاہر نہیں ہوئے تھے لیکن بعد میں یہ تضادات مخاصمانہ صورت اختیار کر گئے۔

ماؤ اس نکتے کی بحث سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ لینن نے کہا تھا "مخاصمت اور تضاد قطعی طور پر ایک ہی اور ایک جیسے نہیں ہیں۔ سوشلزم کے تحت مخاصمت ختم ہو جائے گی مگر تضاد موجود رہے گا" اس کا مطلب یہ ہے کہ مخاصمت اضداد کی کشمکش کی ایک شکل تو ہے لیکن اس کی واحد شکل نہیں ہے۔

ماؤ کہتے ہیں کہ اضداد کی کشمکش کبھی ختم نہیں ہوتی، یہ اس وقت بھی موجود رہتی ہے جب اضداد ایک ساتھ رہتے ہیں اور اس وقت بھی جاری رہتی ہے جب تضادات ایک دوسرے میں تبدیل ہو رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ جب اضداد ایک دوسرے میں تبدیل ہو رہے ہوتے ہیں تو کشمکش خاص طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ ہمیں یہاں ایک بات سے چوکنا کرتے ہیں کہ تضاد میں اضداد کی کشمکش کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں کشمکش کی مختلف شکلوں کے درمیان امتیاز کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے ورنہ ہم انہیں سمجھنے اور ان کا اطلاق کرنے میں غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

☆---☆---☆

سوال: خروشیف کا نظریہ امن سے جیو اور جینے دو بیان کریں کیا یہ کارل مارکس کی تعلیمات کے مطابق تھا۔ 2002ء

نکیتا خروشیف کا نظریہ پرامن بقائے باہمی

جواب: پرامن بقائے باہمی کا نظریہ سرد جنگ کے دوران کمیونسٹ ممالک کے درمیان شروع ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سرمایہ دارانہ ریاستوں کے ساتھ پرامن طریقے سے مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ یہ ان نظریات کا ردعمل تھا جن کا خیال تھا کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت اکٹھے قائم نہیں رہ سکتے۔ مگر اس وقت کی دو اہم کمیونسٹ ریاستوں، یو ایس ایس آر اور عوامی جمہوریہ چین نے اس نظریے کی اپنے اپنے انداز میں تشریح کی۔

سوویت یونین نے اس کا اطلاق صنعتی دنیا بالخصوص ریاست ہائے متحدہ امریکہ، نیٹو ممالک اور وارسا پیکٹ کی اقوام کے درمیان تعلقات پر کیا۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں عوامی جمہوریہ چین نے اس کا اطلاق چین اور ترقی پذیر دنیا کے ایسے ممالک کے درمیان تعلقات پر کیا جو اشتراکی نہیں تھے ساتھ ہی چین نے یہ موقف بھی اختیار کیا کہ استعماری ممالک کے ساتھ جارحانہ رویہ ہی برقرار رکھا جائے گا۔ تاہم 1980ء کی دہائی میں چین نے پرامن بقائے باہمی کے نظریے کا دائرہ کار بڑھا کر تمام ممالک تک کر دیا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ کوئی بھی ملک خواہ وہ اشتراکی ہو یا غیر اشتراکی یا پھر استعماری نظام والا اس کے ساتھ پرامن طریقے سے تعلقات استوار کیے جا سکتے ہیں۔

اس سے قبل 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں چین اور سوویت یونین کے درمیان کشیدگی کا ایک سبب نظریہ پرامن بقائے باہمی کی الگ الگ (اپنے اپنے نقطہ نظر سے کی جانے والی) تشریحات بھی تھیں۔

جدید حال میں اس نظریے کو سفارتی تعلقات کے حوالے سے وسیع تر معنوں میں اختیار کر لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پوپ جان پال دوئم (Pope John Paul II) نے تو مشرق وسطیٰ میں بھی پرامن بقائے باہمی کے اصول پر عمل پیرا ہونے پر زور دیا تھا۔

سوویت یونین کی پالیسی

اس نظریے کی ترغیب 1961ء میں نکیتا خروشیف نے دی۔ اس جسارت کا مقصد اس وقت کی دو عالمی طاقتوں کے درمیان پائی جانے والی مخالفت کو کم کرنا تھا کیونکہ اس مخالفت کی وجہ سے نیوکلیئر جنگ چھڑ جانے کا خدشہ تھا جس کی وجہ سے وسیع پیمانے پر تباہی آ سکتی تھی۔

سوویت یونین کی جانب سے پیش کیے گئے نظریہ پرامن بقائے باہمی کا زور اس امر پر تھا دونوں عالمی طاقتیں (ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین) اور ان کے نظریات جنگ کیے بغیر پرامن طریقے سے مل جل کر رہ سکتی ہیں۔ خروشیف نے اس نظریے سے اپنی پختہ وابستگی ظاہر کرنے کے لیے جنیوا کانفرنس جیسی

بین الاقوامی امن کانفرنسوں میں بھی شرکت کی۔ خروشیف نے اس مقصد کے لیے بین الاقوامی سفر بھی کیا۔ اس کی مثال 1959ء میں اس کا امریکی کیمپ ڈیوڈ کا دورہ ہے۔

عالمی امن کونسل (World Peace Council)

نظریہ پرامن بقائے باہمی کے پیغام کو عام کرنے کے لیے 1949ء میں عالمی امن کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ اس کونسل پر اٹھنے والے اخراجات کا بڑا حصہ بھی سوویت یونین نے برداشت کیا۔ اس کونسل کا مقصد نظریہ پرامن بقائے باہمی کے پرچار کے لیے عالمی سطح پر امن تحریک کا اہتمام کرنا تھا۔ عالمی امن کونسل میں سوویت یونین کی دلچسپی کا اندازہ اس کی جانب سے کونسل پر کیے جانے والے اخراجات سے لگایا جاسکتا ہے۔ 1989ء میں کونسل نے خود اس امر کو تسلیم کیا کہ اس پر اٹھنے والے اخراجات کا 90 فیصد حصہ سوویت یونین برداشت کرتی تھی۔

عالمی امن کونسل نے 1940ء کی دہائی کے آخر سے لے کر 1980ء کی دہائی تک مختلف مظاہروں اور احتجاجوں میں شرکت کی اور امن تحریک چلانے کی کوششیں کیں۔ 1966ء میں سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے سے چین نے عالمی امن کونسل سے علیحدگی اختیار کرلی۔

عالمی امن کونسل مغربی یورپ کے ان علاقوں میں زیادہ متحرک تھی جن کی سرحدیں ایسے علاقوں سے ملتی تھیں جن میں امریکہ کی فوجی تنصیبات تھیں۔ ان تنصیبات کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ ان میں ایٹمی ہتھیار رکھے گئے ہیں۔ کونسل ویت نام کی جنگ سمیت مختلف علاقوں میں امریکی فوجی آپریشنز کے خلاف مہمات کا آغاز کیا۔ جبکہ ہنگری اور افغانستان میں سوویت سربراہی میں ہونے والے ایسے ہی اقدامات کی مخالفت نہیں کی گئی۔ بعدازاں 1991ء میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد عالمی امن کونسل محض ایک چھوٹے سے گروپ میں سمٹ کر رہ گئی۔

ورلڈ کانگریس (2004ء) (World Congress 2004)

مئی 2004 میں کونسل نے ایتھنز میں ورلڈ کانگریس کا اہتمام کیا۔ اس کانگریس میں دنیا بھر سے 100 امن گروپس نے شرکت کی۔

ورلڈ کانگریس (2008ء) (World Congress 2008)

2008ء میں عالمی امن کونسل کی ورلڈ کانگریس کا اہتمام وینزویلا کے دارالخلافہ کرکس میں کیا گیا۔ یہ کانگریس آٹھ سے تیرہ اپریل تک جاری رہی۔ اس کانگریس میں شرکت کا عالم تھا کہ اس میں دنیا بھر کے 76 ممالک کے 120 امن گروپوں نے شرکت کی۔

پرامن بقائے باہمی کا نظریہ سوویت یونین کی ضرورت

پرامن بقائے باہمی کا تصور اس لحاظ سے سوویت یونین کی ضرورت تھا کہ اس کا مقصد اس نظریے

کے ذریعے مذہب کے ان خدشات کو کم کرنا تھا کہ سوویت یونین عالمی انقلاب برپا کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس انقلاب کی وکالت لینن اور بولشویکوں یعنی انقلاب پسند اشتراکیوں نے کی تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لینن اور بولشویکوں نے دنیا بھر میں انقلاب لانے کی وکالت ضرور کی تھی لیکن انہوں نے کبھی بھی انقلابی نظریات کے نفاذ اور انقلاب لانے کے لیے تشدد یا جنگ کی وکالت نہیں کی تھی۔ اس بارے میں لینن نے خود سرمایہ دارانہ ممالک کے ساتھ "پرامن طریقے سے رہنے" کی بات کی تھی۔

دوسری جانب خروشیف کا بھی یہ نظریہ تھا کہ سوشلزم آخر کار سرمایہ داری نظام پر فتح حاصل کر لے گی مگر یہ بغیر کسی جنگ کے ہوگا کیونکہ اس مقصد کے لیے جنگ کا لڑا جانا کسی بھی طرح ضروری ہے اور نہ ہی ناگزیر۔

پرامن بقائے باہمی کے نظریے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تصور کر لینا بالکل قرین قیاس ہے کہ پرامن بقائے باہمی کا نظریہ اس ادراک کا رد عمل تھا کہ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو اس سے نا صرف اشتراکی نظام تباہ ہو جائے گا بلکہ ایسا ہونے کی صورت میں سوویت یونین بھی تہس نہس ہو جائے گا۔ اس امر کا اظہار سوویت یونین کی بڑی ملٹری فورس سے سٹریٹجک میزائل فورس کی طرف رجحان سے بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بدلاؤ خروشیف کے زوال کا ایک سبب بھی بن گیا مگر پھر بھی اس کے پیروکار سٹالن کے آمرانہ اشتراکی نظریات کی طرف راغب نہیں ہوئے جن کے مطابق استعماری اور اشتراکی نظاموں کے درمیان تضاد ناگزیر قرار دیا جاتا ہے۔

پرامن بقائے باہمی کا نظریہ اور چینی پالیسی

چین کے وزیر اعظم چو این لائی نے 1953ء میں بھارت کے ساتھ تبت کے مسئلہ پر مذاکرات کے دوران پرامن بقائے باہمی کے تصور کے 5 اصول پیش کیے۔ یہ پانچ اصول عوامی جمہوریہ چین اور بھارت کے درمیان تجارت اور چینی اور بھارتی تبت کے علاقوں میں عملداری سے متعلق ہونے والے معاہدے میں بھی تحریر کیے گئے تھے۔ اس معاہدے پر چین کے وزیر اعظم چو این لائی اور ان کے بھارتی ہم منصب جواہر لال نہرو نے 1954ء میں دستخط کیے۔

چو این لائی نے ایشیائی اور افریقی ممالک کی بنڈونگ کانفرنس (Bandung Conference of Asian and African Country) میں ان اصولوں پر بہت زور دیا اور بعد میں ان اصولوں کو کانفرنس کے اعلامیہ میں شامل کر لیا گیا۔ اس پالیسی کا ایک بڑا نتیجہ یہ تھا کہ چین اس بات کا پابند ہو گیا کہ وہ جنوب مشرقی ریاستوں خصوصاً انڈونیشیا اور ملائیشیا میں کمیونسٹ بغاوتوں کی مدد نہیں کرے گا اور ملکوں میں رہنے والے چینیوں سے بھی خود کو حد فاصل پر رکھے گا۔

تاہم ماؤنواز نظریات کے حامی استعماری اور اشتراکی دنیاؤں کے درمیان کسی بھی قسم کے اختلاف

کے موجود ہونے یا باقی رہنے پر زور دیتے رہے۔

1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں پرامن بقائے باہمی کا نظریہ تمام خودمختار ریاستوں کے لیے ایک فریم ورک کی حیثیت سے وسیع ہو گیا۔ 1982ء میں یہ پانچ اصول عوامی جمہوریہ چین کے آئین میں تحریر کر دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں ان کی پابندی چینیوں کے لیے لازمی ہو گئی۔

نظریہ پرامن بقائے باہمی کے 5 چینی اصولوں کا متن

1- خودمختاری اور علاقائی استحکام کے باہمی احترام کا اصول۔

2- باہمی عدم جارحیت۔

3- ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کا اصول۔

4- برابری اور باہمی مفادات کا اصول۔ 5- پرامن بقائے باہمی کا اصول۔

چین کے پرامن بقائے باہمی کے تصور کی جہتیں

چین کے پرامن بقائے باہمی کے نظریہ کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔ جن کی مدد سے اس ضمن میں چینی تصور کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

1- آزاد تجارت کی حوصلہ افزائی

1970ء کی دہائی میں پرامن نظریہ بقائے باہمی کے بارے میں منظر عام پر آتے والے دوسرے تصورات کے برعکس چینی تصورات آزاد عالمی تجارت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

2- قومی خودمختاری اور علاقائی استحکام

چینی پرامن تصور بقائے باہمی میں دیگر ممالک کی قومی خودمختاری اور علاقائی استحکام پر خصوصی زور دیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں امریکہ کی طرف سے جمہوریت اور انسانی حقوق کی ترقی کے لیے کیے گئے اقدام مخالفانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

3- تائیوان اور چینی تصور پرامن بقائے باہمی

چین تائیوان کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست تسلیم نہیں کرتا لہٰذا نظریہ پرامن بقائے باہمی کا اطلاق تائیوان پر نہیں ہوتا۔ اس تناظر میں دیگر ممالک خصوصاً امریکہ کی طرف سے خود کو چین، تائیوان تعلقات میں ملوث کرنے کی کوشش کو بھی مخالفانہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

☆---☆---☆

سوال: سنڈیکلزم کے بنیادی اصول بیان کریں۔ 2003ء، 2006ء، 2008ء

سنڈیکالیت

Syndicalism

جواب۔ سنڈیکالیت یا پیشہ سری اشتراکیت کا آغاز فرانس سے ہوا۔ اور اس کے عقائد پر فرانس کی سیاسی زندگی کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ فرانسیسی زبان میں مزدوروں کی انجمن کو "سنڈیکیٹ" کہتے ہیں اور سنڈیکالیت (Syndicalism) اسی لفظ (Syndicate) سے نکلا ہے۔ سنڈیکالیت وہ سیاسی نظریہ ہے جو مزدوروں کی حکومت کی وکالت کرتا ہے۔ اس کو انقلابی یا جنگجو مزدور تحریک سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ٹریڈ یونین کی تنظیم کو نئے سماج کی بنیاد سمجھتا ہے۔ یہ تحریک فرانس میں 1900ء سے 1914ء کے درمیان پھلی پھولی اور اس کے اثرات سپین، اٹلی، انگلستان اور لاطینی امریکہ کے ممالک کی سیاست و معیشت پر بھی مرتب ہوئے۔

سنڈیکالی تحریک پر جوزف پرودھاں اور جی سوریل کے پرتشدد نظریات کا بھی بہت زیادہ اثر پڑا۔ نراجیت پسندوں کی طرح سنڈیکالیوں کا بھی یہ نظریہ تھا کہ ریاست چونکہ ظلم و استبداد اور استحصال کا آلہ کار ہے لہٰذا اسے ختم کر دیا جانا چاہیے۔ سنڈیکالزم یا پیشہ سری اشتراکیت کے حامی بھی سرمایہ دارانہ نظام کو تمام برائیوں کی جڑ خیال کرتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ سنڈیکالیت کا مختصر تعارف و مفہوم ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے بنیادی اصول درج ذیل واضح ہوتے ہیں۔

سنڈیکالیت کے بنیادی اصول (Basic Principles of Syndicalism)

سنڈیکالیت کے بنیادی اصولوں میں سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی شدید مخالفت، ملکیت کی مخالفت اور سنڈیکالیت کے اصولوں پر مبنی نئے سماج کی تعمیر ہے جو ٹریڈ یونین کی تنظیم پر مبنی ہوگا۔ ذیل میں ہم سنڈیکالیت کے بنیادی اصولوں کے مختلف پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت (Opposition of Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کے حوالے سے سنڈیکالیت کے حامی مارکسزم کے اس نظریے سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں کہ ہر معاشرے میں دولت مزدور طبقہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس طبقے کے ساتھ انتہائی

برا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ان کا استحصال کیا جاتا ہے اور صنعتوں کے نظم ونسق میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ انہیں صرف دولت پیدا کرنے کا ایک مشینی ذریعہ ہی سمجھا جاتا ہے۔

سرمایہ داروں اور مزدوروں میں تصادم

" پیشہ سری اشتراکیت کے علمبرداروں کا عقیدہ ہے کہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کے مفادات بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں اگر ایک پانی ہے تو دوسرا آگ، ایک دھوپ ہے تو دوسرا چھاؤں، ایک ظالم ہے تو دوسرا مظلوم لہٰذا ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔" ان کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔ دونوں متضاد سمتوں کے مسافر ہیں مگر ان کے مفادات کا ٹکراؤ ہمیشہ برقرار رہتا ہے جس کی بنا پر ان کے درمیان تصادم ناگزیر ہوتا ہے۔ اس لیے اس تحریک کے حامی اس نظریے کے قائل ہیں کہ تمام مزدوروں کو منظم ومتحد ہوکر سرمایہ داروں کے خلاف برسرپیکار رہنا چاہیے اور اپنی فلاح کے لیے سرمایہ داری کے خاتمہ تک جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔

ذرائع پیداوار پر سماجی ملکیت

سنڈیکالیت کے پرچارک سرمایہ کو چوری سمجھتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت ختم کرکے سماجی ملکیت قائم کی جانی چاہیے ان کا خیال ہے پیداوار کے ذرائع پر پیداکاروں یعنی مزدوروں کا کنٹرول ہونا چاہیے۔

ان کا کہنا ہے کہ پیدا کار ہی کسی چیز کو قیمت عطا کرتے ہیں، اس لیے پیداوار پر انہی کا کنٹرول ہونا چاہیے۔

مزدوروں کا کنٹرول پیداوار میں اضافہ کا سبب

سنڈیکالیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ جب صنعتوں پر پیدا کاروں کا کنٹرول ہوگا تو وہ جم کر کام کریں گے اور اس طرح پیداوار میں اضافہ یقینی ہوجائے گا کیونکہ جن جن صنعتوں پر پیدا کاروں مزدوروں کی تنظیم کا کنٹرول ہوتا ہے وہاں کے نظم ونسق میں مزدوروں کی کچھ نہ کچھ آواز ضرور ہوتی ہے، انہیں مناسب نمائندگی ملتی ہے تو وہ صنعت میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں جس کی بناء پر ان کی کارکردگی اور کام کی خوبی بہتری میں اضافہ ہوتا ہے۔

سیاسی میدان میں بھی مزدوروں کا کنٹرول

پیشہ سری اشتراکیت کے حامی کہتے ہیں کہ جب مزدوروں کو معاشی اور صنعتی میدان میں کنٹرول حاصل ہوجائے گا تو یہ کنٹرول محض اسی شعبہ تک محدود نہ رہے گا بلکہ سیاسی میدان میں بھی ان کا کنٹرول ہوگا۔ اور ایسا ہونے سے ان کے کام کرنے کی صلاحیت، اور بھی بڑھ جائے گی۔ لہٰذا مسائل کا بہترین اور موثر حل یہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کرکے سنڈیکالیت کے اصولوں پر مبنی سماج تشکیل دیا جائے۔

مملکت کی مخالفت (Opposition to the State)

جس طرح پیشہ سری اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کی دشمن ہے اسی طرح یہ مملکت کی بھی مخالفت کرتی ہے۔ مملکت کے وجود کی مخالفت میں ان کے نظریات بہت شدید ہیں۔

۱۔ مملکت مزدوروں کو دبانے کا حربہ

سنڈیکالیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ مملکت سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ایسا آلہ بن جاتی ہے جس کے ذریعے مزدوروں کے کچلنے اور دبانے کا کام لیا جاتا ہے مملکت مزدوروں کو دبائے رکھنے کے لیے اپنی پوری طاقت استعمال کرتی ہے اور سرمایہ داروں کو موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ مزدوروں کا خون چوستے رہیں اور اپنے مفادات کا تحفظ کرتے رہیں"۔ اس لیے ضروری ہے کہ مزدوروں کا استحصال روکنے کے لیے مملکت کو ختم کر دیا جائے

۲۔ مملکت سرمایہ داروں کے مفادات کی محافظ

پیشہ سری اشتراکیت میں مملکت کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں ہے کیونکہ جب کبھی فرانس میں اقتدار اشتراکیوں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے بھی مزدوروں کی ہڑتالیں روکنے اور انہیں "راہ راست" پر لانے کے لیے فوج کو مدد کے لیے بلایا"۔ اسی لیے پیشہ سری اشتراکیوں کا یہ پختہ یقین تھا کہ مملکت کا واحد مقصد صرف اور صرف سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح سنڈیکالی مملکت کی دشمنی میں نراجیوں کے زیادہ قریب ہوگئے۔ جو مملکت کے مکمل خاتمہ کے حق میں ہوتے ہیں۔

مملکت بورژوا طبقہ کی تنظیم

سنڈیکالزم کے حامیوں کا خیال ہے کہ مملکت بورژوا طبقے کی ایک ایسی نمائندہ تنظیم ہے جس کا کام مزدوروں یعنی پیدا کاروں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ مملکت کی اس خصوصیت کی بنا پر وہ لوگ جو اس کا حصہ ہوتے ہیں وہ بھی پیدا کاروں کی خواہشات کا بالکل خیال نہیں رکھتے بلکہ ان کا رویہ ہمیشہ سرمایہ داروں کے لیے نرم اور مفید ہوتا ہے اور دفتری برتاؤ میں صنعتوں کی روح یعنی پیدا کاروں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ جس سے انسانی اخلاق کا خون ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مملکت کی اس غیر جانبداری اور برتاؤ میں بددیانتی کی بنا پر سنڈیکالیت کے علمبردار اس کے مکمل خاتمہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ریاست کی بھی بددیانتی پیشہ سری اشتراکیت کی تعلیم کا لازمی جزو ہے اسی لیے انہوں نے اپنے مجوزہ نظام سے ریاست کو خارج ہی کر دیا ہے۔

مملکت افراد میں تخیل کے خاتمہ کا سبب

سنڈیکالیت کے پرچارک کہتے ہیں کہ ریاست افراد میں تخیل کا جذبہ ختم کر کے ان میں یکسانیت پیدا

کر دیتی ہے جس سے افراد میں پہل کرنے کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے۔ اور ان کی ذہنی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر صنعت کا کنٹرول ریاست کے ہاتھ میں ہو تو مزدور محض مشینیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کو صنعتی معاملات اور اس کی تنظیم سے واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی، جس سے پیداواری کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر صنعتوں کا کنٹرول مزدوروں کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو اس سے ان میں آگے بڑھنے اور پہل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، یکسانیت کا خاتمہ ہوتا ہے اور آخر کار یہ تمام عناصر صنعتی پیداوار میں اضافہ اور مزدوروں کی خوشحالی پر منتج ہوتے ہیں۔

مملکت، صارفین اور مزدور

سنڈیکالیت کے حامیوں کا ریاست پر سب سے شدید اعتراض ہے کہ ریاست معاملات کے معاملہ میں صارفین کے حقوق کا خیال تو رکھتی ہے مگر مزدوروں کے حقوق کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیتی ہے۔ جس سے ان کا استحصال ہوتا ہے۔ اس طرح ریاست صارفین کے حقوق کی پاسداری کر کے ایک طرح سے سرمایہ داروں کا خیال ہی رکھتی ہے کیونکہ صارفین ہی سرمایہ داروں کے سرمایہ میں اضافہ کا ثانوی سبب ہیں، ثانوی اس لیے کہ پہلا سبب تو مزدور ہیں جو اشیاء پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح ثانوی سبب کے حقوق کا تحفظ اور بنیادی سبب کے حقوق کی پامالی کر کے ریاست دورخی سلوک کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جابرانہ قوانین اور تشدد پر مبنی انتظامی کارروائیاں کرنے والی ریاست کو ختم کر دیا جائے۔

مملکت اور سماجی اتحاد

سنڈیکالیت کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ ریاست کے زیر انتظام سماج کوئی وحدانی تنظیم نہیں بلکہ متعدد تنظیموں کا مجموعہ ہے۔ ریاست اپنے احکامات جاری کرتے ہوئے سماجی تنظیموں کے ساتھ یکساں سلوک روا نہیں رکھتی۔ ریاست سرمایہ داروں کے حقوق کی محافظ بن جاتی ہے، صارفین کے حقوق کا خیال رکھتی ہے جبکہ پیداکاروں کے حقوق کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ ایسا ہونے سے جہاں ریاست کے خلاف متاثرہ تنظیم (یہاں مزدور مراد ہیں) میں نفرت پیدا ہوتی ہے وہاں ایسی تنظیموں جن کے حقوق کا ریاست تحفظ کرتی ہے، کے ساتھ تضادات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تضادات ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر مخاصمت بن جاتے ہیں جو سماج میں انتشار کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا سماج میں اتحاد اور سماجی اتحاد کے نصب العین کے حصول میں سیاست رکاوٹ بنتی ہے۔ اس لیے اس کا خاتمہ ناگزیر ہے۔

سنڈیکالی سماج (A Society Based on Syndicalism)

جہاں تک مستقبل کے معاشرے یا سماج کے قیام کا سوال ہے تو اس ضمن میں سنڈیکالیت کے حامی یا تو جان بوجھ کر خاموش ہیں یا پھر وہ سماج کے بارے میں کوئی قطعی نظریہ پیش ہی نہ کر سکے۔ اس کے بعض علمبرداروں جن میں پےتوآد (Patuad) اور پوگے (Pouget) شامل ہیں، نے نئے سماج کی ذہنی سی

جھلک پیش کرتا ہے۔

بہر حال سنڈیکالیت کے حامی ایسے سماج کا قیام چاہتے ہیں جس کی ہر وحدت صنعتی ہوگی اور یہ مزدور یونینز کی تنظیم پر مبنی ہوگا۔

مرکزی کنفیڈریشن

سنڈیکالی سماج کے اس جزو کے مطابق تمام مقامی سنڈیکیٹ ایک مرکزی کنفیڈریشن میں منظم ہوں گے۔ یہ کنفیڈریشن ہر ضلع کے لیے روزگار دلانے والی ایجنسی اور ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے لیے مرکز کی حیثیت سے کام کرے گی۔

یہ کنفیڈریشن متعلقہ جگہ کی معاشی ضرورتوں کا خیال رکھے گی اور اپنے علاقہ کی صنعتی پیداوار کی حد مقرر کرے گی اور اس کی نوعیت طے کرے گی اور دوسرے ضلعوں کے ساتھ مل کر درآمد اور برآمد کا انتظام بھی کرے گی۔

طبقاتی معاشرہ

سنڈیکالیت کی تعلیمات سے معاشرے کے بارے میں جو ایک اور خیال ابھرتا ہے وہ طبقاتی معاشرہ ہے۔ اس سلسلے میں سنڈیکالیت کے حامی مارکس اشتراکی طبقاتی نظام کو قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں بھی معاشرے میں دو طبقات پائے جاتے ہیں جن میں سرمایہ دار طبقہ اور مزدور طبقہ شامل ہے۔ اس کو وہ بورژوا طبقہ اور پرولتاریہ طبقہ بھی کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرے کا سرمایہ دار طبقہ ہمیشہ مزدور طبقہ کے حقوق غصب کرتا ہے، ان کا خون چوستا ہے اور اپنے سرمائے کو بڑھاتا رہتا ہے۔ لہٰذا معاشرے کو سرمایہ داری سے پاک کرکے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جانا چاہیے جس میں تمام اختیارات مزدوروں کے پاس ہوں۔ یہ مزدور اپنی انجمنوں کے ذریعے معاشرے کا نظم و نسق چلائیں گے جس کے لیے سنڈیکالیت کے حامیوں نے مرکزی کنفیڈریشن کا نظریہ پیش کیا ہے۔

سنڈیکالیت میں جدوجہد کا طریقہ (Struggle Method in Syndicalism)

پیشہ سری اشتراکیت کے حامی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے معاشی جدوجہد کے طریقوں پر زور دیتے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے کسی مخصوص سیاسی طریقہ کی حمایت نہیں کرتے۔ ان کا طریق کار راست اقدام (Direct Action) پر مبنی ہے جس کو خود محنت کش اختیار کرتے ہیں۔ سنڈیکالیت کی جدوجہد کے طریقے درج ذیل ہیں۔

1۔ عام ہڑتال

پیشہ سری اشتراکیت کے حامیوں کے پاس اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سب سے موثر ہتھیار

ہڑتال کرنے کا ہے۔ وہ اس بات کے حامی ہیں کہ پارلیمان یا مجلس قانون ساز میں مزدوروں کے نمائندے کام اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ دوسرا یہ کہ مزدوروں میں سیاسی نظریات کے حوالے سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ اگر مزدور کسی ایک بات پر متفق ہو سکتے ہیں تو وہ ہے ہڑتال، ہڑتال کے بارے میں سنڈیکالیت کا حامی جارج سوریل بہت زیادہ پرجوش تھا۔ جارج سول (George Sorel) کے نزدیک عام ہڑتال کا عقیدہ وجدان پر مبنی ہوتا ہے اور یہی عقیدہ مزدوروں میں مذہبی جوش و خروش کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ سوریل کہتا ہے کہ جب یہ پیدا ہو جائے تو پھر عام ہڑتال کی حمایت میں کسی دلیل کے پیش کیے جانے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی اور نہ ہی اس عقیدہ کی مزید مضبوطی کے لیے دلیلوں کو پیش کرنا مفید ہے۔ بلکہ جارج سوریل تو اس قسم کی کوششوں کو ہی غلط ٹھہراتا ہے۔ اس کے نزدیک ہڑتال ہی ایک ایسا آلہ ہے جس کے استعمال سے مزدور سرمایہ داروں کو اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ان کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں۔ پیشہ سری اشتراکیت کے حامیوں کا عقیدہ ہے ہڑتال کے ذریعے پیداوار کے ذرائع پر مزدوروں کا قبضہ ہو جائے جو سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمہ کا سبب ہوگا۔

2- طبقاتی جدوجہد

پیشہ سری اشتراکیت کے علمبردار طبقاتی جدوجہد (Class Struggle) کی بھی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر مزدوروں میں طبقاتی شعور اجاگر کر دیا جائے تو وہ اپنے مفادات اور حقوق کی پہچان کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنے کا مقصد سرمایہ داروں کے خلاف نفرت ابھارنا بھی ہوتا ہے۔ تاکہ مزدور سرمایہ داروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور بالآخر صنعتوں پر قبضہ کر کے سرمایہ داری نظام کا خاتمہ کر دیں۔ سنڈیکالیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ ل مالکان سمجھوتوں کے ذریعے مزدور تحریک کو کمزور اور بے جان کر دیتے ہیں۔ اس لیے وہ مزدوروں کو بغاوت کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ایسے اقدامات ہی طبقاتی بیداری کا سبب بنتے ہیں۔

3- مشینوں کی توڑ پھوڑ

سنڈیکالیت کے پیرو مزدوروں کو ہڑتال کرنے اور ان میں طبقاتی شعور بیدار کرنے پر زور دینے کے علاوہ مشینوں کی توڑ پھوڑ، مشین خراب کرنے اور کام کو بگاڑ دینے جیسے حربے بھی استعمال کرتے ہیں، ان کے نزدیک ایسا کرنے سے صنعتی پیداوار کم ہوگی جس سے سرمایہ دار کا نقصان ہوگا۔ سرمایہ دار کا نقصان کرنا ہی ان کا مقصد ہوتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہونے کی صورت میں سرمایہ دار کی صنعتوں پر گرفت کمزور ہو جائے گی اور ان کا کنٹرول مزدوروں کے ہاتھ آ جائے گا۔

4- کام کی سست رفتار

پیشہ سری اشتراکیت کے حامی اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ مزدور کام کرنے کی رفتار انتہائی کم کر دیں۔ اس طریق کو Go Slow Strike یعنی سست کارکردگی بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریق کار کے تحت

کام کرنا بالکل بند نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی رفتار اس قدر کم کردی جاتی ہے جس سے وقت اور سرمایہ کا ضیاع ہو اور کارکردگی انتہائی ناقص ہو۔ ان کے نزدیک ایسا کر کے صنعت کو اقتصادی طور پر کمزور کیا جاسکتا ہے۔ جس سے صنعت ناکارہ اور سرمایہ دار بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور جب سرمایہ دار کمزور ہو جائے تو پھر اس سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کر کے مزدور ذرائع پیداوار پر آسانی سے قبضہ کر سکتے ہیں۔

سنڈیکالیت پر تنقید (Criticism on Syndicalism)

پیشہ سری اشتراکیت یا سنڈیکالیت کے بنیادی اصولوں اور جدوجہد کے طریق کار کا بغور جائزہ لیا جائے تو بعض ایسے نکات سامنے آتے ہیں جن سے اس نظام کے نامکمل ہونے کا اشارہ ملتا ہے اور یہی وہ نکات ہیں جنہیں سنڈیکالیت کے مخالف تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ سنڈیکالیت کے یہ منفی پہلو درج ذیل ہیں۔

صارفین کا مفاد نظر انداز

سماج محض اشیاء پیدا کرنے والوں یعنی مزدوروں پر ہی مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس میں صارفین یعنی اشیاء خریدنے اور استعمال کرنے والے دیگر طبقات بھی شامل ہوتے ہیں سنڈیکالیت میں مزدوروں کے حقوق کی بات تو کی جاتی ہے مگر صارفین کے حقوق کو نظر انداز کیا جاتا ہے حالانکہ پیداوار کے سلسلہ میں صارفین کا بھی کچھ حق ہوتا ہے کیونکہ مزدور صارفین کے لیے ہی اشیاء پیدا کرتے ہیں۔ اگر صارفین کسی چیز کو خریدیں گے تو اس کی قیمت ہوگی بصورت دیگر تو اشیاء کی کوئی قیمت ہی نہیں رہتی اور اس صورت میں اشیاء کا پیدا ہونا یا نہ ہونا تقریباً برابر ہو کر رہ جاتا ہے۔

حد سے زیادہ کنٹرول نقصان دہ

پیشہ سری اشتراکیت کا دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ جب پیدا کرنے والوں یا مال تیار کرنے والوں کے پاس حد سے زیادہ کنٹرول ہوگا تو وہ اس کا غلط استعمال کریں گے جس طرح سرمایہ دار مکمل کنٹرول حاصل کر کے مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اسی طرح اس بات کا احتمال بھی رہتا ہے کہ جب مکمل کنٹرول مزدوروں کے پاس آجائے گا اور ان پر کوئی Check and Balance نہیں ہوگا تو وہ بھی دیگر طبقات کا استحصال کرنے پر مائل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح حد سے زیادہ کنٹرول نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

عام ہڑتال پر زور

سنڈیکالیت کے حامی عام ہڑتال پر حد سے زیادہ زور دیتے ہیں لیکن عام طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہڑتال اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب مزدوروں میں اتحاد اور نظم و ضبط پایا جاتا ہو مگر ہڑتال جیسے بے ہنگم کام میں نہ تو اتحاد کا مظاہرہ ہوتا ہے اور نہ ہی نظم و ضبط دیکھنے میں آتا ہے۔ اس طرح مزدوروں کے باہمی انتشار کی وجہ سے ہڑتال ناکام ہو جاتی ہے اور ان میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، دوسرا یہ کہ ہڑتال اکثر پر تشدد

واقعات پر ختم ہوتی ہے جس کی وجہ سے ، جا کشت و خون ہوتا ہے اور معاشرے میں بدامنی پھیلتی ہے۔

مزدوروں کے لیے عوام کی ہمدردی

ہڑتال کا حربہ افراتفری اور انارکی پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے عام لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر ہڑتال طول پکڑ جائے تو عوام کو روزمرہ ضرورت کی اشیاء کم ملتی ہیں، وہ بھی بہت مہنگے داموں جس کی وجہ سے عوام میں مزدوروں کے لیے ہمدردی ختم ہو جاتی ہے اور اگر ہڑتال ناکام ہو جائے تو بھی عام لوگوں کو مزدوروں سے ہمدردی نہیں رہتی۔

غیر جمہوری اور غیر عقلی رویہ

سنڈیکالیت کے حامی مقاصد کے حصول کے لیے طاقت پر مبنی آمرانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جو جمہوری طریق کار کا سراسر الٹ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں معاشی منصوبہ بندی پر کوئی زور نہیں دیا جاتا صرف کام پر توانائیاں صرف کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے لہٰذا اس میں منصوبہ بندی اور جمہوری سوچ کے فقدان کی وجہ سے ذہانت یا عقل و دانش کو بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

مزدوروں کی سیاسی جدوجہد کی مخالفت

مزدور عام انتخابات میں حصہ لے کر اپنے مقاصد بخوبی حاصل کر سکتے ہیں مگر سنڈیکالیت کا نظریہ تو اس بات کا سرے سے ہی مخالف ہے کہ مزدور سیاسی جدوجہد کریں۔ اس کے نزدیک سماج میں صرف معاشی جدوجہد سے ہی تبدیلی آ جاتی ہے، وہ اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ معاشی معاملات بھی قدرے سیاسی اقتدار کے ماتحت ہوتے ہیں۔ پیشہ سری اشتراکیت کے حامی مزدوروں کی سیاسی جدوجہد کی مخالفت کر کے صرف معاشی جدوجہد پر زور دیتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے بھی وہ محض طاقت ہی کو واحد ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ عقل و دانش اور سوچ و فکر کو کوئی جگہ نہیں دیتے ہیں۔

سوال: گلڈ سوشلزم پر نوٹ لکھیے۔ 2002ء، 2005ء، 2008ء

گلڈ سوشلزم

(Guild Socialism)

تمہید و مفہوم

جواب: سنڈیکالیت فرانس میں پیدا ہوئی اور اٹلی میں جنگ عظیم کے بعد کچھ عرصہ کے لیے بروئے کار آئی مگر انگلستان میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ انگلستان میں سنڈیکالیت کی عدم مقبولیت اس تحریک میں پائے جانے والے انقلاب پسندی اور تشدد پسندی کے عناصر تھے کیونکہ انگریز بالطبع پرامن اور صلح پسند ہیں۔ لہٰذا سنڈیکالیت میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ اس کے لیے اجتماعیت کی بعض خوبیوں کو اپنایا گیا اور اس طرح سے گلڈ سوشلزم یا انجمنی اشتراکیت یا پیشہ ورانہ اشتراکیت کا وجود عمل میں آیا اس میں سنڈیکالیت اور اجتماعیت دونوں کی خوبیاں شامل ہیں۔

گلڈ سوشلزم کے نظریہ کو سب سے پہلے اے جے پینٹی (A.J. Penty) نے اپنی کتاب (Restoration of the Guild) ''گلڈ بحالی'' میں 1906ء میں پیش کیا۔ اے جے پینٹی کی تصنیف کا مقصد قرون وسطیٰ کے اس اصول کو اپنانا تھا کہ ہر پیشہ اور صنعت کے کارکن اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ مل کر ایک گلڈ انجمن بنالیں۔ یہ گلڈ ان تمام اشیاء یا اوزاروں کی مالک ہوگی جن سے سامان تیار کیا جاتا ہے۔ اور یہ گلڈ ہی پیداوار کی قسم اور مقدار مقرر کرے گی۔

اس کے بعد اے آر اوریج (A.R.Orage) اور ایس جی ہابسن (S.G.Hobson) نے اس نظریہ پر مکمل بحث و تمحیص کی۔ انہوں نے ہی اس نظریے میں اشتراکیت (مارکسزم) اور سنڈیکالیت کے بعض پہلوؤں کو شامل کیا۔ اور برطانیہ کے حالات کے مطابق اس میں ترامیم متعارف کرائیں۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ صنعت میں ٹریڈ یونین کا وجود گلڈ ہی کے جراثیم ہیں۔ بعد میں جی ڈی ایچ کول (G.D.H.Cole)، ٹانی (Tawny) اور برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) جیسے فلسفیوں نے گلڈ سوشلزم کی بڑے زور و شور سے وکالت کی۔ انہی فلسفیوں کی وجہ سے 1915ء میں نیشنل گلڈ لیگ (National Guild League) کا قیام عمل میں آیا۔

گلڈ سوشلزم کے بنیادی اصول

(Basic Principles of Guild Socialism)

گلڈ سوشلزم کے پیش نظر سب سے اہم مقصد اس وقت رائج اجرت کے طریق کار کو ختم کرنا تھا اور اس نظریہ کے پرچارک یہ مقصد قومی گلڈوں کے جمہوری نظام کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ صنعت کے میدان میں مزدوروں کی مدد سے حکومت خودمختاری قائم کی جائے۔ انہی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر ای ایم جوڈ نے اس نظریہ کے تین بنیادی اصول بیان کیے ہیں۔

1- پیشہ ورانہ جمہوریت کے اصول۔

2- صنعتوں پر جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کے محنت کرنے والوں کا کنٹرول۔

3- فرد کے اختیار اور ذمہ داری کا سماج کی خدمت میں اس کی صلاحیت کے مطابق ہونا۔

1- پیشہ ورانہ جمہوریت کے اصول

اس نظریے کے مطابق کسی مخصوص علاقہ کے رہنے والوں کے مفاد ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے علاقائی حلقوں کی بنا پر منتخب نمائندے سماج کی سبھی شعبوں کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جدید سماج مختلف پیشہ ورانہ گروہوں میں منقسم ہے اور مزید یہ کہ ہر گروہ کے مفاد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے سماج اسی وقت جمہوری کہلانے کے قابل ہو سکتا ہے جب سماج میں رہنے والے پیشہ ور گروہوں کو علیحدہ نمائندگی حاصل ہو۔ پیشہ ورانہ جمہوریت کے حامی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ سماج میں ایسی پیشہ ورانہ جماعتوں کا جال بچھا دیا جائے جن میں سے ہر ایک جماعت اپنے ارکان کی خواہشوں اور ان کے مشترکہ مفادات کی نمائندگی کرتی ہو۔

2- صنعتوں پر محنت کرنے والوں کا کنٹرول

گلڈ اشتراکیت کے حامی صنعتی میدان میں بھی پیشہ ورانہ جمہوریت کے اس اصول کو لاگو کرنے کے قائل ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر پیشے اور صنعت سے وابستہ لوگوں کی الگ تنظیم ہونی چاہیے تاکہ لوگ منظم ہو کر اپنے اپنے پیشے کو احسن طریقے سے چلا سکیں اور اپنے نگران خود منتخب کریں۔ وہ اپنے اوقات کار خود معین کریں۔ اسی طرح اجرت اور قیمت کو بھی یہ لوگ خود مقرر کریں تاکہ اشیاء کی پیدائش اور ان کی خرید و فروخت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہ آئے اور دولت آفرینی کا عمل ایک خاص نہج پر چلتا رہے۔ یہ سب کرنے کے لیے وہ مندرجہ ذیل خاکہ پیش کرتے ہیں۔

(الف): ابتدائی گلڈ

اس مقصد کے لیے حصول کے لیے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر کارخانہ یا فیکٹری خود ہی ایک ابتدائی گلڈ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ ابتدائی گلڈ کسی خاص کام کے لیے ایک دوسرے کے تعاون اور امداد باہمی پر دارومدار

رکھنے والی مدد کرنے والی اور اپنے مسائل خود حل کرنے والی تنظیم ہو گی۔ جملہ کام کرنے والوں کو خواہ وہ کاریگر ہوں یا غیر کاریگر ہاتھ سے کام کرنے والے ہنر مند ہوں چاہے مشین سے کام کرنے والے، خواہ وہ کلرک ہوں یا انتظامی فرائض انجام دیتے ہوں۔ ہر ایک گلڈ کے کام کرنے والے اپنے فورمین اور منیجر وغیرہ کا انتخاب خود کریں گے اور یہ گلڈ سارا کام سنبھالیں گے اور قومی گلڈ کے فیصلوں یا پالیسیوں کے مطابق پیداوار کو کنٹرول کریں گے۔

(ب): قومی گلڈ

ابتدائی گلڈ کے بعد اگلا قدم قومی گلڈ کی تشکیل ہوگا۔ قومی گلڈ کے لیے نمائندے منتخب کرنے کا کام ابتدائی یا مقامی گلڈ کرے گی۔ یہ گلڈ پیداوار، خرید و فروخت اور دیگر متعلقہ چیزوں کے سلسلہ میں پالیسی بنائے گی اور مزدوروں کے مسائل کے حل اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے لائحہ عمل تیار کرے گی۔

(پ) قومی گلڈوں کی کانگریس

اس کے بعد مختلف صنعتوں کی قومی گلڈیں ایک مشترکہ منظم تنظیم کے لیے نمائندوں کا انتخاب عمل میں لائیں گی۔ منتخب تنظیم قومی گلڈوں کی کانگریس کہلائے گی۔ یہ کام کرنے والوں کی سب سے بڑی جماعت ہوگی۔ اور سب صنعتوں کے مسائل پر غور کرے گی۔ اس تنظیم کا ایک اور فرض تمام مشترک صنعتی اور دوسرے متعلقہ امور پر کنٹرول کرنا ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ تنظیم قومی صنعتی پالیسی معین کرے گی۔

(ت) صارفین کی کونسل

گلڈ اشتراکیت کے پرچارک صرف پیدا کنندہ کے حقوق ہی کی بات نہیں کرتے بلکہ وہ ایک قدم آگے جاکر خریداروں یا صارفین کے مفادات کی بھی نگہداشت کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے صارفین کی کونسل کے نام سے ایک جماعت ہوگی۔ اس میں پیدا کنندگان اور صارفین دونوں کے نمائندے شامل ہوں گے اور کونسل دونوں فریقین کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔ خریداروں کی کونسل ٹیکس تجویز کرے گی جسے ہر گلڈ مملکت کو ادا کرے گی اس کے علاوہ یہ مختلف اشیاء کی قیمتیں بھی مقرر کرے گی۔

3- سماج میں فرد کا اختیار اور ذمہ داری

گلڈ اشتراکیت کا تیسرا اہم اصول جو جی ای ایم جوڈ نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ سماج کے اندر فرد کے اختیار اور ذمہ داری کا سماج کی خدمت میں اس کی صلاحیت کے مطابق ہوگا یعنی سماج میں ایک فرد کا اختیار اتنا ہی ہوگا جتنی وہ اپنی صلاحیت کے مطابق سماج کی خدمت کر سکے گا اور اس طرح سے سماج میں اس کی ذمہ داری کا بھی تعین کیا جائے گا۔

1- مملکت کا دائرہ اختیار

مملکت کے اہم امور دائرہ اختیار یا اس کی پوزیشن کے بارے میں گلڈ اشتراکیت کے حامیوں میں

اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ان میں بعض تو مملکت کا کوئی مخصوص سیاسی ڈھانچہ بھی پیش نہیں کرتے۔ قومی گلڈز لیگ (National Guilds League) جس کا قیام 1915ء میں عمل میں آیا، کا خیال ہے کہ کسی ملک کی تنظیم کی صحیح شکل کا اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کوئی نہایت سنگین صورت حال پیدا نہ ہو۔

2- مملکت سرمایہ دارانہ سماج کے مفادات کی محافظ

گلڈ اشتراکیت کے بعض مبلغ تو عام طور پر سے مملکت کے وجود کی سرے سے ہی مخالفت کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مملکت سرمایہ دارانہ سماج کے مفادات کا تحفظ کرنے والی انتظامیہ کمیٹی ہے۔ وہ مملکت کو خریداروں کی ایک تنظیم کی شکل میں بدلنا چاہتے ہیں جس کے ارکان ایسی قومی تنظیموں میں لیے جائیں جو بڑی بڑی پیداواری گلڈوں سے رابطہ رکھنے کے لیے قائم کی جائیں۔

3- ہابسن، گلڈ اشتراکیت اور مملکت

انجمنی اشتراکیت کے بعض مبلغین کا خیال ہے کہ گلڈ اشتراکی سماج کے قیام کے بعد بھی مملکت قائم اور برقرار رہے گی۔ جیسا کہ گلڈ اشتراکیت میں ترامیم کر کے اس کو برطانیہ کے حالات کے مطابق بنانے کی کوشش کرنے والے فلاسفر ایس جی ہابسن (S.G.Hobson) کا خیال ہے کہ گلڈ اشتراکیت میں مملکت سارے سماج کی نمائندہ ہوگی اور اس کا کام دوسری تنظیموں سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہ تنظیمیں سماج کے کسی نہ کسی طبقہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔لیکن مملکت ان سب سے بڑھ کر اور برتر ہے۔اس لیے کہ یہ اپنے کام دوسروں سے کرواتی ہے۔یہ اس فرد کی نمائندگی کرے گی جو مال پیدا کرنے اور خریدار کی بہ نسبت شہری زیادہ ہوگا۔

4- ایف ڈبلیو کوکر (F.W.Coker) گلڈ اشتراکیت اور مملکت

ایف ڈبلیو کوکر کے نزدیک مملکت کو گلڈوں کے کام مربوط اور ہم آہنگ رکھنے کا پورا پورا اختیار ہوگا۔ ہر ایک گلڈ اپنی متعلقہ صنعت کے انتظام میں آزاد ہوگی اس کو اس بات کا اختیار ہوگا کہ کتنا مال پیدا کیا جائے اور اس کی کیا قیمت مقرر کی جائے۔

5- بڑی صنعتوں پر مملکت کا کنٹرول

گلڈ اشتراکیت کے حامی مملکت کو یہ اختیار بھی دیتے ہیں کہ مملکت ملک کے دفاع کا کام انجام دے گی۔ ملک میں امن وامان قائم رکھے گی اور تمام بڑی بڑی صنعتوں پر بھی اس کا کنٹرول ہوگا۔مثلاً ذرائع رسل و رسائل، مواصلات، میونسپل کمیٹیاں اور کارپوریشن اس کے کنٹرول میں ہوں گے اور باقی ساری صنعتوں پر گلڈوں کا کنٹرول ہوگا۔

گلڈ اشتراکیت کے نظریہ مملکت پر تنقید

گلڈ اشتراکیت کے حامی مملکت کے دائرہ اختیار پر متضاد آراء رکھتے ہیں۔بعض سرے سے مملکت کے مخالف ہیں اور بعض اس کو جزوی اختیارات دینے کے حق میں ہیں۔ جبکہ بعض کے نزدیک مملکت بیگر تمام

گلڈوں سے بڑھ کر اور برتر پوزیشن میں ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ مملکت برتر اس لیے کہ وہ دوسری تنظیموں اور اداروں سے کام کراتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ مملکت کو دوسری تنظیموں سے کام کرانے کا حق دیتے ہیں تو وہ صنعتیں جہاں گلڈز تمام نظام کو کنٹرول کرتی ہیں تو اگر وہاں مملکت "اپنے کام کرانے کے حق" کو استعمال کرنے کی ٹھان لے تو پھر گلڈز اور مملکت کے درمیان محاذ آرائی پیدا ہونا ایک فطری عمل دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں محاذ آرائی اگر شدت اختیار کر جائے تو پھر بات خون خرابے تک پہنچ جاتی ہے۔ جس سے کام کرنے کی صنعت چاہے گلڈ کی ہو یا مملکت کی، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

گلڈ اشتراکیت کے طریقے

گلڈ اشتراکیت کے معاشی طریقے سنڈیکالیت سے ملتے جلتے ہیں۔ گلڈ اشتراکیت کے حامی ٹریڈ یونین تحریک جو کہ سنڈیکالی تحریک ہے، کو تیز کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک آج کی ٹریڈ یونین (مزدور انجمن) کل کی گلڈ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ٹریڈ یونین اور گلڈوں کے ڈھانچہ میں بہت کم فرق ہے۔ وہ ٹریڈ یونین میں دو تبدیلیاں کر کے اسے اس قابل بنانا چاہتے ہیں کہ یہ گلڈ کا کام انجام دے سکے۔ پہلی تبدیلی یہ ہوگی کہ ٹریڈ یونین میں صنعتوں میں کام کرنے والے سبھی افراد کو شامل کر لیا جائے گا اور دوسری تبدیلی یہ ہوگی کہ صنعت کے کام پر مکمل کنٹرول رکھا جائے گا۔

گلڈ اشتراکیت کی وکالت کرنے والوں کے نزدیک عبوری دور میں ٹریڈ یونینوں کو دو اہم اصولوں کے مطابق کام کرنا پڑے گا۔

1- صنعتوں پر مکمل کنٹرول

پہلے اصول کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کیے بغیر ٹریڈ یونینوں کو صنعتوں پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہوگا۔ کارخانوں میں موجود فورمینوں اور اوورسیئرز کو ٹریڈ یونین میں شامل کر لیا جائے گا اور جس فورمین یا اوورسیئر کو یونین کے اصول وضوابط سے اتفاق نہ ہوگا اسے ملازمت سے الگ کر دیا جائے گا۔

2- اجتماعی سمجھوتہ

یہ کہ کارخانہ کے مالک کے ساتھ پیداوار کی نوعیت، مقدار اور کام کرنے والوں کی شرائط ملازمت کے بارے میں اجتماعی سمجھوتہ ہوگا۔ اس سمجھوتہ کے مطابق ٹریڈ یونین کارخانہ کے مالک سے کل اجرت وصول کرے گی اور سے کام کرنے والوں میں ان کے کام کی مقدار اور معیار کے حساب سے تقسیم کر دے گی۔ ان کے نزدیک ایسا کرنے سے ایک تو مزدوروں میں طبقہ وارانہ شعور بڑھے گا اور دوسری طرف انہیں صنعتیں چلانے کا تجربہ ہوگا۔

گلڈ اشتراکیت کے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وضع کردہ طریقے دو طرح کے ہیں یعنی سیاسی اور معاشی۔ ان کے سیاسی طریقے اجتماعیت پسندوں کے طریقوں سے ملتے جلتے ہیں اور معاشی طریقے سنڈیکالیت کے طریقوں سے۔ گلڈ اشتراکیت بعض نکات پر سنڈیکالی اور اجتماعیت پسندوں کے طریقوں سے

میل کھاتی ہے اور بعض میں ان کے بالکل برعکس ہے۔ مثلاً جہاں تک ٹریڈ یونین ازم کا تعلق ہے تو گلڈ اشتراکیت، سنڈیکالیت سے پوری طرح اتفاق کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ان کی مرضی اور منشاء کے سماج کا قیام جو گلڈ پر مبنی ہے صرف ٹریڈ یونین ہی کے ذریعے آ سکتا ہے۔

دوسری جانب صارفین کے بارے میں سنڈیکالیت اور گلڈ اشتراکیت میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔

ا۔ سنڈیکالیت صرف پیدا کاروں کے حقوق پر زور دیتی ہے جبکہ صارفین کے مفادات کو بالکل نظرانداز کر دیتی ہے جب گلڈ اشتراکیت میں پیدا کنندگان کے ساتھ صارفین یا خریداروں کے مفادات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے

ب۔ اسی طرح گلڈ سوشلسٹ اجتماعیت پسندوں کی طرح سرمایہ دارانہ نظام کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا میں غربت، بیماری اور سماجی ناانصافی کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام ہی ہے۔ جبکہ اجتماعیت پسند ذرائع پیداوار کو مکمل طور پر مملکت کے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں مگر گلڈ اشتراکیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ اگر تمام ذرائع پر مملکت کا کنٹرول ہو گیا تو پھر پیشہ ور سیاستدانوں، نااہل اور بے ایمان سرکاری افسران کی لاٹری نکل آئے گی اور مزدوروں کا ہر قدم پر استحصال ہوگا۔ اور ان کے مصائب بڑھ جائیں گے۔ اسی لیے گلڈ اشتراکیت پسند، پرچار ک گلڈوں کے ذریعے صنعت پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ مزدوروں کے حقوق اور مفادات کا ممکن تحفظ کیا جا سکے تاکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خونی پنجوں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی جی سکیں۔

گلڈ اشتراکیت کی خامیاں (Drawbacks of Guild Socialism)

ہر نظریہ چاہے وہ دیر تک عوام الناس کو اپنے سحر میں پھنسائے رکھے یا پھر صرف دو چار دنوں کے لیے ہی موثر رہے، اپنے اندر اچھے اور برے پہلو چھپائے ہوئے ہوتا ہے، جہاں اس کی وجہ سے عوام الناس کو بے شمار فوائد اور سہولتیں ملتی ہیں وہاں اس کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح گلڈ اشتراکیت کی بھی خامیاں اور نقائص ہیں جن کی بناء پر اس نظریہ کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ماہرین سیاسیات و عمرانیات نے گلڈ سوشلزم کو اس طرح سے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

1- انسانی فطرت کا صرف روشن پہلو سامنے رکھا جاتا ہے

گلڈ یا انجمنی اشتراکیت پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کے پرچارک صرف انسانی فطرت کے روشن پہلو کو سامنے رکھتے ہیں۔ اور اس بات کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں کہ اکثر انسانوں میں خود غرضی اور لالچ کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اپنی غرض یا اپنے مفاد کے حصول کی خاطر انسان بڑی سے بڑی بے ایمانی کا ارتکاب کرنے سے گریز نہیں برتتا۔ انسان کی یہ وہ خصلت ہے جس کی وجہ سے دوسروں کے جائز مفاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ خودغرضی ایک حد تک انسان کی فطرت میں شامل ہے، خواہ کسی بھی صورت میں منظر عام پر آئے، کتنی ہی مدت کے بعد آئے بہرحال آ کر ضرور رہتی ہے۔ لہٰذا اس کو سرے سے نظرانداز کر دینا بہت بڑی غلطی ہے۔

2- قومی گلڈ کی اجارہ داری

انجمنی اشتراکیت کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صنعت پر قومی گلڈ کا قبضہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں وہ پیداوار پر قومی گلڈ کی اجارہ داری کی بات کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اجارہ داری ایک ناسور ہے، جو جس کسی شعبہ ہائے زندگی میں اسے بالآخر مفلوج کر کے ہی دم لیتا ہے، انجمنی اشتراکیت کے حامی بھی سرمایہ پر سرمایہ داروں کی اجارہ داری کی مخالفت کرتے ہیں۔ جبکہ یہاں وہ صنعت کی پیداوار پر قومی گلڈ کی اجارہ داری کی حمایت بلکہ شدومد سے وکالت کرتے ہیں۔ اگر سرمایہ داروں کی اجارہ داری نقصان دہ ہے تو پھر پیداوار پر قومی گلڈ کی اجارہ داری کس طور مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

3- مقابلے کا فقدان

جب پیداوار پر قومی گلڈ کی اجارہ داری ہوگی تو پھر جائز اور صحت مند مقابلہ نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اچھا مال تیار نہ ہو سکے گا اور نہ ہی مال تیار کرنے والوں میں اس بات کا جذبہ پیدا ہو سکے گا کہ وہ اچھی قسم کا مال تیار کریں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب تک مثبت اور صحت مند مقابلہ کی فضا نہ ہوگی اچھا مال تیار نہ ہو سکے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ پیداوار پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ اجارہ داری میں مقابلہ کی فضا ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

4- پیشہ ورانہ نمائندگی پر زور، قومی اتحاد کے لیے نقصان دہ

گلڈ اشتراکیت پر ایک اور جاندار اعتراض یہ کیا جاتا ہے، کہ یہ پیشہ ورانہ نمائندگی پر زیادہ زور دیتی ہے اور اسی کو ہر چیز کی اساس مانتی ہے۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو پھر قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا کیونکہ ان حالات میں ہر پیشہ ور صرف اپنے ہی پیشے کا خیال رکھے گا جس سے تنگ نظری بڑھے اور قومی اتحاد کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ جب کہ یہ بات دنیا کی بڑی حقیقت ہے کہ محض معاشی مسئلہ ہی اہم نہیں ہے اور نہ ہی کسی قوم کے وجود و حیات کا مقصد صرف کھانا پینا ہی ہے بلکہ اسے ایک جسم کی مانند تیار ہو کر اپنے وجود کو لاحق بیرونی خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسا صرف اسی صورت میں احسن طریقے سے کیا جا سکتا ہے جب قوم میں اتحاد اور بھائی چارے کا جذبہ زندہ جاوید ہو۔

5- مملکت کی برتری ختم

انجمنی اشتراکیوں پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ مملکت کی برتر پوزیشن کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اگر مختلف گلڈوں کے درمیان کسی وجہ سے اختلاف رونما ہو جائے تو اس اختلاف یا جھگڑے کو کون دور کرے گا۔ لہٰذا اس طرح کے جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے مملکت کی برتر پوزیشن از حد ضروری ہے۔

6- معاشی اور سیاسی امور کو الگ نہیں کیا جا سکتا

پیشہ ورانہ اشتراکیت کی ایک اور خامی یہ ہے کہ معاشی اور سیاسی امور کو ایک دوسرے سے بالکل الگ رکھنا چاہتی ہے۔ اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مملکت معاشی امور کی نگرانی نہ کرے جو آج کے پیچیدہ سماج میں ممکن ہے۔ کیونکہ معاشی اور سیاسی امور ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح منسلک ہوتے ہیں انہیں الگ کرنا عبث معلوم ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کے معاشی حالات خراب ہوں تو اس کا سیاسی امور پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے اسی طرح اگر کسی ملک میں سیاسی حالات عدم استحکام کا شکار ہوں تو اس کا اثر معاشی امور پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

7- پیچیدہ معاشی و سیاسی ڈھانچہ

گلڈ اشتراکیت جو معاشی و سیاسی ڈھانچہ پیش کرتی ہے وہ انتہائی پیچیدہ اور مشکل ہے اس کو ٹھیک ڈھنگ سے چلانے کے لیے ضروری ہے کہ عام شہری بہت زیادہ قابلیت کے حامل ہوں۔ دوسری بات یہ کہ پیشہ ورانہ نمائندگی اس لحاظ سے ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی ملک میں پیشوں کی تعداد سینکڑوں سے کم نہیں ہوں ان حالات میں ہر پیشے کی الگ الگ نمائندگی کے لیے گلڈ کا قیام اور پھر ان گلڈوں کو ایک دوسرے سے اشتراک عمل کے لیے منظم رکھنا بڑا گنجلک اور مشکل امر ہے۔ پیشہ ورانہ اشتراکیت کے اس پیچیدہ خاکے پر پروفیسر ہیرن شاہ نے کیا خوب تبصرہ کیا ہے جو ان الفاظ پر مشتمل ہے۔ ”ریاست کا جو تصور پیشہ ورانہ اشتراکیوں نے پیش کیا ہے وہ کئی کمیٹیوں اور مشترکہ کمیٹیوں کا الگ گورکھ دھندا ہے، جو ایسی مشینری کی یاد دلاتا ہے جسے عمر کے میکنو (Meceano) کے اجزاء سے بنایا کرتے ہیں۔“

8- گلڈز اور صارفین کی کونسل میں تصادم کا خطرہ

صارفین یا خریداروں کی کونسل کے قیام سے اگر اس تنظیم کا گلڈز کے ساتھ ٹکراؤ ہو جائے تو کارخانوں میں طوفان بدتمیزی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایسا ہونے کی صورت میں اختراع اور ایجاد کا دروازہ بند ہو جائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد صنعت پر تعطل اور جمود طاری ہو جائے گا۔ دولت کی پیداوار کم ہو جائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قیمتیں بڑھ جائیں گی اور عوام کو معاشی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس سے خانہ جنگی کی صورت پیدا ہوگی اور ملک میں ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ اگر یہ صورت حال نہ بھی پیدا ہو تب بھی آپس کی کشمکش اور حریفانہ سرگرمیاں ضرور اپنا رنگ لائیں گی۔ اس کی ایک مثال 1920ء میں انگلستان میں تعمیراتی تنظیم (Builders Guild) قائم ہوئی۔ تعمیراتی سرگرمیوں کے لیے وسیع میدان میسر تھا اور لوگ بھی مخالف نہ تھے تاہم دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ سارا کھیل ختم ہو گیا اور ملک کا کثیر سرمایہ اس اقتصادی تجربے کی نذر ہو گیا۔

☆---☆---☆

Fabian

Fabianism

سوال: فیبین ازم پر نوٹ لکھیں۔ 2002ء، 2004ء

سوال: ڈیموکریٹک سوشلزم کے نظریات کا اس سوشلسٹ نظام سے موازنہ کیجیے جو سوویت یونین میں اختیار کیا گیا تھا۔ 2005ء

فے بی ین اشتراکیت

جواب: فے بی ین اشتراکیت اصل میں مجموعی اشتراکیت ہی کے ہم نام ہے۔ یہ اشتراکیت کا ارتقائی اصلاحی اور آئینی مکتب فکر ہے۔ اس بناء پر یہ اشتمالیت یا پیشہ سری اشتراکیت کے برعکس ہے۔ جو اپنے مفادات کے حصول کے لئے راست اقدام اور انقلاب کا پرچار کرتی ہے۔ پروفیسر جذہرمن مجموعی اشتراکیت کی تعریف ان الفاظ کے ذریعے کرتا ہے کہ وہ پالیسی یا وہ نظریہ جس کا مقصد مرکزی جمہوری اختیار کے ذریعے دولت کی بہتر تقسیم اور تقسیم کے مطابق بہتر پیداوار حاصل کرتا ہے وہ اجتماعی اشتراکیت ہے"۔ اس طرح اجتماعی یا فے بی ین اشتراکیت معاشرتی تبدیلی کے لئے سختی کے ساتھ آئینی ذرائع اور موجودہ اہانت کا استعمال کرنا چاہتی ہے اس نظریے کے حامی جمہوری ریاست میں رائے عامہ کو آہستہ آہستہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے وہ تعلیم اور ووٹ پر بھی بھروسہ اور اعتماد کرتے ہیں

پس منظر : Back Ground

اگر ہم فے بی ین اشتراکیت کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ برطانوی اجتماعی اشتراکیت کو فے بی یت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ اس مکتب فکر کا آغاز برطانوی مزدوروں نے نہیں کی جن کی حمایت میں یہ نظریہ اصول فراہم کرتا ہے بلکہ برطانیہ کے بعض معاشرتی معاملات میں دلچسپی لینے والے ادیب اور باصلاحیت لوگوں نے ۱۸۸۴ء میں فے بی ین سوسائٹی کے نام سے اس کا آغاز کیا ہے۔ اس نظریے کے حامیوں میں جارج برنارڈ شاہ آف سڈنی اور بیٹرس ویب اپنی سینٹ۔ ایچ۔ جی ویلز ایمرنے میکڈانلڈ پروفیسر ہیرلڈ لاسکی اور ٹانی جیسے مشہور لوگ شامل تھے۔ چونکہ برطانوی عوام ہمیشہ آئینی پابندیوں سے آزاد رہے ہیں اس لئے انقلابی خیالات رکھنے والوں اور معاشرتی اصلاح چاہنے والوں کو سیاسی مظاہروں اور پارلیمانی اقدام پر پورا اعتماد ہے۔ برطانیہ میں ۱۸۳۲ء سے ۱۹۱۸ء تک چند مرحلوں میں جمہوری اصول انتخاب اختیار کیا گیا۔ انہی دنوں معاشرتی زندگی کے متعدد شعبوں میں پارلیمانی اقدام کی انقلابی تبدیلیاں ظاہر ہوئیں۔

اس امن پسند انقلاب کے پیش نظریہ خیال کرنا انوکھی بات نہیں کہ بتدریج پرامن آئینی ذرائع سے اشتراکی اصول مکمل طور پر رائج ہو جائیں گے۔

فے بی ین اشتراکیت مارکسی نظریات سے متاثر نہیں اور نہ ہی فے بی ین راہنماؤں کو مارکس کے پیروکار کہا جا سکتا ہے وہ نظریاتی طور پر ہنری جارج۔ جان سٹوارٹ مل اور گرین جیسے انگریز مفکرین سے متاثر ہیں۔

فی بی ین معاشرہ کا نام قدیم رومن جرنیل نے بی لیس کنکٹیر سے ماخوذ کی ہے۔ جرنیل فے بی ین نے اپنے مخالف ہینی بال سے جنگ کے دوران مناسب وقت کا انتظار کیا تھا۔ اور جب وہ وقت آگیا تو اس نے شدید حملہ کر کے ہینی بال کی طاقتور فوج کو ناکامی سے دوچار کر دیا۔ فے بی ین اشتراکیت بھی اسی طرح کے اصولوں کے حامی ہیں۔ ۱۸۸۴ء میں فے بی ین معاشرہ کے قیام کے وقت یہ اصول اور قواعد اپنائے گئے کہ درست اور مناسب وقت کا انتظار لازم کرنا چاہئے۔ فے بی ین نے بااصل صبر و تحمل کے ساتھ ہینی بال سے جنگ کے دوران انتظار کیا تھا۔

حالانکہ متعدد لوگوں نے اس تاخیر پر شدید تنقید بھی کی ہے لیکن جب وہ وقت آگیا تو فے بی ین کی طرح حملہ کرنا چاہئے۔ ورنہ سرمایہ داری نظام اور اشتراکی اصولوں کے درمیان جو کشیدگی جاری ہے وہ بے سود نہ رہے۔ فی بی ین تحریک اسی اصول پر عمل کر کے سرمایہ داری کے خلاف فتح حاصل کرنا چاہتی ہے۔

۱۸۸۷ء میں فے بی ین اشتراکیت نے اپنے اغراض اور مقاصد واضح کئے جن کو ۱۹۱۹ء میں تھوڑی ردوبدل کے بعد دوبارہ منظرعام پر لایا گیا۔ یہ تحریک معاشرے کی تنظیم نو اس طرح کرنا چاہتی ہے کہ زمین اور صنعتی سرمایے کو انفرادی ملکیت سے لے کر عوامی بھلائی کے لئے اجتماعی ملکیت میں دے دے۔ یعنی نجی جائیداد کا تصور معاشرے سے ختم ہونا چاہئے صرف اس طرح ملک کے قدرتی وسائل میں پورا معاشرہ برابر کا حصہ دار ہے۔

فے بی ین اشتراکیت پارلیمانی اصلاحات کے ذریعے مزدور اور پرولتاری طبقہ کی حالت زار کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں یہ ارتقائی اشتراکیت کا نظریہ بتدریجی محصولات کے حق میں ہے اور ورثت میں ملنے والی جائیداد پر بغیر محنت کے حاصل کی ہوئی دولت پر اور سرمایہ کاری کی آمدنی پر بھاری ٹیکس عائد کر کے لوگوں کو اقتصادی تفریق کو کم کرنا چاہتا ہے۔ یہ نظریہ ریاست کے خلاف نہیں بلکہ ریاست کو فلاحی معاشرہ قائم کرنے کے لئے ذریعہ کار بنانا چاہتا ہے۔

فے بی ین نظریے کے حامیوں کا خیال ہے کہ سرمایہ دار کی نجی جائیداد پر بھی پرولتاری طبقہ کا مساوی حق ہے لہذا اس میں ان کو برابر کا حصہ ملنا ضروری ہے۔

بنیادی قواعد :

فے بی ین اشتراکیت پر نظر دوڑائیں تو اس کے بنیادی اصول درج ذیل ہیں۔

سماج کا نامیاتی تصور :

فے بی ین اشتراکیت مارکس کے طبقاتی کشیدگی کے اصول کا مخالف ہے اور اس کے برعکس سماج کے بارے میں نامیاتی تصور رکھتا ہے۔

اس نظریے کی رو سے فرد ایک تنہا اکائی نہیں جو کسی کی مدد یا تعاون کے بغیر اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ بلکہ معاشرے کا ایک لازمی جزو ہے۔ اور اس کی ضروریات اور تگ و دو سرمایہ کی پیداوار کے باعث بنی ہے۔ معاشرہ ایک جیتا جاگتا نظام ہے جس میں ہر فرد اپنا فرض پورا کرتا ہے فے بی ین اشتراکیوں کا خیال ہے کہ موجودہ معاشرتی تنظیم بالکل ناقص ہے کیونکہ اس میں مخصوص افراد کو تمام آرام اور آسائشات حاصل ہیں حالانکہ آبادی کا زیادہ حصہ مصائب و آلام کا شکار ہے یعنی معاشرے میں تعدد آسائشات کے باوجود ہر طرف غربت چھائی ہوئی ہے لیکن یہ نقائص طبقاتی کشیدگی کے ذریعے دور نہیں کی جا سکتی۔

اس کا حل یہ ہے کہ ریاست اس کے لئے اہم کردار ادا کرے کیونکہ وہ معاشرے کی نمائندہ جماعت ہے وہ ایک ایسا ادارہ جو ریاستی افراد کو تحفظ فراہم کرنے کا ذریعہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں معاشرے کے مزدور لوگ بے حد محنت کرتے ہیں لیکن ان کی محنت کا فائدہ صرف مخصوص لوگ اٹھاتے ہیں اس کی وجہ سے بے بہا دولت کے باوجود ہر طرف افلاس چھائی رہتی ہے۔

مجموعی جائیداد :

مشترکہ ملکیت

فے بی ین اشتراکی مشترکہ ملکیت کے مارکسی نظریے کی مخالفت کرتا ہے اس کے نزدیک مارکس کا یہ خیال غلط ہے کہ صرف اقتصادی پیداوار ہی انقلاب کا سبب ہے اور کسی شے کی قدر و قیمت مزدور کی وجہ سے ہے جبکہ فے بی ین اشتراکیت کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ معاشرے کی مادی چیزوں کی قیمت بڑھانے میں تمام طبقات کا برابر حصہ ہے اس میں محنت کش اور سرمایہ دار برابر کے حصہ دار ہیں۔ لیکن اب صاحب جائیداد نے زرعی پیداوار میں سے اور سرمایہ دار نے اشیا کی اقدار میں سارے معاشرے کا حصہ ہے لہٰذا وہ دولت جو محنت اور تگ و دو کے بغیر حاصل ہوتی ہے لازماً معاشری ملکیت میں ہونی چاہئے کیونکہ اسے معاشرے ہی نے پیدا کیا ہے۔ معاشرتی ملکیت کے لئے ضروری ہے کہ دولت کی پیداوار اور تقسیم کے ذرائع اجتماعی جائیداد ہیں تمام اجارہ داریاں اور عوامی ضروریات افراد کی بجائے معاشرے کی ملکیت ہونی چاہئیں۔

لیکن جائیداد کا تبادلہ اور ردوبدل آہستہ آہستہ اپنے ارتقاء کی مراحل طے کرتا رہتا ہے۔ ایک وقت میں صرف ان صنعتوں کو قومی اور ملی جائیداد میں لینا چاہیے۔ جنہیں معاشرہ کامیابی سے چلا سکے معاشرے کو ان صنعتوں کی اجرت ادا کرنی چاہئے۔ لیکن اس قیمت پر جو قوم کے سیاسی نمائندے متعین

پارلیمان کے ارکان طے کریں۔ فے بی ین اشتراکی کا خیال ہے کہ معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں صرف محنت کش طبقہ ہی پیش پیش نہیں۔ بلکہ سرمایہ دار طبقہ بھی برابر کا شامل ہے محنت کش طبقہ صرف محنت اور جدوجہد کرتا ہے جبکہ اس کو سرمایہ صرف سرمایہ دار ہی مہیا کرتے ہیں اگر سرمایہ اپنی نجی جائیداد اپنا صنعتی سرمایہ دار مہیا نہ کریں تو محنت کش کسی صورت بھی اپنی محنت کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔

ناگزیر تدریجی انقلاب :

فے بی ین اشتراکی نظریات کے حامیوں نے مارکس کے نظریہ قدر و زائد کی بھی بھرپور مخالفت کی اور کہا کہ یہ موجودہ ریاست کو انقلاب کے ذریعے ختم کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ فے بی ین کا خیال ہے کہ سرمایہ دار نظام بتدریجاً اشتراکی معاشرے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ تدریجی تبدیلی اشتراکی سماج کے لئے ضروری سمجھا جائے تو پھر اس کے لئے ریاست کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ فے بی ین کا خیال ہے کہ دور حاضر کے پیداوار کے طریقے کار جس میں کوئی عملی جامہ اور منصوبہ بندی شامل نہیں اور دور حاضر کا تقسیم کا طریقہ کار جس میں مساوات نام کی کوئی چیز شامل نہیں یہ ایک لازمی امر ہے کہ ان کی جگہ بتدریجاً اشتراکی طریق پیداوار اور طریق تقسیم لے لیں۔ یہی وجہ ہے کہ فے بی ین اشتراکیت فوری اور انقلابی طریق کار کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ بلکہ اپنے منشور کو طریقہ تحریر و تقریر کے ذریعے پھیلانے کی خواہش مند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تدریجی ارتقاء کو ناگزیر قرار دیتے ہیں اور اپنے اشتراکی مفادات کے حصول کے لئے ذہین قابل اور باصلاحیت افراد کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور پرامن طریق کار کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پارلیمان نمائندوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی جس کو لیبر پارٹی کا نام دیا۔ جس نے محنت کش طبقہ کو اشتراکی اصولوں سے آگاہ کروایا اور ان کو ہر میدان میں متحد کرنے کی تگ و دو کی فے بی ین کا خیال ہے کہ برطانیہ میں سیاسی آزادی اور جمہوریت کا جو اصول بن چکا ہے وہ اشتراکی قواعد پر آئینی ذرائع سے عمل کرنے کے لئے بہت ضروری ہے وہ مزدور کو اس کا حق دلانے کے لئے پارلیمانی ذرائع کو نافذ کرنے کی بھی خواہاں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طریقہ سے محنت کش باآسانی اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔

فے بی ین کا منصوبہ

فے بی ین کے ارادے :

فی بی ین اشتراکیت کے حامیوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا ہے جو کہ درج ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

ا۔ ورثے میں حاصل ہونے والی دولت زمین کا کرایہ اور بغیر محنت کے حاصل ہونے والی دولت پر

محصولات وصول کرنا۔

۲۔ عوامی مقاصد اور فائدے کی صنعتیں اور قدرتی وسائل کی اجارہ داری ملی اور قومی تحویل میں لینا۔

۳۔ مزدوروں کو زیادہ اوقات کار سے نجات مناسب معاوضہ فراغت کے حصول اور بوڑھاپے بے روزگاری اور بیماری میں وظائف دینے کی اصلاحات نافذ کرنا۔

۴۔ فے بی ین کے منشر میں بے روزگاری کے خاتمہ کے لئے جدوجہد بھی شامل تھی اور ہر ایک کو موزوں اور مناسب تعلیمی سہولیات کی فراہمی کے دعوے دار بھی تھے۔ ان اصولوں کے علاوہ فے بی ین اشتراکیوں نے تمام شہریوں کے لئے حق رائے دہی کی بھی ہمیشہ حمایت کی ہے۔

فے بی ین تحریک اشتراکیت کی برطانوی شاخ ہے اس کا نظریہ قابل عمل اور آئینی ہے اور بڑی دور اندیشی پر مشتمل ہے بعض ماہرین کا اس نظریے کے بارے میں خیال ہے کہ "یہ نظریاتی پہلو کی بجائے عملی پہلو پر زیادہ توجہ دیتا ہے جس طرح فرانسیسی مزدور طبقہ کے انقلابی مزاج نے ہمیشہ سری اشتراکیت کو قبول کرنے میں جلدی کی اسی طرح برطانوی عوام کے آئینی اور باعمل ذہن و اطوار نے فے بی ین اشتراکیت کے ارتقائی تحریک کو مناسب سمجھا۔ پسند کیا سراہا۔ اور برطانوی لیبرپارٹی کی بنیاد رکھی جو اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد فے بی ین نظریات کو تقویت پہنچا رہی ہے۔"

سوال: نازی ازم پر ایک مفصل نوٹ لکھئے۔ 2005ء، 2007ء، 2009ء

سوال: جدیدیت کے بارے میں نازی نقطہ نظر کیا ہے؟ تنقیدی تجزیہ کیجیے۔ 2004ء

قومی سوشلزم

جواب: قومی سوشلزم کے پس منظر پر نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ قومی سوشلزم دراصل نازی ازم کا دوسرا نام ہے اس لئے نازی ازم کو قومی سوشلزم سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ جرمن نازیت اور اٹلی کی فاشیت کے حالات پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ دونوں ایک ہی طرح کے حالات کی پیداوار ہیں جنگ عظیم اول جرمن قوم کے **لئے تذلیل کا باعث بنی** اور جرمن متعدد فاتح ممالک کے درمیان ایک مفتوح علاقے کی مانند تھا۔ ابتداء میں جرمن اقوام کو حکمران طبقہ نے یقین دلایا تھا کہ جرمن **افواج ناقابل تسخیر ہے** اور پورے عالم کو اس بات کا علم تھا کہ جرمن فوج کو شکست دینا بڑا قت آمیز فعل ہے لیکن پھر حالات ایسے ہوئے کہ یہ ناقابل تسخیر جرمن فوج اتحادی طاقت کے ذریعے بری طرح شکست کھا گئی اور ملک کے اندر **معاشی و اقتصادی بحران** پیدا ہوگیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ جرمن فوج میں ہی نہیں بلکہ پوری **جرمن قوم میں وِل پاور کی کمی نہیں**۔ اس لئے اس نے اپنی شکست کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے دوبارہ کھڑا ہونے کے لئے جدوجہد تیز کر دی اور امن کا معاہدہ جس کو **معاہدہ وارسا کا نام بھی دیا گیا** جرمن اقوام نے ناپسند کیا کیونکہ اس میں جرمن قوم پر زبردستی ادکا صادر کئے گئے تھے۔ اور معاہدہ وارسائی شرائط کی رو سے جرمنی کی اقوام کے ساتھ ذلت آمیز سلوک برتا گیا۔ اور اتحادی طاقتوں نے جرمن قوم کو کمتر طبقہ کا درجہ دے دیا گیا۔ اسلحہ کی تخفیف اور فوج کی کمی کے ذریعے جرمنی کی فوجی طاقت کو ختم کرنے کی بھرپور جدوجہد کی گئی معاہدے کی رو سے کافی عرصہ تک جرمن ہوائی افواج کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور **پھر جنگ کا گراں قدر تاوان جرمنی پر عائد** کر دیا گیا جو جرمنی کے لئے ادا کرنا ایک مشکل امر تھا۔

لیکن جرمن اقوام کے احتجاج پر تاوان میں کمی تو کر دی گئی لیکن جب تاوان کا مطالبہ کیا گیا تو جرمن اقوام کی اقتصادی حالت بدتر ہو چکی تھی آخرکار یہ تاوان بالکل ختم کر دیا گیا۔ لیکن جرمن باشندے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کرتے رہے۔ کیونکہ اس فیصلہ کی رو سے وہ اتحادی طاقتوں کے غلام بن کر رہ گئی تھیں۔ کیونکہ ان کی جدوجہد اور محنت و مشقت کا ثمر اتحادی طاقتیں اپنے قبضہ میں کر

استعمال کرتی تھی جس کی وجہ سے جرمن باشندوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ جرمنی
کے بعد دریائے راٹن کے بائیں کنارے کے تمام علاقوں سے فوجوں کا کلی طور پر خاتمہ کر دیا گیا۔ جس
کی وجہ سے جرمنی کے لئے فوجی لحاظ سے ترقی کرنا مشکل ہو گیا۔
ورنہ جب تاوان جنگ کی ادائیگی میں دیر ہونے لگی تو فرانس اور بلجیم نے روہر کے علاقے پر
۱۹۲۳ء میں فوج کشی کر دی اور اسے کچھ عرصہ تک اپنے قبضہ میں لے لیا۔
علاوہ ازیں جرمنی کو اپنے تمام ملکی مقبوضات سے محروم کر دیا گیا۔
اگرچہ امریکہ کے صدر رووڈرولسن ان مقبوضہ علاقوں کو دوسری یورپی طاقتوں کے ہاتھ
منتقل کرنے کا ... نہ تھا۔ تاہم اتحادیوں نے ان مقبوضات پر قبضہ کرنے کا ایک یہ طریقہ نکالا کہ وہ اس
طرح کے مقبوضہ علاقوں کو تولیتی نظام کے ذریعے اپنے پاس رکھ سکتی تھیں۔
پھر یہ ہوا کہ فاتح ممالک نے مفتوح علاقوں کو تولیتی علاقے قرار دے کر مختلف یورپی طاقتوں کے
درمیان بانٹ دیا اور پھر یہ کہا گیا کہ اس تولیتی نظام کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ مقبوضہ اور ان غریب اور
معاشی بد حالی کا شکار باشندوں کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔
تاکہ وہ جلد از جلد خود مختاری حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں لیکن اتحادی طاقتوں کے قول
و فعل میں کافی تضاد تھا۔ کیونکہ فاتحین نے ان مفتوح علاقوں سے ہمیشہ مقبوضات کی طرح سلوک کیا۔
جس کی وجہ سے معاشی لحاظ سے جرمنی بری طرح کمتری اور بدحالی کا شکار ہو گیا۔ اور جرمن مارک کی
قیمت تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ اور ملک افراط زر سے دوچار تھا۔ درمیانہ طبقہ پر بھی غربت کا بھاری
بوجھ پڑ گیا لیکن ان حالات کا چند منافع خوروں اور مراعات یافتہ طبقہ نے فائدہ اٹھایا اور اپنے سرمایہ
میں اضافہ کرنے لگے۔ اور اس سرمایہ کا مختلف انداز سے مظاہرہ بھی کرنے لگے اس مراعات یافتہ طبقہ
کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی جرمنی میں بے روزگاری اور افلاس اس حد تک بڑھ گئی کہ ہر
شعبہ میں بدحالی عام ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں تقریباً ساٹھ لاکھ افراد بے روزگار اور بھوک کا شکار تھے۔
چونکہ جنگ کے بعد جرمنی کے بعض اہم علاقے دوسرے ممالک کے قبضہ میں چلے گئے تھے جس کی
وجہ سے جرمنی ان علاقوں کے ساتھ ہی اپنی بھاری صنعتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔
اس دوران جب پورے جرمن میں افلاس کا ڈیرہ تھا اشتمالیت بڑی پھرتی سے عالم میں پھیل
رہی تھی۔ اور جرمن حالات یہ ظاہر کر رہے تھے کہ بہت جلد ہی جرمن قوم اشتمالی نظام کو اپنے ملک
میں رائج کرے گی۔
ان حالات میں ایک ہی حل تھا کہ ملک کے اندر ایسا نظام حکومت قائم کیا جائے جو جمہوری
اصولوں پر مشتمل ہو۔ اور تمام جرمن باشندوں کو مکمل آزادی حاصل ہو۔
اس مقصد کے تحت جرمن میں ویمار یک دستور عمل میں لایا گیا لیکن یہ نظام حکومت عوام
میں مقبولیت حاصل کر نہ سکا۔ کیونکہ یہ ایک پروفیسر کا تصور تھا' جو علمی طور پر تو منفرد اور دلکش تھا
لیکن جرمن روایات کی عکاسی کرنے سے محروم تھا جرمن قوم مطلق ... حکمران پسند کرتے تھے

لیکن اس آئین کی رو سے ایک صدر مملکت ایک چانسلر اور ایک کابینہ کو قائم کرنے کی تجویز
گئی جو کہ پارلیمان کے سامنے جوابدہ تھی جن افراد نے ویمار آئین کی تشکیل و تکمیل
معاشرتی افراد اور قوم کی طرف سے یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے معاہدہ امن کے وقت
مقاصد و مفادات کا مکمل طور پر تحفظ نہ کیا۔ قومی وقار کو اور عظمت کو ناکامی اور اس کے بعد معاہدہ
امن کی شرائط سے جو دھچکا لگا اس نے مراعات یافتہ جرمن طبقہ پر گہرے اثرات مرتب کئے
حکمرانوں نے معاہدہ ورسیلز کو ایک کڑوی گولی کی طرح تسلیم کرلیا یہی وجہ تھی کہ ویمار آئین کے
ذریعے یکے بعد دیگرے جتنی حکومتیں بنیں ان سب کو کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک کے اندر مایوسی
اور عدم تعاون کی فضا پائی جاتی تھی اور حکومت معاہدہ ورسیلز کی ناممکن شرائط کو پورا کرنے میں
مصروف عمل تھی جس کی وجہ سے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۳ء تک جرمن میں اکیس بار وزارتیں
گئیں۔ جرمن ریاست میں جمہوری حمایت کے سبب سیاسی جماعتوں کی ایک فاضل تعداد موجود تھی جو
جرمن اقوام کے مسائل کے حل اور اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے بھرپور جدوجہد کر رہی تھی
۱۹۳۲ء کے پارلیمانی انتخابات میں اڑتیس ۳۸ سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔

جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو عوامی اکثریت کی تائید حاصل تھی اگر جرمن سوشل
ڈیموکریٹک عوام سے کئے گئے وعدوں پر عمل پیرا ہو کر ملک و معاشرے کی بدحالی کو ختم کرنے کی
تگ و دو کرتی تو ملک کی ترقی کی ضامن بن سکتی تھی لیکن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی اشتمالی
اثرات کو ختم کرنے کے لئے کوئی بھی قابل فخر کام انجام نہ دے سکی۔ پروفیسر جان سٹریچی کا
کہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے کمزور لائحہ عمل کے سبب نازیوں کو سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے
موقع میسر آگیا۔ اتحادی طاقتوں کی بھرپور کوشش تھی کہ جرمن کو ہر لحاظ سے کمزور اور لاغر بنا
تاکہ وہاں پر نافذ ہونے والا آئین اور جمہوری حکومت مکمل طور پر ان کے قبضہ میں رہے۔

جنگ عظیم اول کے بعد اور معاہدہ ورسیلز کے طے پاجانے کے بعد اتحادیوں نے جرمن
مکمل طور پر لاغر کرنے کی بھرپور جدوجہد کی بعدازاں معاہدہ ورسیلز کی ناقابل قبول شرائط
حکومت بدلنے کی خواہش کا اظہار کرتی تو عالمی دنیا اس پر بری طرح سردمہری اختیار کرتی۔
بڑی بے رحمی سے نظرانداز کردیا جاتا۔

جرمن کے خوشحال علاقوں کو اتحادیوں نے بحیثیت تولیتی علاقے مل بانٹ کر بھرپور
حاصل کیا۔ لیکن جیسے ہی جرمن اقوام کچھ طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تو اس کو مراعات سے
بھی نوازا گیا۔ لیکن پھر یہ مراعات آخرکار ۱۹۳۲ء میں تاوان جنگ معاف کی صورت اختیار کر گئیں
جرمن قوم کی یہ ذاتی خوبی تھی کہ وہ استبدادیت کے پنجہ سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب رہی
جرمن قوم اس سلسلہ میں اپنی حکومت کی بھی مشکور اور احسان مند نہ تھی جس نے سیاسی
کے ذریعے جرمن اقوام کو یہ سہولت فراہم کی گئی۔

آغاز نازی ازم :

جرمن کے سیاسی و معاشی عروج و زوال کے درمیان اگر جرمن قومی سوشلزم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ دراصل نازی ازم ابتدائی دور میں صرف ۲۸ اٹھائیس افراد پر مشتمل ایک غیر معروف جماعت تھی۔

نازی ازم کا تصور پیش کرنے والا ایک لوہار تھا جو کہ تالے بنانے کا کام کرتا تھا اس کا نام اینون ڈریکسلر تھا یہ کسی خاص لائحہ عمل کے تحت وجود میں نہ آئی تھی صرف اس تحریک کا ابتدائی مقصد یہ تھا کہ جرمن فوج ناقابل تسخیر ہے اور جنگ عظیم اول میں ہونے والی جرمن شکست ناقابل قبول ہے اس جماعت کے بانی اور حامیوں کا خیال یہ تھا کہ جرمن فوج کو غداری اور عیاری کے ساتھ شکست سے دوچار کیا گیا ہے۔

اس جماعت کے اٹھائیس اراکین میں سے صرف چھ افراد (کارکن) تنظیم کی عملی سرگرمیوں میں سنجیدگی سے حصہ لیتے تھے۔ جبکہ باقی افرد صرف زبانی اس جماعت کے حامی اور دعویدار تھے۔ انہی دنوں ہٹلر بھی اس جماعت کے نعرے اور منشور سے متاثر ہو کر ایک ساتویں عملی کارکن کی حیثیت سے جماعت کا رکن بنا۔

ہٹلر نسلی نژاد جرمن تھا۔ آسٹریلیا سے ۱۹۲۱ء میں جرمنی میں آکر پڑاؤ کر چکا تھا جنگ عظیم اول میں ہٹلر نے بھی جرمنی کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا۔ اس کی دلیرانہ جدوجہد کے عوض اس کو آئینی تمغہ سے نوازا گیا۔ اور اس نے کارپول کے عہدے تک ترقی کی منازل طے کرلی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف مسولینی اٹلی میں قومی رہنما کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اور اس نے فاشی آمریت کے نام سے پہلے بھی جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر ہٹلر اور مسولینی کی شخصیات اور صلاحیتوں کا تقابلی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسولینی ایک مفکر کی حیثیت سے سیاسی نظریات کو فلسفیانہ بنیادوں پر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جبکہ ہٹلر کی فطری صلاحیتوں گراں بہا خزانے کے باوجود دنیاوی تعلیم مکمل نہ تھی۔ اس کی شخصیت جذبات و احساسات کا منبع تھی اور وہ اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں سے پوری طرح واقف تھا اس نے اپنی ایک کتاب "میری جدوجہد میں ہیگل کی حکایات کو شامل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گرچہ وہ ہیگل کی تصانیف کا مطالعہ کرنے سے محروم رہا تھا۔

شروع میں نازی تحریک کو "جرمن محنت کشوں کی جماعت کا نام دیا گیا لیکن ۱۹۲۰ء میں ہی اس تحریک کا نام تبدیل کر دیا اور اس کو مناسب ردوبدل کے بعد **قومی اشتراکی جرمن محنت کشوں کی جماعت کا نام دیا گیا پھر عام زبان میں اس [illegible] جماعت کا نام دیا گیا۔ لفظ نازیت اسی نام کا** مخفف تھا جرمن میں **این اے NA کے حروف National اور Zi سے مراد Sozialisms ہے۔ قومی** اشتراکی جماعت **کو نازی تحریک کا نام دے** کر مشہور کر دیا گیا۔ نازی جماعت کے ابتدائی مقاصد میں زمین اور اوقات و قومیانے جنگی منافع کی ضبطی اور آمدنی کی منسوخی کی شقیں شامل تھیں دراصل جنگ

عظیم اول کے فاتحین نے مفتوحہ علاقہ جرمن کے ساتھ جو تذلیل سے بھرپور رویہ اختیار کیا نازی تحریک اس رویہ کا ردعمل تھا لیکن شروع میں کسی نے بھی سنجیدگی سے اس کے مقاصد و امور پر غور نہ کیا۔ لیکن نچلے طبقے کے ساتھ طالب علموں نے بھی اس تحریک میں خاص دلچسپی لی۔ لیکن سرمایہ دار طبقہ اور مراعات یافتہ طبقہ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ جبکہ جو لوگ اس تحریک میں موجود تھے وہ اس کے مقاصد پر غور کرنے کی بجائے اس کے جذبہ حب الوطنی میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے ابتداء میں نازی ازم ملک دشمن عناصر کے خلاف جنگ و جدل اور انتقام کی بنیاد پر قائم ہوئی نازی ازم مارکس اور اشتمالی نظریات کے حامیوں اور یہودیوں کے خلاف برسرپیکار تھی' اور جرمن قوم کے تمام عناصر کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

نازی تحریک ۱۹۲۳ء تک اپنے ابتدائی مراحل با آسانی طے کرنے میں کامیاب ہوئی اسی دوران جرنل ٹرن ڈورف کے ساتھ مل کر ہٹلر نے میونخ میں حکومت کا تختہ الٹنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے ہٹلر کو قید کر دیا گیا۔ عدالت نے اس کو بغاوت کے جرم میں پانچ سال قید کی سزا سنائی۔ لیکن اس کو چند خوبیوں کی بناء پر آٹھ ماہ بعد ہی قید سے آزاد کر دیا گیا۔ اس دوران اس نے ایک کتاب تحریر کی جس کا نام Mein Kampf تھا۔ نازی ازم کے علمبرداروں نے اس کو جرمن میں بائبل کا درجہ عطا کر دیا آہستہ آہستہ نازی ازم کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا اور بڑی تعداد میں لوگوں نے اس کی رکنیت اختیار کی اس کے پروگرام اور مقاصد میں بھی رد و بدل ہو گئی۔ زمین پر بغیر معاوضہ کے قبضہ کا جو قانون لاگو تھا ان یہودیوں پر عائد کر دیا جو زمین کی سٹہ بازی کرتے تھے۔ نازی تنظیم میں ایسے لوگ بھی شامل ہوئے جن کا تعلق فوج کے سابقہ افسروں سے تھا۔ انہوں نے اس تنظیم کے طوفانی دستوں کو منظم کرنے میں مدد دی اور اس طرح یہ طوفانی دستے پارٹی میں بنیادی حیثیت کے حامل تھے۔ ان دستوں کی کارروائیوں نے جرمن معاشرے کے نوجوان طبقہ کو بے حد متاثر کیا۔ اشتمالیوں کے خلاف دوبدو لڑائی کے طریقے نوجوانوں کے جنگی جذبے کی تسکین کا سبب بنے ہوئے تھے۔

اس تنظیم کی بھرپور تائید کی گئی آہستہ آہستہ اس پارٹی نے اپنی راہیں خود متعین کرنا شروع کر دیں عوام میں خود اعتماد بحال کیا۔ اور ان کے مقاصد پر پورا اترنے کی ہر ممکن جدوجہد کی پارٹی کی مقبولیت کی دیگر وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہٹلر ایک جوشیلا اور شعلہ بیان مقرر تھا اس کے اندر سامعین و حاضرین کو متاثر کرنے کا فن موجود تھا اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ماہرانہ پروپیگنڈا کیا جاتا اور جرمنی کو یکجا اور متحد رکھنے کے لئے قربانیوں کی افادیت اور ضرورت پیش کی جاتیں۔ جوق در جوق اس پارٹی کی طرف رجوع کرنے لگے۔ صنعت کار' محنت کش' سرمایہ دار اور سرکاری عہدیدار بھی اس کے سحر انگیز اثر کا شکار ہوگئے۔ اس میں شمولیت اختیار کرنے کی کئی ایک وجوہات تھیں ایک تو یہ انہیں جارحانہ قوم پرستی پسند تھی۔ دوسرے یہ کہ انہیں مکمل یقین تھا کہ ہٹلر کبھی بھی نازیوں کے ابتدائی مطالبات کو عملی جامہ پہنانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتا

اور نہ ہی ہٹلر نتراکی پروگرام پر کاربند رہ سکتا ہے۔ ۱۹۲۹ء کے بعد نازی تحریک نے بڑے تیزی سے
عروج کی منازل طے کیں عالمی سطح پر ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک کا دور ایک اقتصادی اور معاشی
دباؤ کا زمانہ یاد کیا جاتا ہے کیونکہ انہی دنوں جرمنی معاشی بدحالی کی لپیٹ میں بری طرح آچکا تھا اور بے
روزگاری افلاس کی حدوں کو چھونے لگی۔ اس طرح کے حالات نازی تحریک کے حق میں بہتری کا
سامان پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں ہٹلر صدارتی انتخابات میں ہنڈ برگ کا مقابلہ کرنے لگا۔ ہٹلر نے ان
انتخابات میں ...یا ایک کروڑ چوبیس لاکھ ووٹ حاصل کیے۔ اور پھر نازی تنظیم و پارلیمانی اکثریت
حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

ابتدا میں ہنڈن برگ نے نومبر ۱۹۳۲ء میں ہٹلر کو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے مل کر ایک
مستحکم اقتدار ...نے کی جدوجہد کی۔ اور پھر ہٹلر اور اس کے حواریوں کو حکومتی اقتدار کے مکمل
اختیارات دے دیئے گئے۔

اگر ...ر کی پہلی کابینہ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہٹلر کی پہلی کابینہ غیر انقلابی تھی اس کے
باوجود نازی پارٹی کو اپنی سیاسی تنظیم اور پولیس کے تعاون سے ملک میں مکمل اختیارات حاصل تھے۔
ملک میں تشدد اور جنگ و جدل کا سلسلہ شروع ہوگیا چند عناصر نے پارلیمان کی عمارت کو
آگ لگا کر ... طور پر جلا دیا آخرکار ۵ مارچ ۱۹۳۳ء کو پارلیمان کو برخاست کر دیا گیا شہریوں کے وہ
حقوق ... بنیا... حقوق کے زمرے میں آتے تھے اور جن کی حفاظت کا ذمہ آئین نے اٹھایا تھا اس
کشیدگی اور ...ماش کے نتیجے میں صدر نے معطل کر دیئے اور انہی ہنگامی حالات میں پارلیمانی انتخابات کا
انعقاد ...راجس کے نتیجہ میں نازی پارٹی کو ملک میں باون فیصد نشستیں حاصل ہوئیں جس مسودہ قانون
پر اتفاق ...ے کی وجہ سے انتخابات منعقد کیے گئے ان میں نازی پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس
بناء پر ...ی پارٹی کو چار سال کے لئے وسیع اختیارات تفویض کرکے حکومت بنانے کی مکمل
اجازت دے دی گئی تھی۔

وسیع اختیارات حاصل ہونے کے بعد نازی منشور پر عمل درآمد کا آغاز ہوا اور ملک کے اندر
سول سروس اور شعبہ عدل سے غیر آریائی افراد کو نکال دیا گیا۔ اور ایک عوامی عدالت کے قیام کا فیصلہ
کیا گیا جو حکومت کے لئے بہترین ڈھال کا کام کرتی تھی۔

نازی پارٹی کے بااعتماد رکن ڈاکٹر گوئیبلز کو سینما' ریڈیو' اور پریس پر وسیع اختیارات
دے دیئے ...جہ اس کے سپرد کر دیا گیا ڈاکٹر گوئیبلز چونکہ پروپیگنڈا کے محکمہ کا وزیر بھی تھا اس
نے اس تجربے سے بھرپور فائدہ اٹھایا ایک وزیر تعلیم مقرر کیا گیا جس کے ذمہ تمام سکولوں کالجوں اور
یونیورسٹیوں کے امور و مسائل کو سنبھالنا تھا۔ نازی پارٹی کو ملک کے اندر قانونی پارٹی کا درجہ دے دیا گیا
اور اب قانون نافذ کیا گیا جس کی رو سے ملک کے اندر ہی دوسری پارٹی کا انعقاد و تشکیل ایک جرم
قرار دے دیا گیا ٹریڈ یونین اداروں کو توڑ کر مزدوروں کو نازی تحریک کے قبضہ میں دے دیا گیا اور پھر
نومبر ۱۹۳۳ء میں انتخابات کا دوبارہ انعقاد ہوا جس میں نازی پارٹی بانوے فی صد ووٹ حاصل کرنے میں

کامیاب ہوئی اور پھر دسمبر ۱۹۳۳ء میں ہی نازی پارٹی کو ریاست کے نظام میں شامل کر لیا ۔ وفاقی طرز حکومت کا مکمل طور پر خاتمہ کر کے وفاق کی ہر ریاست کو ہٹلر کے بااعتماد ساتھیوں کی تحویل میں دے دیا گیا جن کے پاس آمرانہ اختیارات کو استعمال کرنے کا اجازت نامہ تھا۔

علاوہ ازیں پارلیمان کا ایوان بالا بھی ختم کر دیا گیا جو وفاق کا برسا برس سے ایک اہم نمائندہ تھا۔ آخر کار ۱۹۳۴ء میں ہینڈن برگ کی وفات کے بعد ہٹلر نے صدر اور چانسلر کے اختیارات اپنی ذات میں تفویض کر لئے اور پھر ہٹلر نے انتظامیہ اور مقننہ کے اختیارات بھی اپنی گرفت میں لے لئے۔

ہٹلر نے جرمنی کے تمام اختیارات اپنی ذات میں تفویض کر لئے اور اب وہ جرمنی میں اختیارات کلی کا مالک و حاکم تھا۔ رسمی طور پر پارلیمنٹ کے اجلاس منعقد کئے جاتے لیکن ان جلاسوں میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی بجائے۔ ہٹلر کے احکامات اور اقدامات کو حتمی فیصلہ سمجھا جاتا اور ہٹلر کے احکامات پر عمل پیرا ہو کر ریاستی امور کو انجام دیا جاتا۔ اس طرح سے جرمن نازیت بر سراقتدار آنے کا موقع حاصل اور ہٹلر کو ایک جابر حکمران کی حیثیت سے جرمنی پر احکامات صادر کرنے کا موقع میسر آگیا ہے۔

ہٹلر نے بر سراقتدار آنے کے بعد اپنے اختیارات کو مزید وسعت دی نازی ازم اب ایک طاقتور نظریہ کی حیثیت سے قوم میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ اب جرمن حکومت نے معاہدہ ورسیلز کی باقاعدہ خلاف ورزی کا لائحہ عمل تیار کیا فوج کو جدید اسلحہ سے لیس کر کے میدان کارزار میں اتارنے کی تگ و دو تیز کر دیں۔ ہٹلر نے یہودیوں کے خاتمے کے لئے ایک مکمل منصوبہ تیار کر کے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کو تیز کر دیا۔ ہٹلر نے جرمن قوم کو یہ نعرہ دیا کہ جرمن قوم ہی دنیا کی سب سے ناقابل تسخیر قوم ہے۔

جرمن قوم اس سے بے حد متاثر ہوئے اور ہٹلر کو کرشماتی شخصیت کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ ہٹلر نے اس دوران معاہدہ ورسیلز توڑنے کا اعلان کیا۔ اور کئی علاقوں پر حملے شروع کر دیئے جن علاقوں میں جرمن قوم آباد تھی اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی جدوجہد کی جس بنا پر دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور اس جنگ کے دوران جرمن کی حالت پہلی جنگ جیسی ہو چکی تھی اس صورت حال سے خوف زدہ ہو کر ہٹلر اقتدار چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور خودکشی کر لی جس کے نتیجہ میں جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

تصور نازیت

نظریہ نازی :

اٹلی کی فاشیت کی طرح جرمن کی نازیت بھی کسی ٹھوس اور باقاعدہ منصوبے اور نظریہ سے

تھی۔ من تھی۔ کیونکہ نازی ازم میں ریاست یا حکومت کے لئے کوئی واضح فلسفہ یا تصور موجود نہ تھا۔ حقیقت میں نازی تحریک ایک ایسی تحریک تھی جو جنگ عظیم اول کی شکست خوردہ جرمن قوم کے جذبات کو ... ہونے سے بچانے کا جذبہ رکھتی تھی۔ یہ دراصل ہٹلر کے جذباتی تصور کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔ ... اس بناء پر نازی تحریک کو ہٹلر کا تصور خیال کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جرمن مثالیت پسند فلاسفر اور مفکرین ہیگل اور کانٹ نے بھی نازیت کو نظریاتی طور پر پیش کرنے میں اپنے تصور و خیال کے ذریعے مدد فرمائی۔

نازی ازم جرمن قوم اور جرمن ریاست کو ایک بلند مقام اور ارفع صفات کا حامل قرار دیتا ہے۔ اس طرح ہیگل کے تصور پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ ہیگل نے بھی ریاست کو بلند مقام عطا کیا ہے۔ مگر ہیگل کے نظریہ ریاست کی ہیئت اور نوعیت فلسفیانہ انداز میں تھی جبکہ اس کے برخلاف جرمنی کی نازیت نے ریاست کو عملی طور پر ارفع مقام سے سرفراز کیا۔ نازی ازم کے حامی جانتے تھے کہ قومی وقار کے لئے قومی اتحاد ازحد ضروری ہے۔ اس لئے وہ ریاست کو ایک مافوق البشر کا درجہ دیتے تھے۔ بلکہ معاشرے کو ریاست کا ایک خام مال سمجھا جاتا تھا افراد کے حقوق ضرورتوں کے پیش نظر ہٹلر نے ریاست کو عملی لحاظ سے ایک اعلیٰ مقام عطا کر دیا۔ اور نازی یہ جانتے تھے کہ قومی وقار کے لئے قومی اتحاد بنیادی حیثیت رکھتا ہے ہٹلر نے اس بات کی پرزور تائید کی کہ فرد تنہا کچھ بھی نہیں ہے جبکہ معاشرہ ایک طاقتور حیثیت رکھتا ہے۔

ہٹلر نے افراد کے حقوق میں کمی کر دی لیکن اس کے فرائض میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

ایک مفکر نے ریاست کے تصور میں کہا کہ اس میں شخصی ذمہ داری خودارادیت مقصدیت اور خودمختاری جیسی صفات پائی جاتی ہیں جبکہ اس کے برخلاف جرمن ریاست میں وفاداری، فرماں برداری نظم و ضبط اور نفس کشی جیسے اصول نمایاں طور پر ریاست میں نظر آتے ہیں۔ جرمن نازیت کے نظریہ میں جرمن کے افراد کو کوئی مقام حاصل نہیں بلکہ اس کو وطن اور اجتماعی مفادات کے لئے اپنی ذات کو قربان کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اس سے مراد یہ کہ فرد کو اپنی ذات کے لئے کچھ کرنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اپنی مرضی کے مطابق آزادی سے لطف اندوز اور فائدہ حاصل کر سکتا ہے بلکہ اس کو متحد ہو کر تمام افراد کی خوشیوں کو مساوی طور پر بانٹنے کی تگ و دو میں لگے رہنے کی تلقین کرتا ہے نازی تحریک کے نزدیک ریاست کی جبری خدمت ہی حقیقت میں مکمل آزادی کی ضامن ہے نازی ازم کا خیال ہے کہ اس طرح کے اصول جرمن ریاست کو پورے عالم میں بلند کر سکنے میں کامیاب ہوں گے جس میں جرمن قوم اور افراد کی حیثیت ریاست کی نسبت کم تر ہوتی چلی گئی۔ نازی جماعت معاشرے اور ریاست کے درمیان ایک اتحاد کی زنجیر تھی۔ جس نے لوگوں میں ایک قائد کے زیر سایہ مضبوط اتحاد قائم کرنے کی بھرپور جدوجہد کی۔

ریاست نے نازی جماعت کے منشور اور اس کے اصولوں کی حمایت میں اپنی حاکمیت کے اختیار کو استعمال کیا اور نازی جماعت کے نظریات کی تشریح کا ذریعہ بن گئی۔ اس طرح نازی جماعت

اور ریاست کا ایک دوسرے کا آئینہ بن کر سامنے آئیں جس میں کسی بھی دوسری تنظیم یا جماعت کے داخل ہونے یا شامل ہونے اور حصہ لینے کی بالکل گنجائش نہ تھی کیونکہ نظریہ نازیت کے حامیوں کا خیال تھا کہ اس طرح اگر دوسری جماعتوں کو بھی ریاست میں پروان چڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے تو قومی طاقت کے ختم ہونے کے امکانات واضح ہو جاتے ہیں۔

ہٹلر اور اس کے حواریوں نے جمہوری اداروں اور پارلیمانی جمہوریت کی بے انتہا مخالفت کی۔ دراصل وہ قومی اتحاد و یکجہتی کے خواہش مند تھے ان کا خیال تھا کہ باہمی اتحاد ترقی کی منزل طے کرانے کا آسان اور سہل طریقہ و راستہ ہے۔

اس لئے ملک کے اندر کسی طرح کی مخالفت ریاست کے لئے نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ نازی تحریک درجاتی نظام کی قائل تھی' اس کے اصول کے مطابق نظام حکومت اوپر سے نیچے کی طرف تعمیر کیا گیا تھا۔ قومی قیادت جمہوری اور ذمہ دار ہونے کی بجائے طاقت کے بل بوتے پر قائم تھی۔

تصور نازیت کے مطابق ریاست میں چند لوگ اہم ہوتے ہیں جو صرف حکمرانی کے لئے جنم لیتے ہیں اس لئے معاشرے کے دوسرے افراد کا فرض اولین ہے کہ وہ ان کی اطاعت کریں پیروی کریں اور ان کے احکام کو قانون کا درجہ دیں۔

اس لئے نازی جماعت ہٹلر کو جرمن ریاست میں ایک آمر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ اور اس تنظیم کا خیال ہے کہ ہٹلر کے احکامات ہی قانون ریاست ہیں۔

تمام ریاستی اداروں پر اس کا اختیار ہے اور وہی تمام اہم سرکاری عہدیداروں کو نامزد کرتے ہیں اور ان تمام عہدیداروں کا کا فرض ہے کہ اس کی وفاداری میں کوئی کمی نہ کریں۔ طوفانی دستے اور محافظ جو نازی تنظیم کی حفاظت و بقاء کے لئے تشکیل دیئے گئے تھے اور جن کی مدد سے نازی پارٹی برسراقتدار آئی تھی۔ ان کی تنظیم فوجی انداز میں ہوئی تھی اور وہ قومی قائد کے محافظ تھے۔

فوجی دستے ہٹلر کے اتنے وفادار ثابت ہوئے کہ اس کے حکم کو بلاچوں و چرا قبول کرتے اور ان کی تربیت اس انداز میں کی گئی کہ ان کی فطرت میں انکار نام کی کوئی چیز نہ تھی وہ ہٹلر کے حکم پر خودکشی تک کرنے کو تیار تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں پارٹی حاوی تھی۔ صوبائی اور ضلعی احکام نازی پارٹی کے رکن ہوتے تھے۔ جنہیں ہٹلر' وزیر داخلہ کی سفارش سے متعین کرتے تھے۔ پرانی ٹریڈ یونین کو ختم کر کے ان کی جگہ مزدوروں کی نازی تنظیمیں قائم کر دی گئیں تھیں جو نازی اصولوں کے مطابق عمل پیرا تھیں نازی جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ حتیٰ کہ ذاتی امور میں بھی ان کی مداخلت شامل تھی یہ بات غیر معمولی نہ تھی کہ اولاد اپنے والدین کے خلاف اور والدین اپنی اولاد کے خلاف گواہی دیں کہ انہوں نے نازی اصولوں کی کہاں خلاف ورزی کی۔ ملک میں نازی ازم نے نوجوانوں کے لئے کئی یوتھ تنظیموں کا انتظام کیا۔ جو نازی تحریک میں اہم حیثیت کی حامل تھیں۔

نازی تحریک کا جرمنی میں اصول اتنا کڑی اور کلیت پسند تھا کہ عوام میں شہری حقوق کا جذبہ

ہی ناپید ہو کر رہ گیا۔ میدان جنگ میں کوئی جرمن فوجی کتنا ہی بہادری کا کام انجام دے چکا ہو وہ اپنے حاکم وقت کے خلاف کسی بھی غیر اخلاقی جرات کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

معاشرے کے افراد و افواج کی تربیت اس قدر کڑی ہو چکی تھی کہ وہ بغیر اپنا قصور جانے قید و بند کی تکالیف سہنے کو تیار رہتا تھا' ارتکازی کیمپوں کو ذلت آمیز سمجھنے کی بجائے تہذیب و تمدن کا زیور قرار دیتا تھا جہاں حقیقی زندگی کے بارے میں افراد کی کڑی تربیت ہوتی تھی۔ ریاست کی نمایاں خوبی انصاف اور اخلاق پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کی طاقت بھی نازی تحریک Might is Right کے اصول پر کاربند تھی۔

انیسویں صدی میں ایک پروفیسر نے کہا کہ ریاستوں کے درمیان طاقت کے حق کے سوا اور کوئی قانون حائل نہیں ہو سکتا ہٹلر نے ان خیالات کی ترجمانی اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح کی کہ

کہ جو ریاست میں زندہ رہنے کا خواہش مند ہے اسے لازمی طور پر لڑنا ہوگا جو اس دنیا میں جدوجہد سے منہ پھیر لے اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

ہٹلر اور نازی تحریک نے جنگ و جدل کو انسانیت کے وقار کا ذریعہ اور ترجمان قرار دیا ہے چونکہ اس کا خیال ہے کہ یہ انسانی ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جنگ فطری عمل ہے اگر جنگ کو روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ فطری اصولوں سے انحراف کرنے کے مترادف ہے ہٹلر نے اس بناء پر جرمن فوج کو جنگ کی تیاریوں میں مصروف رکھا اور دوسرا اعلان کیا کہ وہ امن کے حامی ہیں اس بناء پر ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ہمارے رویے کو صرف ایک پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے اور وہ امن اور شدید محبت کا پیمانہ ہے۔ نازی ازم کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ امن کا نعرہ اس بناء پر لگایا گیا تاکہ دشمن کو مغلوب کرنے میں آسانی ہو۔ اور دشمن اس کی طرف سے لاپرواہ ہو جائے۔ لیکن جیسے ہی ہٹلر نے محسوس کیا کہ جرمن قوم فوج طاقت سے لیس ہو چکی ہے اس نے اپنی فوجی طاقت کو آزمانے کا تہیہ کرلیا۔ اور جنگ کے ابتدائی ایام میں یہ کہا گیا کہ جرمنی فوج کا مقصد خلاف معاہدہ ورسیلز کو ختم کرکے تمام جرمن باشندوں کو ایک ریاست کے جھنڈے تلے جمع کرنا ہے۔ اس طرح نازی تحریک جلد ہی تمام جرمن اقوام کی تحریک بن کر ابھری۔ جرمن کے وہ تمام ملیتی باشندے، جو جنگ عظیم اول کے دوران آسٹریا۔ زیکو سلاوئیہ اور پولینڈ کے علاقوں میں رہائش پذیر تھے نازی جرمن کے ساتھ حمایت کا اعلان کر دیا۔ جس کی وجہ سے ہٹلر نے ان تینوں ممالک کو فتح کرلیا۔ لیکن جب ہٹلر کے ہوس اقتدار میں اضافہ ہوا تو وہ فاتح عالم کے نشے سے سرشار ہونا چاہتا تھا اور اس نے حیلے بہانے سے ناروے' ڈنمارک' بلجیم' یونان اور فرانس ہالینڈ اور البانیہ رومانیہ جیسے یورپی ممالک پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ پھر اپنی حاکمیت کے نشے میں اتحادی طاقتوں کو الٹی میٹم دے دیا کہ معاہدہ ورسیلز کی رو سے جو بیرونی مقبوضات جرمنی سے لے گئے تھے۔ انہیں خودبخود واپس کر دیں اس نے جرمنی سے لوٹے گئے املاک و اموال کی واپسی کا بھی مطالبہ کیا۔ پھر ہٹلر نے مختلف علاقوں پر قبضے کا یہ جواز نکالا کہ جرمن قوم آبادی کے لحاظ سے کثیر ہے جبکہ اس کے پاس جغرافیائی لحاظ سے علاقہ

لم ہے لہٰذا وہ اپنے علاقے میں اضافے کی خواہش مند ہے نازی تحریک نے امپیریلزم [illegible] اختیار کرلیا۔ اور عالمی امن میں جنگ کا خطرہ ایک اٹل حقیقت بن گیا۔

جرمن قوم اور ہٹلر نے عالمی سطح پر اپنی قومی برتری ثابت کرنے کے لئے نسلی [illegible] کا نظریہ تشکیل دیا۔ انہوں نے خود آریہ نسل کی نارڈک شاخ سے تعلق رکھنے کا دعوی کیا اور جرمن علاقوں سے غیر آریاؤں کا صفایا کر دیا۔ اس نظریہ اور تصور کے تحت سب سے پہلے یہودی ہٹلر کے عتاب کا شکار ہوئے۔ یہودیوں کی نسل کشی کے لئے ان پر شدید قسم کے الزام عائد کئے گئے۔

ہٹلر نے اپنے اقتدار کے ابتدائی ایام میں کہا تھا کہ اے جرمن کے باشندو تم [illegible] کے رفیع لوگوں میں سے ہو۔ کیونکہ تمہاری رگوں میں جرمن نارڈک اور آریائی خون کے جیسے موتی ہیں لیکن آج تم غربت کا شکار ہو۔ افلاس تمہارا مقدر بن چکی ہے تمہیں معلوم نہیں کہ مستقبل میں خوراک کس طرح میسر آئے گی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دوران جنگ تمہاری ریاست کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے جو ایک ناممکن بات ہے کیونکہ جرمن افواج تو ناقابل تسخیر ہے اس [illegible] شکست کی وجہ یہودیوں کی غداری ہے جو مارکس ازم کے پجاری ہیں۔ دراصل یہودی ہماری بدنصیبی کا علامتی نشان ہیں لہٰذا یہودیوں کو جرمن سے جانا ہوگا۔

پھر یہ نعرہ شہرت حاصل کر گیا کہ ”یہودی ہماری بدنصیبی ہیں اور ہٹلر ہمارا نجات [illegible]“

ہٹلر نے جنگ عظیم اول کی شکست کا سبب یہودیوں کو قرار دے کر ان پر مصائب و الم کے پہاڑ گرا دیئے ان کی نسل کشی اور ان کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش ہٹلر کے ان مظالم کی داستان بیسویں صدی میں دوبارہ ملنا مشکل ہے۔ نازی تحریک کے علمبرداروں کا خیال تھا کہ انسانی تہذیب کی ترقی میں آریاؤں نے قابل قدر خدمات سرانجام دیئے ہیں ان کا خیال تھا کہ آریاؤں کے علاوہ باقی دنیا کی تمام تر نسلیں کم تر درجہ رکھتی ہیں ہرمن گاش نے غیر نارڈک انسان کو نارڈک انسان اور بندر کی درمیانی کڑی قرار دیا۔ اس کا خیال ہے اس بناء پر وہ ایک نامکمل انسان ہیں اس پروفیسر نے یہ بھی اعلان کیا کہ غیر نازی اپنے نسلی تفوق کے دعوؤں میں یہ حقیقت نظرانداز کر گئے کہ دنیا میں کوئی نسل خالص نہیں یہاں تک کہ خود جرمن قوم کی نصف سے زائد آبادی نارڈک نسل کی پیداوار نہیں اس وجہ سے خالص نسل کی حفاظت کے لئے نسلی اختلاط کے عمل کی مخالفت کی گئی۔

اگر دو تین نسلیں پیچھے بھی جرمن کا کوئی باشندہ یہودی خون کی آمیزش کا شکار ہوتا تو اس کو بھی سرکاری عہدے کا اہل نہ سمجھا جاتا' یہاں تک کہ اگر اس کی بیوی کے خون میں یہودی خون کی آمیزش کا شبہ ہوتا تو خاوند کو اس کی پاداش میں ملازمت سے برخاست کر دیا جاتا۔ ہٹلر نے جرمن عورتوں کو اہمیت عطا کی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خالص نارڈک بچے پیدا کر کے اپنی نسل میں اضافہ کا سبب بنیں۔ ہٹلر نے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مذاہب کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ کیونکہ ہٹلر کا خیال تھا کہ یہ بین الاقوامیت اور غلامانہ اخلاق کے اضافے کا سامان ہیں جبکہ قدیم جرمنی کے مشرکانہ مذاہب کو بہت زیادہ پسند کیا جاتا۔ اس لئے ہٹلر کو اس مذہب کا ایک بہت بڑا پجاری

بھی بھایا جانے لگا۔ نازی تحریک کے حامیوں کا عقیدہ تھا کہ جس طرح خدا کی ذات واحد ہے اس طرح ہٹلر کی ذات بھی واحد ہے اور ہٹلر ایک پاکیزہ اور مقدس روح ہے اس لئے یہ خدا کی طرح ہے آقا و داتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک عظیم یسوع مسیح ہے۔

جرمن میں رہائش پذیر عیسائیوں پر اتنا دباؤ تھا کہ وہ اس طرح کے غلط نظریات کے خلاف آواز اٹھانے کی سکت بھی نہ رکھتے تھے اگر وہ ایسا کرنے کے مرتکب ہوتے تو پادریوں کے ارتکازی کیمپ میں ان کو جگہ دی جاتی۔ نازی ازم کی رو سے جرمن عورتوں کی پوری حیات اپنے بچوں کو جنم دینے کے لئے وقف ہونی چاہئے جبکہ اس کے مقابل جرمن مردوں کو اپنے مستقبل کے نونہالوں کو سنوارنے کے لئے میدان جنگ میں فرائض انجام دینے چاہئیں۔ اور عورتوں کو اس وقت اعلیٰ ترین تمغے سے نوازا جاتا جب اس کی اولاد میدان جنگ میں جاتی۔ ہٹلر کا خیال تھا کہ عورتوں کی تعلیم میں جسمانی صحت پر سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہئے۔ جبکہ روحانی اقدار اور اطوار کی طرف بعد میں راغب کرنا چاہئے اس کا فیل تھا کہ ذہنی ارتقاء تعلیم نسواں کا آخری مرحلہ ہونا چاہئے اس تعلیم کا مقصد تعمیر ماں بننے کی طرف راغب کرنا تھا۔ بعض نازی تحریک کے حامیوں نے تو ناجائز جنسی تعلقات کا عام پرچار کیا۔ اسقاط حمل کو جرمنی میں جرم قرار دے دیا گیا۔ اور زیادہ سے زیادہ بچوں کی پیدائش پر زور دیا گیا۔ ہٹلر نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک شادی نہ کی لیکن اس کے باوجود وہ آبادی میں اضافے کا قائل تھا۔

نازی تحریک کے علمبرداروں کا خیال تھا کہ معاشی امور میں بھی انفرادی مفادات پر اجتماعی مفادات کو فوقیت دی جائے۔ اور نازی تحریک نے جرمن باشندوں کو خود کفیل بنانے کی غرض سے خالص سرمایہ داری اور اشتراکیت کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ دونوں نظام لوگوں کو متضاد طبقات میں تقسیم کرنے کا سبب بنتے ہیں ریاست کا سرمایہ داروں اور مزدور طبقہ پر مکمل کنٹرول تھا ملک سے باہر کسی طریقہ سے بھی رقم نہیں بھیجی جاتی تھی۔ اقتصادی امور کے تمام شعبہ جات مثلاً صنعت، تجارت بنک وغیرہ اقتصادی امور کے وزیر کے زیر نگرانی اپنے امور کو انجام دے رہی تھیں۔ ملک کے اندر ہر قسم کی تالہ بندی اور ہڑتال کی مکمل ممانعت تھی، معاوضہ اور مصنوعات کی قیمت مقرر کر دی گئی۔ بے روزگاری کے خاتمہ کا حل یہ نکالا گیا کہ ہر بے روزگار کو فوج میں بھرتی کر کے اس کو فوجی تربیت دی جانے لگی۔ ملک کے اندر رفاہ عامہ کے سلسلے شروع کیا گیا۔ اور ترقی کی منازل پر گامزن کرنے کے لئے ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا۔ نئی نئی جدید عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ پچیس برس سے کم عمر نوجوانوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا گیا جبکہ ۲۵ برس کے بعد کی عمر روزگار کی تلاش کے لئے مقرر کر دی گئی۔ گھریلو ملازم رکھنے پر انکم ٹیکس کی چھوٹ دے دی گئی۔ اور تمام روزمرہ کے استعمال کی اشیاء پر راشن بندی کر دی گئی۔ تاکہ خوراک کا خرچ کم ہو جائے۔ اور اسلحہ سازی کے لئے زیادہ رقم حاصل ہو سکے۔ المختصر یہ کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل جرمنی نے اپنا مکمل اقتصادی نظام ملکی حالات کے تابع کر لیا۔

ہٹلر کی آمریت کے ذریعے نازی اصولوں کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ ہٹلر ایک ایسا شخص تھا جو نہ صرف باعمل انسان تھا بلکہ اس کے خواب بھی بلند تھے اس کا خیال تھا کہ وہ سسکتی ہوئی دنیا کی سمت کو بدل دے گا۔ اس نے اپنی صحت کو درست رکھنے کے لئے شراب گوشت اور تمباکو جیسی چیزوں سے اجتناب برتا۔ جو خوبیاں اس کے اندر سموئی ہوئی تھیں وہ ایسی ہی خوبیاں اپنے ساتھیوں کی ذات میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جس طرح اس نے اپنی زندگی ملک و قوم کی فلاح کے لئے وقف کر رکھی ہے اس کے حواری بھی اس پر عمل پیرا ہو کر خود کو وطن اور قوم کی فلاح کے لئے وقف کر دیں۔ وہ ایک کرشماتی شخصیت کا حامل تھا۔

اس کی شعلہ بیانی لوگوں کو متاثر کرنے کا سبب تھی اس کی اوصاف نے اس کو [illegible] کے نزدیک ایک خدا کا درجہ دے دیا تھا۔ ہٹلر ایک مضبوط ادارے کا اٹل انسان تھا۔

اس کے ہم عصروں میں سے ایک پروفیسر کا خیال تھا کہ ہٹلر کے بولنے کا انداز تحکمانہ تھا۔ وہ بحث سے گریز کرتا تھا۔ وہ چلنے کی بجائے پھلانگنا پسند کرتا تھا نازی تحریک ہٹلر کے لئے ایک منظم جماعت ثابت ہوئی جس نے ہٹلر کے نظریات و احکامات کا واضح طور پر پرچار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جرمنی میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جس نے زندگی کے ہر موڑ پر نازیت کا اثر محسوس نہ کیا ہو بچے جوان صنعت کار، عورتیں، مزدور غرض یہ کہ ہر طبقہ نازی ازم کے سحر انگیز اصولوں سے متاثر نظر آتا تھا۔

ہٹلر نے پروپیگنڈے کو موثر انداز میں ترقی دی یہی وجہ تھی کہ گوئبلز گورنگ اور [illegible] جیسی ہستیاں منہ سے کوئی لفظ نکال دیتیں تو پلک جھپکتے ہی وہ لفظ ملک کے طول و عرض تک پہنچ جاتے ہٹلر بذات خود پروپیگنڈے کا ماہر سمجھا جاتا تھا اس کا خیال تھا کہ پروپیگنڈا جتنا نچلی ذہنی سطح پر کیا جائے اس کے اثر اتنا ہی زیادہ لوگوں پر پڑتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

جرمن ذرائع مواصلات اور گرجا، سکول، ریڈیو، آرٹ، فن سائنس مصوری [illegible] غرض یہ کہ تمام ذرائع ابلاغ کو نازی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا ہر جرمن باشندہ ایک دن میں پچاس سے ایک سو پچاس دفعہ ہیل ہٹلر کے الفاظ دہراتا۔

اس طرح نازی کلیت پسند نظریے نے جرمن اقوام کی تمام حیات پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ اور جرمن قوم نازی ازم کو نہ صرف پسند کرتی بلکہ ان کو ہٹلر کے احکام ماننے کی ترغیب بھی دیتی تھی۔ ہٹلر اس طرح نازی تحریک کے ذریعے جرمن قوم کا مختار کل بن کر پورے عالم کے سامنے پیش ہوا۔

سوال: نازی ازم کے بنیادی اصول بیان کریں۔ 1996ء

نازی ازم کے بنیادی اصول

Basic Principle of Nazism

جواب: نازی ازم نے ریاست پر حکمرانی کے لئے جو اصول نامزد کئے ان میں درج ذیل اصول نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

نسلی تفوق:

نازی نظریہ کے حامل افراد و کارکن شدید قوم پرست نظریے کے حامل تھے۔ لیکن نازی ازم قوم سے مراد صرف جرمن باشندے لیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جرمن باشندے باقی اقوام پر برتری اور فوقیت رکھتے ہیں۔ جرمن قوم آریاہ۔ نارڈک اور نیوٹن نسل کی حامل تھی۔ اور یہ نسلیں جرمن باشندوں کے نزدیک برتر صلاحیتوں کی حامل تھیں۔

ایک جماعتی نظام One Party System:

اگر نازی ازم کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ نازی ریاست یک جماعتی نظام کی حامی تھی۔ اس کا قائد ہٹلر تھا نازی جامعت کے علاوہ جرمنی میں دیگر جماعتوں کا قلع قمع کر دیا گیا اور دوسری نئی جماعتوں کی تشکیل کو ممنوع قرار دیا۔ نازی ازم کا خیال تھا کہ ریاست کو مستحکم کرنے کے لئے ملک میں صرف ایک جماعت۔ ایک ریاست ایک قائد کو ہونا چاہئے۔ یہی وجہ تھی کہ جرمنی میں صرف ایک جامعت نازی پارٹی کے نام مشہور تھی جس کو حکومت کے تمام اداروں سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ ریاست کے اندر تمام بڑے عہدے نازی پارٹی کے کارکنوں میں تقسیم کر دیئے گئے نازی پارٹی کے تمام اراکین کو ملک کے اندر کئی مراعات حاصل تھیں ان مراعات میں سفری سہولت مفت شامل تھی۔ اس کے علاوہ ان کی ملازمت کا بھی بندوبست کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نازی اراکین کو ملک کے اندر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

کلیت پسند ریاست Tetaltariam State:

نازی تحریک ریاست کی ہمہ گیریت اور کلیت پسندی کی قائل تھی، نازی تحریک کے نزدیک اجتماعی طور پر فرد طاقتور ہے لیکن انفرادی طور پر کچھ بھی نہیں۔ ریاست قوم کا ایک عظیم مقصد ہے اور فرد اس کے حصول کا ذریعہ۔ نازی ریاست مطلق العنانیت پر کامل یقین رکھتی ہے اور ملک کے اندر اختلاف رائے کو قطعی پسند نہیں کرتی۔ یہ انفرادی اور اجتماعی معاشرتی و معاشی زندگی کے تمام پہلوؤں کی زخود عکاسی کرتی ہے۔

نازی امپریلزم Nazi Imperilism :

ہٹلر اور اس کی جماعت جرمن شکست کے بعد اپنے مقبوضات کے حصول کا ارادہ لے کر معاشرتی سطح پر ابھر کر سامنے آئی۔ نازی تحریک ملک کو وسعت دینے کی خواہش مند تھی اور قوم کو آباد کرنے کے لئے نئے علاقوں کے خواہش مند تھے۔

چونکہ ان کو آبادی میں اضافے میں فائدہ نظر آتا تھا اس کے لئے ایک وسیع علاقے کی ضرورت تھی۔ نازی تحریک Livingspace زندہ رہنے کے لئے جگہ" کے اصول کو Leben Spraun کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ ہٹلر کے نزدیک جب تک ایک مستحکم سیاسی ادارہ وجود میں نہیں آجاتا۔ اقتصادی ترقی ایک ناممکن بات ہے۔ ہٹلر جرمن قوم کو تمام عالم پر چھایا ہوا دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ کیونکہ ہٹلر کا خیال تھا کہ جرمن قوم تمام اقوام سے افضل ہے اور وہی حکومت کرنے کی اہل ہے۔

ریاست اور قوم کی بڑائی Dignity of State and Nation

نازی تحریک نے اپنی تشکیل و کامیابی کے بعد ریاست اور قوم کو ایک افضل مقام دیتی ہے۔ اور ریاست کو فوق البشر صفات سے نوازتی ہے۔ ریاست اور قوم کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ معاشرے کو فرد پر ترجیح اور برتری دے دی جاتی ہے نازی تحریک کا خیال ہے کہ ریاست قادر مطلق ہے اور فرد اس کی فرماں برداری اور تابع فرمانی کر کے ہی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

نازی جنگ Nazi War :

نازی تحریک ملک کے اندر جنگ کو نہ صرف ایک فطری امر قرار دیتی ہے بلکہ جنگ و جدل کی تعریف و توصیف میں ہمیشہ رطب اللسان رہی۔ نازی تحریک کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب کی ترقی کے لئے جنگ ایک لازمی امر ہے۔ اس سے ان کا خیال ہے کہ جرمن باشندوں کو ہر صورت میں جنگ میں حصہ لینا چاہئے۔ اور جو جرمن باشندہ جنگ سے کتراتا ہے اس کے بارے میں نازی جماعت کا خیال ہے کہ اس کو معاشرے میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

قومی قیادت National Leadership

جرمن فیورر جو کہ ہٹلر تھا اس کو اٹلی میں مسولینی کے ڈوس کے مقابل زیادہ بلند مقام حاصل تھا۔ اٹلی میں قائد اور عوام کے درمیان کارپوریشن کی تنظیمیں رابطے کا کام کرتی تھیں لیکن جرمنی میں قائد اور عوام کے درمیان ہٹلر کے اپنے منتخب کردہ نمائندے رابطے کا کام کرتے تھے جرمنی میں ہٹلر بطور فیورر ہر طرح کی غلطی اور تنقید سے مبرا تھا۔ اس کا ہر قول و فعل حقیقت کی ترجمانی کے مترادف

خیال کیا جاتا۔ ملک کو لائق پرستش تصور کیا جاتا۔ اور اس کی تابع فرمائی کرکے فخر محسوس کرتے تھے۔ فرض شناسی تنظیم اور ایثار بازی کا بنیادی ماٹو تھا۔ نازی تحریک ایک ریاست ایک قائد کے اصول پر کاربند تھی ہٹلر کو مذہب کا بانی بھی کہا جانے لگا۔

فاشیت اور نازیت کے مابین تنقیدی جائزہ

Critical Evulientiion

روسو میں کلیت پسند ریاست میں ایک خاص طبقے کی آمریت قائم کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اس بناء پر فاشیت اور نازیت شخصی آمریت کی اہم اور بنیادی مثالیں ہیں۔

نظریہ فاشیت اور نظریہ آمریت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا یہ ملک کے عام باشندوں کو جذباتی احساسات کے ذریعے اپنے اصولوں کا پیروکار بناتی رہی۔ نازی تحریک اور فاشی تحریک نے یکساں طور پر منفی رویہ جات سے استفادہ حاصل کر کے اقتدار تک اپنی راہ ہموار کی اور دونوں تحریکوں کا انجام دوسری جنگ عظیم کے بعد خاتمہ پر ہوا۔ دونوں تحریکیں اپنے اپنے انداز میں لوگوں کے جذبات سے کھیل کر ان کو گمراہ کرتی رہیں اور باغی خیالات ان کے اندر ابھارتی رہیں۔ اس کے منفی رویہ کی بناء پر بعض مفکرین نے اس کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اور بتایا کہ ایسی کلیت پسند ریاست کی حقیقی خامیاں کیا ہوتی ہیں

ان خامیوں میں چند ایک خامیاں درج ذیل ہیں۔

جارحانہ طریق کار:

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ نظریہ نازی اور نظریہ فاشی کا حقیقت میں کوئی اپنا فلسفہ اور اصول نہ تھا یہ صرف ایک نظام کے زیر اثر وجود میں آئیں ان کا بنیادی مقصد تشدد اور جارحیت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنا تھا۔ یہ دونوں نظریات اس بات کے قائل تھے کہ ریاست کی بناء پر منشائے عامہ کی رائے کی بجائے جبرو تشدد پر رکھی جائے۔ پروفیسر جذ حرمن کا خیال ہے کہ ایک بار ریاست پر اکثریت کی حکومت قانونی مساوات عوامی رضامندی اور فرد کی خوشی اور آزادی جیسے جمہوری اصولوں کو چھوڑ دیا جائے تو پھر یہ اصول اور عناصر ریاست کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس پر ظلم و جبر جنگ و جدل کے ذریعے اختلاف رائے کا خاتمہ کر دے اور کسی دوسرے نظریے کو نہ ابھرنے دے ان دونوں تحریکوں کا طریق اقتدار بے حد جارحانہ تھا۔ دونوں جنگ کو ریاست کے لئے ایک لازمی امر قرار دیتے ہیں اور ظلم و تشدد کو پسند کرتے ہیں۔

آمرانہ رویہ :

اگر نازی تحریک اور فاشی تحریک کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں تحریکیں چند افراد کی حکومت کی قائل ہیں یا پھر ایک قائد ایک حاکم کی آمریت کو پسند کرتی ہیں یہی وجہ تھی کہ جرمنی اور اٹلی دونوں ممالک میں صرف ایک جماعتی نظام نظر آتا ہے جو کہ حکومت پر اپنا تسلط قائم کئے ہوئے ہیں اور ریاست کے اندر اپنی موجودگی میں کسی دوسری تحریک کی تشکیل اور کسی دوسری تنظیم کے قیام پر کڑی تنقید کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک دوسری جماعت کی بنیاد معاشرے کے لئے نقصان دہ ہے اس لئے قانونی لحاظ سے اس کو ممنوع قرار دے دیا۔

اور پھر سارے ملک کے اختیارات فرد واحد میں منتقل کر کے اس کو آمر کی حیثیت دے دی۔ ان دونوں نظریات کی رو سے آمر مطلق العنان اور مختار کل تھا۔ دونوں نظریات اس بات پر متفق تھے کہ انسانیت کم ذہنیت اور کم عقلوں پر مشتمل ہے لیکن یہ اصول جمہوریت کے بالکل منافی ہے۔ آج کل عوام میں تعلیم ثقافت تمدن اور علوم و فنون کو زیادہ پھیلایا جاتا ہے۔ اس لئے سیاسی اشرافیہ کی امداد میں کوئی گنجائش نہیں یہ نظام جامد معاشروں کے لئے مناسب ہو سکتا ہے لیکن متحرک معاشرے کے لئے ناموزوں ہے کیونکہ جدید دور بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے اس لئے جدید معاشرے کے لئے آمرانہ نظام مناسب نہیں۔

خوف و ہراس اور فوجی طاقت :

کلیت پسند ریاست میں کسی فلسفے اور سیاسی اصول کی گنجائش نہیں اور کانفرنس بحث و مشورہ و فکر کی جگہ حکمران طبقے کے آہنی عزم اور عوام کی اطاعت و فرماں برداری کو اہمیت دی جاتی ہے۔ نظریہ نازیت اور فاشیت کی مثالی ریاست ایک ایسی قومی ریاست ہے جس میں داخلی نظم و ضبط پایا جاتا ہے اور جو مقبوضات حاصل کرنے کے لئے خارجی جارحیت کی پالیسی اختیار کرے غرض کہ ملک کے اندر اور باہر خوف و ہراس پھیلایا جائے اور جنگ و جدل کے ذریعے تباہی پھیلائی جائے۔

نفرت و تعصب پر انحصار :

تحریک فاشیت اور نظریہ نازیت نفرت و تعصب کی بنیاد پر پروان چڑھتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جنگ و جدل ہی زندگی کا دوسرا نام ہے یہ دونوں نظام کسی بھی دلیل کے قائل نہ تھے بلکہ جہالانہ توہم پرستی پر اعتماد رکھتے تھے' فوجی وردیوں' شعلہ بیاں تقریروں کے ذریعے لوگوں کو متاثر کیا جاتا تھا۔ اور فوجی جابر آمر اس نظام کے علمبردار خیال کئے جاتے تھے۔ اس نظام کے تحت نہ تو عوام الناس کو سیاسی امور میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی وہ حکومت میں حصہ لینے کی اہلیت رکھتے تھے۔

ناقدین کا خیال ہے کہ اس طرح تحریک فاشیت اور نازیت کے علمبرداروں نے ذہنی فراغ کی

راہ اختیار کی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو نظر انداز کر دیا۔ ایک پروفیسر کا خیال ہے کہ فاشیت کوئی فلسفہ نہیں بلکہ نفسیاتی رویہ ہے۔

ماحصل بحث :

اس نوعیت کا نظام حکومت کوئی قوم وقتی طور پر تو برداشت کر سکتی ہے لیکن جلد ہی اس سے اکتا جاتی ہے اس طرح دوسری طاقتیں کبھی بھی محکومی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتیں یہی وجہ ہے کہ فاشی تحریک اٹلی میں اور نازی تحریک جرمنی میں زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور اس کا اپنا مقدر تباہی اور بربادی بن گیا۔ اور اس کو دوسری اقوام نے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا۔
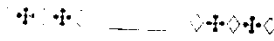
سوال: ایڈمنڈ برک کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں تفصیل سے بیان کریں۔ 1993ء

ایڈمنڈ برک

جواب: ایڈمنڈ برک ایک قدامت پسند انگریز فلاسفر تھا جس نے ۱۲ جنوری ۱۷۲۹ء کو ڈبلن کے مقام پر آئرلینڈ میں آنکھ کھولی۔ اس کے والد کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا جبکہ برک کی والدہ رومن کیتھولک عقیدہ کو ماننے والی تھی۔ چونکہ برک کا والد پروٹسٹنٹ عقیدے کو پسند کرتا تھا اس لئے برک نے بھی اس عقیدہ کی پیروی کی۔ برک نے اپنی زندگی کا قیمتی عرصہ مذہب کے پرچار میں بھی گذارا لیکن اس کی اندرونی کشمکش سے تنگ آ کر اس نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ آخر کار برک نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ۱۷۴۳ء میں ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ برک کے والد پیشہ کے اعتبار سے اٹارنی تھا چنانچہ اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا ایک مشہور وکیل بنے لیکن برک کی زیادہ توجہ مزید حصول تعلیم کی طرف تھی۔ اگرچہ اس نے قانون کی ڈگری حاصل کی لیکن بعد ازاں مزید تعلیم جاری رکھی۔ برک کے والد کا خیال تھا کہ مزید تعلیم سے چھٹکارا حاصل کر کے برک اپنے روزگار کو تلاش کرے جب برک اپنے والد کی خواہش پر عمل نہ کیا تو برک کے والد نے برک کے تمام اخراجات پر پابندی لگا دی۔ لیکن برک نے معاشی بدحالی کو برداشت کیا اور اپنی مزید تعلیم جاری رکھی۔ ۱۷۵۶ء میں برک نے ایک ڈاکٹر کی بیٹی سے شادی کی۔ اور اپنے علم و خیالات کو کاغذوں میں جگہ دینے لگا لیکن چونکہ برک ایک مستقل مزاج شخص نہ تھا جلد ہی اس کام سے اکتا گیا اور ایک انگریز سیاستدان ولیم ہملٹن کے ہاں سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس دوران اس نے ایک رسالے کو جاری کیا جس میں کیتھولک فرقے کے ریورنڈ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس مخالفت کے سبب بعد ہی یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔

۱۷۶۵ء میں ولیم ہملٹن سے کشیدگی کے سبب نوکری چھوڑ دی اور لارڈ روکنگھم کے ہاں بطور سیکرٹری کام شروع کر دیا اور پھر اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر انگلستان کی پارلیمنٹ کی ممبرشپ اختیار کی اس وقت کی نامور پارٹی وِگ میں شمولیت اختیار کی یہاں پر اس نے پارلیمنٹ کا ممبر ہوتے ہی پارلیمانی مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے شاہی آئین کے حق میں اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کو سیاسی تاریخ میں ایک قدامت پسند مفکر کی حیثیت حاصل ہوئی۔

۱۷۹۴ء میں برک نے انگلستان کی پارلیمنٹ سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا اور ۸ جولائی ۱۷۹۷ء کو فوت ہوا۔ اور اس کی وصیت کے مطابق اس کو روایتی انداز میں دفن کیا گیا۔

تصنیف برک :

ک اپنی سیاسی قابلیت کی بناء پر سیاسی مفکر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا علاوہ ازیں برک ایک کامیب ا ب بھی تھا جس نے اپنے خیالات کو تحریر کی شکل دی اس کی تمام تحریر مقصدیت پر مبنی تھیں اس نے ہمیشہ اپنی تحریروں میں حقائق کو جگہ دی اور حقائق کو اجاگر اور آشکار کرنے کے لئے اس نے جرائد خطوط اور کتب تحریر کیں۔ ان تحریروں کی سچائی کی وجہ سے اس کا نام حقیقت پسند فلا رون صف میں شامل ہوگیا اس کی متعدد تحریروں میں تنقیدی رنگ نمایاں ہے اور یہ تنقیدی رویہ علم دب کی دنیا مین ایک انقلاب برپا کرنے کے لئے کافی تھا اس کی درج ذیل کتب نے شہرت حاصل کی

1- A vindiction of natural society (1756)

2- A Briogment of The History of England (1758)

3- Reflection of the franch Revolution (1789)

4- Thoughts on the cause of the Present (1790)

5- Appeal from the new to old weigh (1791)

6- Letters to the sherriff of Bristle (1792)

برک کا سیاسی فلسفہ

پس منظر

ک ایک اعلیٰ پائے کا سیاستدان بھی تھا اس کے علاوہ وہ اپنے حلقہ احباب میں ایک ادیب کی حیثیت سے بھی جانا جاتا تھا۔ پھر انگلستان وھگ پارٹی کے ذریعے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا انہی دنوں ٹوری پارٹی نو آبادیوں سے غیر منصفانہ سلوک روا رکھے ہوئے تھی اور حق طلب کرنے والوں کو ٹوری پارٹی غدار کے نام سے منصوب کر دیتی تھیں۔ جبکہ ان دنوں وھگ پارٹی حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہی تھی اور نو آبادیوں کے حقوق کے تحفظ کا ذمہ اپنے سر لے چکی تھی۔ وھگ پارٹی کے اراکین کا خیال تھا کہ نو آبادیوں کو حق کی آواز بلند کرنے پر غدار کے لقب سے مشہور کرنا ناانصافی پر مبنی ہے۔ بلکہ یہ ہی لوگ حقیقت میں آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں ٹوری پارٹی نے برسراقتدار آنے کے بعد نو آبادیوں کے لوگوں کو بھاری بھرکم محصولات کے بوجھ تلے دبا دیا اس قسم کے فعل پر وھگ پارٹی نے آواز بلند کی اور کہا کہ اس طرح کے بھاری محصولات نافذ کرنا سراسر زیادتی کے مترادف ہے انہی دنوں برک وھگ پارٹی کا رکن بن کر اس میں نمایاں امور انجام دینے لگا۔ جس کی وجہ سے

اس کو پارٹی میں نمایاں مقام حاصل ہوگیا برک ٹوری پارٹی کے جارحانہ رویے کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اس نے نو آبادیوں کے ساتھ سمجھوتہ کی متعدد سفارشات رقم کیں ہیں انگلستان میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور برک کے ساتھ عوامی ہمدردیوں میں اضافہ ہوا لیکن حکومت اور برسراقتدار پارٹی نے حزب اختلاف کی تجاویز سمجھ کر ان کو رد کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لمبا عرصہ تک نو آبادیات اور انگلستان کے درمیان جنگ و جدول کا سلسلہ جاری رہا۔ برک نے سیاسی نظریے کے تحت ان جنگوں کو نو آبادیات کا حق قرار دے کر جائز قرار دے دیا اس دوران وارن ہسٹنگز کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تو برک نے اس کی پالیسیوں کو غلط قرار دے کر اس کو نااہل قرار دے دیا۔

سوال: امریکی انقلاب اور آئین برطانیہ کے حوالے سے برک کے سیاسی نظریات بیان کریں 1996ء

برک اور امریکی انقلاب
Burke and Revoulution of America:

جواب: انقلاب امریکہ پر بھی برک نے نظرثانی کی اور کہا کہ امریکہ کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جسے ما...ائی اصولوں کے تحت کبھی بھی حل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سنگین مسئلے کے حل کے لئے معقول دانش مندی ضروری ہے۔ اس کا یقین کامل ہے کہ ظلم و بربریت کی پالیسی پر گامزن ہو کر کوئی بھی حکومت کامیابی اور فتح حاصل نہیں کر سکتا بلکہ حکومت کی کامیابی کا راز لوگوں کی ترقی اور خوشحالی میں پوشیدہ ہے۔ حقیقت میں برک غیر معمولی ذہانت اور سیاسی بصیرت کا حامل ایسا شخص تھا جو مکمل یقین رکھنے والا سیاسی مفکر تھا۔

برک کی سیاسی بصیرت کا اظہار اس بات سے ملتا ہے کہ برک نے دارالعلوم امریکہ میں ہی پارلیمنٹ کے سخت رویے کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا اور پارلیمنٹ پر واضح کیا کہ نو آبادیات پر ٹیکس نافذ کرنے کا حق پارلیمنٹ کو حاصل ہے مگر اس سے متعلق پالیسی اس قدر گھٹیا ہے کہ اس کی مثال نا مشکل ہے۔ اگرچہ برک خود ایک قدامت پسند مفکر تھا۔ لیکن امریکہ کے حالات کی وجہ سے وہ امریکہ کے معاملے میں خود کو ایک آزاد خیال سیاستدان گردانتا تھا۔ وہ فلسفیانہ اصولوں کا قائل نہ تھا بلکہ اس کی بجائے تجربہ و حکمت اور افادیت پر زور دیتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے صرف امریکہ پر ہی نہیں بلکہ آئرلینڈ اور ہندوستان کے معاملات پر بھی اپنے آزاد اور پرجوش نظریات کا اظہار کیا ہے اور دل کی گہرائیوں سے ان ملکوں کے حالات کو بہتر بنانے کی تگ و دو میں مصروف عمل رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی خیال کرتا رہا ہے کہ برطانیہ اپنی ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی پالیسیوں کو ختم کر دے۔ اس کے لئے وہ امریکی نو آبادیات، فرانس اور ہندوستان کے متعلق اپنے دانش مندی کے اصول سے انگلستان کی پالیسیوں اور کارروائیوں کا بھرپور جائزہ لیتا رہا ہے اور حق و انصاف پر مبنی پالیسیوں کی حمایت کی اور انسانیت کے خلاف استعمال ہونے والی کارروائیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا انہیں بے دردی سے کچلنے کی کوشش کی مگر برک ہر مسئلے کا حل اپنے اصول حکمت کے تحت کرنے کا خواہاں تا چنانچہ سیاسی مفکر کی حیثیت سے اس نے امریکی نو آبادیات اور انگلستان کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا کہ انگلستان پر برک کے نظریات و خیالات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا لیکن وہ وقت آن پہنچا انگلستان کو امریکی نو آبادیات سے ہاتھ دھونے پڑے۔

برک کے نظریات اور آئین برطانیہ
Theory of Burke's Constitution of Britain:

برک نے واضح کیا تھا کہ برطانوی آئین کی بنیاد رسوم و رواجات کے علاوہ روایات پر بھی

رکھی گئی ہے۔ جو بہت ہی سادگی اور اچھائیوں کا منبع ہے۔ اور کہا کہ برطانیہ وہ آئین جو بے حد بلند ار اور غیر تحریری ہے لوگوں کے خیالات و جذبات کی ترجمانی بڑے موثر انداز میں کرتا ہے۔ اس آئین کی مزید خوبی یہ ہے کہ حالات و واقعات کے تحت اس میں تبدیلی بھی کی جا سکتی ہے۔ برک کا خیال ہے کہ اس آئین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے برطانوی اقتدار کو کئی بار انقلابی آب و ہوا سے بچائے رکھا۔

چونکہ برطانوی آئین نے ارتقاء کے تمام مراحل طے کئے ہیں اور برک برطانوی آئین جو اس میں قدیم اداروں اور روایات کے ہونے کی وجہ سے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے برک کی قدامت پرستی کا اندازہ ہم اس کے برطانوی آئین کے تحفظ سے اچھی طرح لگا سکتے ہیں کہ وہ کس طرح برطانوی آئین کو محفوظ رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ برک کا خیال ہے کہ برطانوی حکومت کو جارج سوم کے رویے اور طرز حکومت کی وجہ سے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جارج سوم نے اپنے اثر و رسوخ کو زیادہ موثر کرنے اور پارلیمنٹ کے اختیارات کو کم کرنے کی بڑی تگ و دو کی وہ انگلستان کے آئین کی اہم خوبی اس کی غیر تحریری حالت کو گردانتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ برطانیہ کا آئین دنیا کا سب سے مثالی آئین ہے جو وقت اور حالات کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے اس کے ساتھ ہی برک تاکید کرتا ہے کہ برطانوی آئین کو دنیا کے دوسرے ممالک اپنانے کی ہرگز کوشش نہ کریں کیونکہ اس کا خیال ہے کہ ممکن ہے یہ آئین دوسرے ممالک کے طرز حکومت کو فائدہ نہ دے اور پھر اس سے قوم کو نقصان ہو۔

برک چونکہ ایک قدامت پسند مفکر ہے اس لئے وہ انگلستان کے بالغ رائے دہی کے اصول کو پسند کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ یہ انگلستان کے ماحول کے لئے بالکل مناسب ہے۔ اس کا خیال ہے کہ برطانوی آئین میں کسی بھی رد و بدل کی ضرورت نہیں اور برک برطانوی آئین میں عوام کے حق جائیداد پر بھی زور دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حق ملکیت انسان کا فطری حق ہے اور حکومت سے اپیل کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنیادی حق ملکیت پر زبردستی اپنا تسلط قائم کرنے کی ہرگز کوشش نہ کریں بلکہ جہاں تک ممکن ہو حکومت اس کا مکمل تحفظ کرے۔ اس کا خیال ہے کہ حقوق ملکیت میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے اثرات عوام پر مرتب نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ عوام کے لئے یہ اثرات نقصان کا باعث ہو سکتے ہیں اگر حقوق ملکیت میں اصلاحات کی جائیں تو وہ ماضی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہونی چاہئیں اسی لئے برک اصلاح پر اس قدر زور دیتا ہے جس قدر ہو اس کا تحفظ کرے۔ برک ایک سیاسی مصلح ہونے کی حیثیت سے اقتدار کے احترام کے ساتھ آزادی کو بھی پسند کرتا ہے اگرچہ وہ جدید روشن مستقبل کا خواہاں ہے لیکن ماضی سے بھی اپنا رابطہ منقطع نہیں کرتا اگرچہ برک جمہوریت کو پسند نہیں کرتا لیکن وہ عوامی اقتدار کی تائید کرتا اس کے نزدیک فرد اور افراد کے درمیان معاشرے کے حاکم اور محکوم کی تقسیم بالکل درست ہے برک ریاست کو ایک مذہبی ادارہ بھی تصور کرتا ہے مگر

اس کے وجود نظریہ ربانی کا مخالف ہے یہی وجہ ہے کہ وہگ- پارٹی کے ممبران نے انقلاب قرآنی اور انگریزی انقلاب ۱۶۸۸ء کو برابر قرار دیتا تھا لیکن برک نے اس کی نفی کی ہے-

برک کی بنیاد پرستی : Burke's Fundamentalism

برک کو قدامت پسند مفکر کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ برک زمانے کے بدلتے ہوئے دھاروں کے ساتھ ساتھ چلنے کا قائل تھا لیکن اس کے باوجود قدامت پسندی کے حصار سے باہر نہ نکل سکا- یہی وجہ ہے کہ اس کے اکثر نظریات اس کی قدامت پسندی کو ظاہر کرتے ہیں برک سیاسی اداروں میں تبدیلی کا خواہاں تھا لیکن وہ یہ تبدیلی وقت کے ساتھ ساتھ اور نہایت احتیاط سے لانا چاہتا تھا- برک انقلابی تبدیلیوں کا حامی نہیں ہے لیکن وہ ان میں قدرے تغیرات کا حامی ضرور تھا شاید وہ انگلستان کے حالات کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور تھا یہی وجہ ہے کہ برک کو انقلابی نظریہ سے الگ کر دیا گیا ہے برک معاشرے کے تمام افراد مخلص اور خیر خواہ دوست تھا- وہ مظلوم اور افلاس کا شکار طبقہ کی بھرپور مدد کرتا تھا برک کے عروج کے دنوں میں فرانس سیاسی تجربوں کی لیبارٹری کا کردار ادا کر رہا تھا- چنانچہ اس سے برک نے بھی فائدہ حاصل کیا- اس کی سرگرمیوں کی امریکی انقلابیوں نے بھی حمایت کی اور اس کے نظریات کو قابل قدر جانا اگرچہ وہ نظریہ سیاست میں دخل دینے پر فرانسیسی انقلاب سے مجبور ہو چکا تھا لیکن اس نے جو اصول انقلابی تعلیم کی مخالفت میں پیش کئے وہ بے حد اعلیٰ اقدار کے مالک تھے- وہ فلسفہ تصور پر یقین نہ رکھتا تھا وہ عملی اقدام کا قائل تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں میں بھی فلسفیانہ نظام کا شائبہ نہ تھا' وہ حد سے زیادہ علمی ذوق رکھتا تھا لیکن اس کی طبیعت و مزاج میں بہت حد تک ضبط و تحمل کی اوصاف پائی جاتی تھیں- وہ ایسے غور و فکر کا مخالف تھا جو کسی عملی مسئلے سے وابستہ نہ ہو- اس کے تمام سیاسی نظریات کا محور صرف مصلحت پر مبنی تھا وہ اپنے ذہن میں ایک خاص سیاسی و اخلاقی تصور رکھتا ہے برک کا خیال ہے کہ مفکرین نے جس قدر اصلاحات بیان کی ہیں یہ سب ماضی کے تجربات و مشاہدات کو سامنے رکھ کر کی گئی ہیں برک کے نزدیک تمام سیاسی اداروں جو انقلاب و ردوبدل کرنی ہے وہ وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ہی کی جانی چاہئے- کیونکہ یہ تمام سیاسی اداروں میں ہمہ وقت اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے جس کو محسوس کرنا ضروری ہے-

تنقیدی جائزہ : Criticism and Analysis

برک کے سیاسی نظریات پر تنقید کرنے والوں کا خیال ہے کہ برک نے انگلستان کے آئین کی تعریف میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں- آئین ان الفاظ کے قابل نہیں اور انگلستان کے ابتدائی ادوار کا و نقشہ بذریعہ آئین پیش کیا ہے وہ بھی انگلستان کے آئین میں بالکل موجود نہیں- برک جمہوری حکومت کا مخالف ہے- اور نہ ہی وہ تباہ و برباد قصاب کے زمانے میں بالغ رائے دہی کے نظام کو بدلنے یا اس میں کوئی ترمیم وغیرہ کرنے کو ہی پسند کرتا ہے- اس کے علاوہ برک لوگوں کی سیاست میں حصہ لینے

کے حق میں بھی نہیں۔ اگرچہ برک بنیاد پرست مفکر واقع ہوا ہے لیکن وہ جدید تبدیلیوں کو بھی پسند کرتا ہے۔ جس سے اس کے نظریات میں جھول نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ انگلستان کے آئین کی توصیف میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ طبقاتی امتیازات کو بالکل پسند نہیں کرتا وہ اس سے بھی انکار کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ انگلستان میں لوگوں کے مفادات کے درمیان ہم آہنگی کی بجائے طبقاتی امتیازات نے لے لی ہے اور اپنی بنیادوں کو مضبوط کر لیا ہے اور نہ ہی برک اس کے باوجود کوئی تبدیلی کا ہی خواہاں ہے اگرچہ برک کے نظریات کو اس کے ہم عصروں نے زبردست تنقید کا نشانہ بنایا ہے لیکن اس کے بعد کے مفکرین نے اس کے سیاسی نظریات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مغربی دنیا میں آج بھی اس کے نظریات کو شہرت حاصل ہے۔
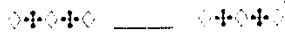
سوال: جان اسٹورٹ مل کے بارے آپ کیا جانتے ہیں نیز اس کی تصانیف فلسفہ نظریہ آزادی کے بارے میں تفصیلاً بتایئے۔ 1999ء

John Stourt Mill

جواب: انگلستان کا یہ جدید انفرادیت پسند' افادیت پسند اور اعتدال پسند مفکر ۲۰ مئی ۱۸۰۶ء کو انگلستان کے مشہور شہر لندن میں آنکھ کھولی جان سٹوارٹ مل مشہور قانون دان اور سیاسی مفکر جرمی بینتھم کا شاگرد اور جیمز مل کا لڑکا تھا یہ دنیا کا واحد مفکر ہے کہ جس نے فکری اساس ورثے میں حاصل کی فطری طور پر ذہین۔ ان تھک محنتی محب الوطن آزاد خیال اور بلند فطرت انسان ہونے کی وجہ سے اس نے اپنی لیاقت کا سکہ انگلستان کے باشندوں میں منوایا۔ اس کے والد جیمز مل اپنے دور کا عظیم افادیت پسند مفکر تھا۔

اس کے والد جیمز مل نے اس کا نام اسکاٹ لینڈ کے ایک دوست مند اور اپنے محسن سر جان اسٹورٹ کے نام پر رکھا جان سٹورٹ مل موجودہ زمانہ کا سب سے مقبول سیاسی مفکر ہے سب سے بڑا مصنف بھی جان سٹوارٹ مل اپنی ابتدائی عمر کے بارے میں کچھ یوں رقمطراز ہے کہ شاید ہی کوئی عجیب والا بچہ ہو جس کا بچپن میری طرح گذرا ہو۔

جب جان اسٹورٹ مل کے والد کی مشہور افادیت پسند مفکر جرمی بینتھم سے ملاقات ہوئی اس وقت جان اسٹورٹ مل کی عمر ابھی دو ہی برس تھی جان اسٹورٹ مل کے والد کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا بینتھم کے نظریات کا ہی پرچار کرے چنانچہ اس دلچسپی کے سبب اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت خود اپنے ذمہ لی اور ایک استاد کی حیثیت سے جہاں ممکن ہوتا سختی سے کام لیتا۔ یہی وجہ تھی وہ بچپن کم عمری کے زمانے میں ہی اپنی علمی استعداد سے بڑھ کر حصول علم پر اپنی توجہ دینے لگا۔ ان تمام عوامل نے اس کی شخصیت پر اثرات یہ مرتب کئے کہ کثرت مطالعہ کی وجہ سے وہ سخت بیمار ہو گیا۔

صحت کی خرابی کے سبب وہ علاج کے لئے فرانس جا پہنچا جہاں فرانسیسی زبان سیکھی اور علاوہ ازیں فرانسیسی مفکرین کے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں لاطینی زبان پر عبور حاصل کیا حیات کے چودھویں برس وہ فرانس جا پہنچا اور پندرہ سال کی عمر میں واپس لندن تشریف لایا اور قانون کی تعلیم حاصل کی اور لندن ریویو کا ایڈیٹر مقرر ہو گیا۔ ۳۵ سال کی عمر میں تنہائی سے گھبرا کر ایک خوبصورت دوشیزہ ہیرٹ ٹیلر کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کیا رسمی تعلیم کا سلسلہ ۱۸۲۲ء کو ختم ہوا۔ اور اپنے والد کے مددگار کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کے پیشہ سے منسلک ہو گیا اور اس نے اپنی زندگی کے ۳۵ برس ایسٹ انڈیا کمپنی کی فرائض کی ادائیگی میں صرف کر دیئے۔ ۱۸۵۶ء میں اس کمپنی میں چیف اگزامنر کے عہدے پر فائز تھا۔ ۱۸۵۸ء تک اس عہدے پر متعین رہا پھر ایسٹ انڈیا کمپنی سے استعفیٰ دے کر خود کو دوبارہ مطالعے کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۸۶۵ء میں ویسٹ منسٹر کے حلقے سے دارالعلوم کا رکن منتخب ہوا اس نے بغیر کاشتکاروں کی تنگ دستی آئرلینڈ میں اصلاحات اور عورتوں کی حق رائے دہی کے مسائل و مشکلات کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی

بناء پر دارالعلوم میں نمایاں مقام حاصل کر لیا لیکن تین سال بعد دوبارہ انتخابات میں اس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد خود کو مکمل طور پر تصنیف کے لئے وقف کر دیا اور باقی ماندہ زندگی اپنی سوتیلی ماں کے پاس فرانس میں رہ کر تحریر و تدریس میں گزارا۔ اور وہیں خالق حقیقی کے حضور ۸ مئی ۱۸۷۳ء کو آوئی یوں میں انتقال کیا اور یوں یہ عظیم مفکر بھی کئی ایک تصانیف' نظریات و افکار چھوڑ کر اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔

تصانیف :

مل نے اپنی تحریروں کے ذریعے کائنات کے سربستہ رازوں اور حیات انسانی کے پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کیا اس نے سیاسیات اخلاقیات اقتصادیات معاشیات اور مابعدالطبیعات غرضیکہ تمام شعبہ ہائے زندگی پر روشنی ڈالی وہ ایک ایسا خوش قسمت اور قابل ترین شخص ہے کہ اس کی تمام تحریروں کو مستند سمجھا جاتا ہے۔ چند ایک تصانیف درج ذیل ہیں۔

1- On liberty.

2- Essayb on Naure.

3- Utilitarianism.

4- A System of Logic.

5- Autobiogrty.

6- Representative Government.

7- Thought on Parliamentry Reforms.

8- Principles of Political Economy.

9- Subjections of Womens.

10- Inaugral address at stanorews.

11- Dissertations and discussions.

12- Examination of Hamiltons Philosophy

جان اسٹوارٹ مل کا سیاسی فلسفہ :

Examination of Hamiltons philosophy. :

جان اسٹوارٹ مل کا سیاسی فلسفہ میدان سیاسیات میں بنیادی و کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔
اس نے اپنے سیاسی فلسفہ و فکر میں افراد کی انفرادی آزادی پر بڑے مفصل انداز میں بحث

کی

جان اسٹوارٹ مل نے انسان' ریاست آزادی رائے، زندگی مقصد اعلیٰ اور نظام حکومت کو مختلف پہلوؤں سے پرکھا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ بینتھم کا نظریہ مسرت واقعی مقصد زندگی ریاست ہے اس نے اپنے فلسفے میں دراصل معاشرہ میں انسان کی اصلاح حکومت کے وقار اور ملک و ملت کی ترقی کے لئے تمام وسائل کو تفصیل سے بیان کئے ہیں جان سٹوارٹ مل کے نزدیک چونکہ معاشرے کی تشکیل لوگوں کے ایک جگہ اکٹھے بیٹھنے سے ہوتی ہے اور انہیں آزاد خیال ہونے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے ان سب لوگوں کا ایک خیال سے مطابقت کرنا بہت ہی مشکل ہے اور یہ زبردست معاشرتی اور اخلاقی بے انصافی ہے، کہ کسی ایک انسان کی مرضی کو دوسروں پر اس لئے مسلط کردی جائے کہ باقی سب کو اظہار کی اجازت نہ رہے۔ سٹوارٹ مل نے فرد' ریاست آزادی فرد کو مختلف زاویوں سے پرکھا

سٹوارٹ مل کے خیال میں بہترین نظام حکومت "جمہوریت ہے کیونکہ زمانے کے اوقات کا تقاضہ یہی ہے کہ عوام کو کچھ کہنے اور کچھ کرنے کا موقع دیا جائے۔

انہیں معاشرے کی تشکیل کے بارے میں صحیح طور پر استفادہ کرنا چاہئے۔ اگر معاشرہ میں اتفاق رائے میں کوئی کمی ہو تو اس صورت میں یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سا گروہ کیا چاہتے ہیں اور نظام حکومت چلانے کے لئے ہر گروہ کو اس کی ذہانت کے مطابق نمائندگی دے دینا چاہئے۔ اس طرح ان لوگوں کو حکومت میں متناسب نمائندگی حاصل ہوگی اور ان کے دل میں مخالفت کی بجائے حکومت کے ساتھ مفادات کے جذبات کام کریں گے۔ اس متناسب سے نمائندگی میں اقلیتیں بھی اپنا حق استعمال کر سکتی ہیں۔

سٹوارٹ مل کے خیال میں رائے دینے کا حق فطری طور پر سب کو حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ووٹ دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے لوگ کسی معاشرتی یا سیاسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اپنی رائے کا اظہار کریں جہاں تک معاشرتی مسائل کا تعلق ہے۔

ان کی گہرائیوں کو ہر فرد معاشرہ نہیں جان سکتا۔ عوام کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو صرف اکثریت کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں ایسے لوگوں کے ووٹ مسائل کے حل کرنے میں چنداں مفید نہیں ہو سکتے اس لئے بہتر یہ ہے کہ ووٹ دینے کا حق صرف تعلیم یافتہ افراد کو ہونا چاہئے تاکہ وہ ضروریات حیات و سیاست و معاشرت کو اچھی طرح جان کر کسی فیصلے پر پہنچیں۔ عورت کو مرد کے شانہ بشانہ ووٹ کا حق استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہئے لیکن زیادہ احسن وہ قدم ہوگا جو پڑھی لکھی عورت کے ذریعے اٹھایا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی آشکار ہوگئی کہ حقیقی مسرت صرف مادی ضرورتوں کی ہی تکمیل کا نام نہیں بلکہ حقیقی اور پائیدار مسرت تو اخلاقی اور روحانی مقاصد کو پورا کرنے کا نام ہے۔

جو عورتوں کو حق آزادی سے بہرہ ور کرنا چاہتا ہے وہ اس کو گھر کی چار دیواری کی زینت

قرار نہیں دیتا بلکہ وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کام لینے کے حق میں ہے۔ گھر کے اند رہ
وہ سوائے ایک خاندان کے چند افراد کی خدمت کرنے کے لئے محدود ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کو چ
دیواری سے نکال کر معاشرے کی وسیع سوسائٹی میں لایا جائے تو وہ زیادہ سودمند ثابت ہو تی ہے۔
چنانچہ وہ اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ عورت کو حق حاصل تعلیم' حق رائے دہندگی اور دیگر مساو
حقوق کا اس طرح دعویدار ہونا چاہئے جس طرح ایک مرد ہوتا ہے نجی ملکیت کے بارے میں ... وار۔
مل کا خیال ہے کہ عوامی دلچسپی معاشرتی ترقی اور اقتصادی خوش حالی کا راز نجی ملکیت میں ... ہے۔
کیونکہ نجی ملکیت کا حصول اور اس کی افزائش کے لئے کوششوں کا عنصر ہر فرد میں فطری طور موجود
ہے اگر اس عنصر کو زیادہ سے زیادہ آزادی دیدی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ نجی ملکیت کے ... ساتھ
حکومت کے وسائل آمدنی میں گراں قدر اضافہ ہو نجی ملکیت کو وراثت کے طور پر خاندان ... جا
ورثاء میں تناسب انداز میں منقسم ہو جانا چاہئے تاکہ کوئی تنازعہ نہ ہو اور ہر ایک کو اصولی ...
چل جائے کہ اس کے حصے میں جتنی بھی جائیداد و تناسب کے لحاظ سے آتی ہے اس کو اس ... زیادہ
نہ تو مل سکتی ہے اور نہ ہی اس کو اس کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔

سٹوارٹ مل کا یہ فلسفہ انگلستان میں کامیاب رہا اور ۱۹۱۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ ... باقاعدہ
ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے عورتوں کو مردوں کے مقابل میں ووٹ کی تناسب نمائندگی کا حق
دے دیا گیا۔

جان سٹوارٹ مل کا نظریہ آزادی :

جان سٹوارٹ کے مکمل نظریات و تفکرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرد کی
آزادی کا مکمل خواہش مند ہے۔

انسانی آزادی کی خواہش اس کو نا چاہتے ہوئے بھی سیاست کے کارزار میں لے آئی اس ...
خیال ہے کہ ہر شخص معاشرے کو مخالف عقیدے اور رائے رکھنے والوں کا مجموعہ کہتا ہے۔ اس
مجموعے کی اکثریت معاشرے کے خیالات کو عمل میں لاتی ہے چونکہ مل لوگوں کو تحفظ فراہم ... نا چاہتا
ہے اس لئے اس نے حکومتی دائرہ عمل کو محدود کر دیا ہے۔

سٹوارٹ مل بینتھم کے نظریہ قانون کا حامی نہیں ہے اس کے خیال میں بینتھم کا یہ ... ہے کہ
قانون کو ہی مقتدر اعلیٰ تصور کیا جانا چاہئے کیونکہ امن و امان اس کی برکت سے قائم رہتا ہے ... عوام
امن میں رہ کر زیادہ آسانی سے زندگی گزار سکتے ہیں اور امن پسندی ہی انسان کی مسرت کا موجب ہے
کسی حد تک درست نہیں۔ کیونکہ قانون بعض اوقات حالات کے تقاضوں کے پیش نظر انسانی آزادی
کو محدود کر دیتا ہے قانون سیاست کا محتاج ہوتا ہے اور معاشرہ سیاست کی گرداب میں پھنس رہا ہے
حالانکہ آزاد سیاست صرف اس امر کا نام ہے کہ ہر فرد معاشرہ کے لئے ایسا قانون بنائے ... سے
مجموعی مفاد تو ضرور حاصل ہو لیکن کسی خاص طبقے یا خاص جماعت کی خاطر پورے معاشرہ کو ... ایک

قانون کو بند کر دینا نہ صرف انسان کے تقاضوں کے منافی ہے بلکہ انسانیت پر ظلم کے مترادف ہے
آزادی سٹوارٹ مل کے فلسفے کا محور ہے اس کی کتاب On Liberty مل کی آزادی کے بارے میں
نظریات کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس کے نظریہ آزادی کے مطابق اگر کسی شخص کی
آزادی سلب ہوتی ہوئی نظر آئے یا اس پر کوئی حرف آتا ہوا دکھائی دے تو فرد کو حق حاصل ہے کہ
وہ اس کی مدافعت کرے سٹوارٹ مل آزادی کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینا چاہتا ہے اس کے لئے وہ
یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے حکومت اور معاشرہ کے دائرہ عمل کو محدود کر دیا
جائے۔ باقی اختیارات خود افراد کے سپرد کر دیئے جائیں سٹوارٹ مل اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ
انسان کو اخلاقی قدروں کو کبھی روندنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے اگر کسی فرد کی بہتری کے لئے کچھ
تکالیف کا سامنا کرنا پڑ تو اس کو برداشت کرنے سے گریز نہیں ہونا چاہئے یہ بات بھی آزادی اور مسرت
کا پیغام ہے۔

وہ انگریزی کے اس مقولے پر کاربند ہے۔

It is beter to be a socrate disatisfied than a fool satisfied. It is better to be human being dissatisfied than a pig satisfied.

جان سٹوارٹ مل کا یہ نظریہ افراد کے خود غرض نظریات کے خلاف واضح طور پر ایک
صدائے احتجاج سے کم نہیں جان سٹوارٹ مل مردوں کی آزادی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی آزادی
اور حق کے تحفظ پر زور دیتا ہے۔

نظریہ آزادی میں جائیداد و املاک پر بھی زور دیتا ہے۔ اس کے خیال میں نجی جائیداد کی
آزادی کا حق بلا امتیاز ہر عورت اور مرد کو حاصل ہونا چاہئے البتہ اس بات کا لازماً خیال رہے کہ کسی
دوسرے فرد معاشرہ کی نجی ملکیت پر ناجائز قبضہ جمانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے ورنہ معاشرے کے
امن کو تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تنقید

سٹوارٹ مل نے اگرچہ نہایت گہری فکر کے بعد آزادی کے حصول و استحکام کے لئے نہایت
جامع نوعیت کے دلائل پیش کئے ہیں۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود بعض امور ناقابل قبول ہیں۔ مثلاً
مل کا خیال ہے کہ افراد کو عقائد اور مذاق کی مکمل آزادی ہونا چاہئے۔ اور اس آزادی کے تحفظ کا کام
حکومت کے سپرد ہونا چاہئے یہ خیال کسی حد تک نہ تو قابل عمل ہے نہ انصاف کے تقاضوں کے
مطابق۔

کیونکہ تمام لوگوں کے عقائد و مذاق کبھی یکساں نہیں ہو سکتے پھر حکومت کن لوگوں کے
عقائد کا تحفظ کرے۔ اس لئے یہ کہنا کہ حکومت ان کے عقائد کا تحفظ و احترام کرے درست نہیں

کیونکہ وہ حکومت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو کسی ایک فریق کی ہمنوا ہو کر دوسرے فریق کو نظر انداز کرے دوسرا یہ کہ سٹوارٹ مل نے جابجا انفرادی آزادی کے حصول اور اس کے تحفظ پر زور دیا ہے یہاں تک کہ ذاتی آزادی کے لئے اس نے معاشرے کو بھی پس پشت ڈال دینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی حالانکہ اس میں کسی مفکر کو اختلاف نہیں کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور وہ اپنی پیدائش سے لے کر مرتے دم تک معاشرے کا محتاج رہتا ہے۔ اس لئے وہ معاشرے سے علیحدہ رہ کر ایک دن بھی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس صورت حال میں انفرادی ترقی کے لئے ہر فرد کے لئے معاشرتی خدمات کا بجالانا ازبس ضروری ہوتا ہے تاوقتیکہ وہ معاشرہ کی بہبود کو معاشرتی افادیت کو مد نظر نہ رکھے گا اس کی ذاتی ترقی کا حصول یا ذاتی آزادی کا تصور بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس لئے لازم ہے کہ ذاتی آزادی کے حصول کی کوشش کے دوران معاشرتی بہبود کو مد نظر رکھا جائے حقیقی افادیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ افراد ذاتی اغراض کے حصول سے معاشرہ کے بہتر مقاصد کے حصول کو ترجیح دیں اور خود غرضی کی نسبت دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

سٹوارٹ مل حکومت کو افراد معاشرہ کی اخلاقی زندگی میں بھی دخل دینے کی اجازت نہیں دیتا وہ کہتا ہے کہ حکومت کو اخلاقی حالت کو درست کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ صرف افراد معاشرہ کا اپنا کام ہے کہ وہ خود بخود اخلاقی قدروں کا احترام کریں۔ حکومت کو اخلاقی نوعیت کے افعال پر نہ تو حرف زنی کرنی مناسب ہے اور نہ ہی گرفت کرنی درست ہے وہ افعال اخلاقی اعتبار سے کتنے ہی گرے ہوئے کیوں نہ ہوں کیونکہ اس سے انسان کی نجی زندگی سلب ہوتی ہے۔ اس قدر آزادی ظاہر ہے چنداں منفعت بخش نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی بھی حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے سامنے اس کے معاشرہ کے افراد برے اعمال میں مشغول ہوں چنانچہ سٹوارٹ مل کے اس نظریے میں کوئی صداقت نہیں۔ حکومت کے ذمے جہاں داخلی و خارجی امور کے تحفظ کی ذمہ داری ہے وہاں اس پر معاشرے کے اخلاق کے تحفظ کی بھی ذمہ داری عائد ہونی ضروری ہے۔

سٹوارٹ مل کا خیال ہے کہ حکومت کو کسی شخص کی زندگی میں دخل کا حق نہیں جہاں تک افراد کی زندگی کا تعلق ہے اس میں اس امر کا تعین کرنا کہ کون سے معاملات فرد کے ذاتی نوعیت کے ہیں اور کون سے عوامی نوعیت کے قدرے مشکل سی بات ہے انسان کی زندگی اس طرح دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے جس سے مراد فرد کی نجی زندگی پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی لیکن اس کی عمومی زندگی قابل پابندی ہے۔
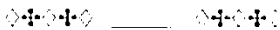
سوال: امریکن فلسفہ جمہوریت کی بنیاد جان لاک کے فلسفہ سے ماخوذ ہے وضاحت کریں۔ 2002ء، 2003ء، 2008ء

سوال: آئینی حکومت کے بارے میں انیسویں صدی کے یورپی نظریات کا جائزہ لیجیے۔ 2004ء

سوال: امریکہ میں جمہوری افکار کی نشوونما کے عمل سے جامع انداز میں بحث کیجیے۔ 2005ء، 2006ء، 2009ء

جان لاک John Locke

جواب: جان لاک ۱۶۳۲ء میں سمرسٹ کے مقام پر ایک درمیانہ درجہ کے گھرانہ میں پیدا ہوا باپ پیشہ کے اعتبار سے اٹارنی تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ری پبلک سکول میں داخل ہوا۔ ۱۶۵۲ء میں آکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ کالج میں داخل ہوا۔ عہد جوانی میں لاک نے سخت تکالیف برداشت کیں جس کا ذکر اس نے اپنی کتابوں میں بھی کیا ہے۔ "جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آج تک میری زندگی طوفانی لہروں میں پھنسی رہی۔"

جان لاک ایک مشہور انگریز مفکر تھا۔ اور بحیثیت سیاسی مفکر اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ جان لاک نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی حصول تعلیم کے بعد وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں استاد ہوا۔

۱۶۷۵ء میں جان لاک اول آف شیفٹبری کا سیکرٹری ہوگیا شیفٹبری وگ پارٹی کا بانی تھا۔ ۱۶۸۸ء کے غیر خونی انقلاب کے بعد وگ پارٹی کو فتح نصیب ہوئی۔ لہٰذا جان لاک کو عملی سیاست کو سمجھنے کا موقع ملا جان لاک کا شمار ان چند مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تمام تر کوششیں معاشرہ کو سدھارنے اور عوام کو ان کے صدیوں پرانے خواب سے بیدار کرنے کی طرف مرکوز کر دیں۔ صرف فکری سیاسیات پر ہی نہیں بلکہ معاشیات تعلیم پر بھی اس ماہر طب نے قلم اٹھایا اور مروجہ سیاست کو معاشی سماجی اور سیاسی دلدل سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کی۔

جان لاک نے اپنی کتاب میں 1688ء کے غیر خونی انقلاب کو جائز قرار دیا اور نظریہ حقوق ربانی کی سخت مخالفت کی اس کے ساتھ تھامس ہابز کے نظریہ مطلق العنان بادشاہت پر بھی سخت تنقید کی 1688ء کے انقلاب کی حمایت کرکے لاک ملک میں محدود بادشاہت قائم کرنا چاہتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ لاک آئینی یا پارلیمانی طرز حکومت کا علمبردار رہا ہے۔

لاک کی زندگی کے آخری ایام خاص طور پر 1683ء سے 1704ء تک کا زمانہ بہت اچھا گزرا اس زمانہ میں جان لاک نے سیاسی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا اور کئی کتب تحریر کیں اور آخرکار 1704ء میں وفات پائی۔

لاک کی کتب:

غیر خونی انقلاب کے بعد جان لاک نے کاتب کی حیثیت سے کام شروع کیا اس کی مشہور

کتاب On Civil Government آن سول گورنمنٹ 1690ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں جان لاک نے معاہدہ عمرانی ریاست حکومت کی ابتدا۔ اور حکومت کی نوعیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ماہرین کے نزدیک لاک کی کتاب بجا طور پر آزادی کا فرمان ہے۔ لاک نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ انسان تجربہ کی مدد سے علم حاصل کرتا ہے۔ لاک کی دیگر کتب درج ذیل ہیں۔

1 Th ghts on Education

2 Le ter on toleration

3 Th Reasonab leness of Christinity.

جان لاک اپنی تصانیف کے ذریعے ہابس کی مطلق العنانیت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ ملک میں ایک ایسی بادشاہت قائم کرنے کا خواہش مند تھا جو عوام کی مرضی سے ہو اور جس میں شاہ کے اختیارات بہت ہی مختصر ہوں کیونکہ لاک 1688ء کے انقلاب کا سب سے بڑا حامی تھا۔ اس وجہ سے وہ اپنی تحریروں میں یہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ بادشاہ کا انتخاب عوام کی مرضی اور توسط سے ہونا چاہیئے۔ فلسفہ سیاسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ لاک کی کتاب ان سول گورنمنٹ بلند تر ہے۔

فلمر کے نظریہ حقوق ربانی کی اس کتاب میں نفی کی گئی ہے لاک کی ایک کتاب ایسے کنز ہیک ہوس انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ لاک نے اس کتاب میں تحصیل علم کے مختلف ذرائع پر بحث کی ہے۔ اور علم کے حصول کو آسان تر بنانے کی جدوجہد پر زور دیا ہے۔

جان لاک کا سیاسی فلسفہ :

جان لاک نے انگلستان میں خانہ جنگی اور اندرونی و داخلی انقلاب کا سامنا کیا لیکن اس کے باوجود انسانی فطرت کا اتنا سیاہ منظر پیش نہ کیا جتنا کہ مشہور مفکر ہابز نے پیش کیا۔

وہ ہابز کے نظریہ کے متضاد انسانی فطرت کا ایک دلکش ناکہ پیش کرتا ہے۔

جان لاک کے نزدیک انسان ایک سماجی کیڑا ہے۔ جو عقل اور استدلال کا مالک ہے وہ حریص اور خود غرض نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر محبت اور ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں وہ تنہا زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ سماجی جبلت کا مالک ہونے کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے۔

فطری زمانہ :

جان لاک بھی تھامس ہابز کی طرح روائتی قدرتی زمانے سے اپنے نظریات کا آغاز کرتا ہے لیکن وہ تھامس ہابز کی طرح فطری و قدرتی زمانے کا بھیانک خاکہ پیش نہیں کرتا۔

لاک کے نزدیک قدرتی زمانہ امن و امان خوش حالی اور باہمی سلوک کا زمانہ ہے ہر شخص اپنی جگہ قائم ہے اقتدار حاصل کرنے کا حرص اس کے اندر نہیں پایا جاتا کیونکہ ابتدائی اور فطری دور میں انسان مل کر رہنے کا عادی تھا۔ لاک کے نزدیک قدرتی زمانہ کو قبل سیاسی دور کہا جا سکتا ہے لیکن اس دور کو قبل سماجی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ قدرتی زمانہ میں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس وجہ سے لوگوں میں نہ تو لڑائی جھگڑے تھے اور نہ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے ان کی اہم خصوصیات انصاف اور برادری کے جذبات تھے۔ قدرتی زمانہ میں لوگ فطری قانون کی اطاعت کرتے ہیں قانون فطرت کی بنیاد عقل پر رکھی گئی ہے۔ قانون فطرت کی رو سے افراد کو تین اہم حقوق حاصل تھے۔ ۱۔ حق زندگی ۲۔ حق آزادی ۳۔ حق جائیداد۔ اس کے خیال میں ہابز کا یہ خیال غلط ہے کہ قدرتی زمانہ وحشت، بربریت، اور نفرت کا دوسرا نام تھا۔ اس کا خیال ہے کہ قدرتی زمانہ امن و راحت سے بھرپور تھا لوگوں کی حیات سادہ تھی۔ وہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتے تھے۔

ان کے اندر اپنے مال و جائیداد امن جان کے تحفظ کا مادہ تھا۔

لوگوں کے اندر محبت ہمدردی اور خیر سگالی کے جذبات پائے جاتے تھے افراد باہمی تعاون سے زندگی بسر کرتے ہیں زندگی کی تمام سہولتیں مہیا تھیں۔

لاک کے نزدیک قدرتی زمانہ میں ہر شخص فطری قانون کی تعریف اپنے نظریے کے مطابق کرتا ہے

فطری قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو معقول سزا دینے والا کوئی نہیں تھا۔

فطری قانون کو نافذ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور نہ ہی کوئی ایسا مقتدر شخص موجود تھا جو لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لے سکے۔

اس لئے لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس وقت تک امن و امان اور خوش حال زندگی بسر نہیں کر سکتے جب تک ہر شخص اپنے چند حقوق سے دستبردار ہو کر ان حقوق کو پورے سماج کے سپرد نہ کر دے

چنانچہ ہر شخص نے فطری قانون کو واضح شکل میں لانے کا حق پورے معاشرے کے سپرد کر دیا ہے اس نے معاشرہ کو برتر اور اعلیٰ اختیارات دے کر ایک فرد واحد کو اقتدار اعلیٰ سے محروم کر دیا

اس کا نظریہ اس بات کی دلیل ہے کہ لاک لامحدود بادشاہت کے خلاف تھا لاک معاہدہ عمرانی کے ذریعے ایک فرد واحد کو مطلق العنان نہیں بناتا بلکہ پورے معاشرے کو برتری حاصل ہوتی ہے۔ اس کا سب سے اہم فرض لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا ہے عوام کا معاہدہ حاکم اعلیٰ کے ساتھ نہیں یہ معاہدہ معاشرہ کے ساتھ ہوا ہے تاکہ ریاست فطری قانون کو نافذ کر سکے اور امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہو۔ لاک کا خیال ہے کہ عوام اپنے تمام سیاسی اختیارات بطور امانت بادشاہ کے سپرد کر کے سونے کے لئے چلے جاتے ہیں لیکن وہ

صحیح طور پر ان کی حفاظت نہ کی تو وہ بذریعہ بغاوت اس کو اس کے اقتدار سے محروم کر [illegible] گے اس کا بادشاہ نہ تو معاہدہ سے برتر ہے اور نہ وہ ریاست میں مطلق العنان اختیارات کا ملک [illegible] ہے بادشاہ پر معاہدہ کی پیروی ضروری ہے لاک کہتا ہے کہ کیونکہ پورے معاشرے کو برتر اختیارات [illegible] حاصل ہوتے ہیں اس وجہ سے معاشرہ سیاسی مقتدر اعلیٰ ہوا مقننہ کو آئینی یا قانونی اقتدار حاصل ہے [illegible] بادشاہ نام نہاد مقدر اعلیٰ ہے لہٰذا جان لاک جمہوریت اور آئین کا سب سے بڑا علمبردار تصور کیا جاتا ہے سیاسی مفکرین کا خیال ہے کہ جان لاک کی ریاست 1688ء کو انگلستان کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

لاک کا نظریہ معاہدہ عمرانی :

جان لاک کی نسبت تھامس ہابز صرف ایک معاشرتی معاہدہ پیش کرتا ہے۔ [illegible] کے ذریعے معاشرہ مملکت اور حکومت یہ تینوں ادارے وجود میں آتے ہیں اس کے برعکس لاک معاشرتی معاہدوں کی نشاندہی کرتا ہے لاک ایک معاہدے کو واضح طور پر بیان کرتا ہے جبکہ دوسرے کو بالواسطہ طور پر بیان کرتا ہے۔

یعنی پہلے معاہدے کی رو سے مملکت یا سیاسی معاشرہ وجود میں آتا ہے اور دوسرے معاہدے کے ذریعے حکومت کا قیام عمل میں آتا ہے۔

پہلا معاہدہ :

جہاں تک لاک کے پہلے معاشرتی معاہدے کا تعلق ہے یہ ایک انفرادی معاہدہ [illegible] جیسا کہ ہابز کا معاہدہ تھا۔ بلکہ یہ ایک اجتماعی معاہدہ ہے جو معاشرہ اور لوگوں کے درمیان ہے [illegible] افراد قانون فطرت کی تشریح و وضاحت کا اختیار معاشرے کے سپرد کر دیتے ہیں اور باقی اختیارات اپنے پاس رکھتے ہیں۔

لاک کے معاہدے میں جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ اس کا معاہدہ غیر مشروط نہیں جیسا کہ ہابز کا تھا بلکہ یہ ایک مشروط معاہدہ ہے دوسری چیز ہابز کے برخلاف لاک نے یہ نقطہ پیش کیا کہ افراد نے مکمل طور پر حقوق سے دستبرداری حاصل نہیں کی بلکہ بہت ہی محدود حد تک اختیارات سیاسی معاشرے کو تفویض کئے ہیں۔

اس کے برعکس ہابز کا نقطہ نظر یہ تھا کہ افراد نے سیاسی معاشرے کو ملکی اختیارات سونپے ہیں۔ اس لیے سیاسی معاشرہ غیر محدود اختیارات کا حامل ہے۔ ہابز کے برخلاف لاک سیاسی معاشرے کو محدود اختیارات کا حامل قرار دیتا ہے۔

دوسرا معاہدہ :

لاک دوسرے معاہدے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلے معاہدے کے ذریعے جب سیاسی معاشرے کا قیام عمل میں آتا ہے تو یہ معاشرہ ایک اور معاہدے کے ذریعے حکومت کا قیام عمل

میں آتا ہے اس بارے میں لاک نے بہت زیادہ وضاحت تو نہیں کی ہے لیکن محدود حد تک اس کے نظریے میں یہ اصول پنہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشرے اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ فرض کر لیتا ہے۔

وہ حکومت کو معاشرے کا سربراہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ مملکت نے حکومت کو اصل مقصد کے حصول کے لئے قائم کیا مزید یہ کہا کہ چونکہ جس سیاسی معاشرے نے حکومت کو قائم کیا ہے۔ اس کے اختیارات خود محدود تھے لہٰذا وہ محدود اختیارات رکھنے والا معاشرہ ایک مطلق العنان کی حکومت کی تشکیل نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ ایک محدود طرز حکومت ہی کو قائم کر سکتا ہے۔ یعنی منطقی نقطہ سے سیاسی معاشرہ زیادہ سے زیادہ وہی اختیارات حکومت کو دے سکتا ہے جو افراد نے اسے تفویض کئے ہیں اور جیسا کہ افراد معاشرے کو کلی اختیارات نہیں دیتے ہیں۔ باقی تمام اختیارات لوگوں نے اپنے پاس ہی رکھے ہیں۔ اور جیسا کہ افراد معاشرے کو کل اختیارات نہیں دیتے ہیں۔ باقی تمام اختیارات لوگوں نے اپنے پاس ہی رکھے ہیں یہی وجہ ہے کہ لاک کے دوسرے معاہدے کی رو سے جو حکومت وجود میں آتی ہے وہ محدود اختیارات کی حامل ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لاک حکومت کو پابند کرتا ہے کہ خود کو انہیں مقاصد تک محدود رکھے جو اس کے معاشرے دیتے ہیں لاک اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اگر حکومت ان دوسرے یا دائرہ کار سے جو معاشرے نے مقرر کیا ہے آگے بڑھ جائے تو اس کے تمام وظائف و مقاصد غیر قانونی ہو جاتے ہیں"

اس صورت حال کو لاک معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ایسی صورت میں لوگوں کو اخلاقی اور قانونی طور پر یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی حکومت تبدیل کر دیں بالفاظ دیگر دوسرے معاہدے کی رو سے لاک عوام کو حق مزاحمت دیتے ہوئے حکومت تبدیل کرنے کا اختیار دیتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ حکومت کو بھی پابند کرتا ہے کہ افراد کے حقوق بڑے مقدس ہیں ان کے پاس رکھنا ضروری ہے بصورت دیگر افراد حکومت کو تبدیل بھی کر سکتے ہیں لاک کے معاہدہ عمرانی کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ وہ مملکت اور معاشرہ اور حکومت کے درمیان فرق قائم رکھتا ہے۔

لیکن لاک کے برعکس ہابز نے ان اداروں کے درمیان کوئی فرق واضح نہیں کرتا لاک کے یہاں حکومت ثانوی حیثیت نہیں رکھتی وہ محدود حکومت کے تصور کو پیش کرتے ہوئے اس کو مطلق العنان نہیں بناتا بلکہ وہ حکومت کو عوام کی مرضی عوام کی خواہشات اور عوام کے ذریعے قائم رکھنے کا حامی ہے اس کے خیال وہ عوام کی قائم کردہ حکومت ریاست اور مملکت میں ترقی پیدا کر سکتی ہے۔

لاک کا نظریہ انقلاب :

لاک جب انقلاب کی بات کرتا ہے تو ارسطو سے بہت ہی متاثر نظر آتا ہے ارسطو کی طرح لاک بھی یہ کہتا ہے کہ حکومت کا مقصد مملکت میں ایک اچھی زندگی کی راہ ہموار کرنا ہے وہ کہتا ہے کہ حکومت بذات خود کوئی مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ لاک اس کی وضاحت۔

کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حکومت کا کام صرف ان اختیارات کو بروئے کار ملک جو عوام نے تفویض کئے ہیں مملکت میں امن و امان برقرار رکھنا ہے جبکہ اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس رہتا ہے کے مطابق اگر حکومت ان اختیارات سے تجاوز کر جائے جو عوام نے تفویض کئے ہیں اس صورت میں عوام کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت کے خلاف مزاحمت کریں۔ لاک کے مطابق جو حکومت بدعنوانیوں میں ملوث ہو جاتی ہے اپنے اختیار کو تجاوز کر جاتی ہے یا اپنے مفادات کے لئے عوام کے مفاد کو قربان کرتی ہے ایسی صورت میں عوام کو یہ قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی حکومت کا تختہ الٹ دے اور اس کی جگہ دوسری حکومت کا قیام عمل میں لائیں وہ مزید کہتا ہے کہ حکومت کی حیثیت ایک امین کی سی ہے اور جس کے قانونی اختیارات بہت ہی محدود ہوتے ہیں اور اگر یہ حکومت ان محدود اختیارات کو تجاوز کر جاتی ہے تو پھر انقلاب حق بجانب ہو جاتا ہے۔ مقننہ کی وضاحت کرتے ہوئے لاک کہتا ہی کہ چونکہ مقننہ سب سے بااختیار ارادہ ہے لیکن اختیارات اس کے بھی حدود میں مقننہ کو بر حال فطری قوانین کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے پیچھے عوام ایک مقتدر اعلیٰ اتھارٹی کی حیثیت میں موجود ہوتے ہیں۔ جو اپنی مرضی سے دوسری حکومت تشکیل کر سکتے ہیں اور ایک نیا آئین بھی ترتیب دے سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں لاک کا یہ ذاتی مشاہدہ تھا کہ طویل المدت پارلیمان مطلق العنان ہو جاتی ہے تو حکومت اپنے اختیارات سے تجاوز کرتی ہے اور پھر اس کی ہیئت استبدادی ہو جاتی ہے۔ اس استبدادیت کا واحد اور مناسب حل انقلاب قرار دیتا ہے۔ درحقیقت لاک ایک کمزور حکومت کا حامی ہے اس کی بنیادی وجہ اس کے خیال میں کمزور حکومت پر ہمیشہ انقلاب کا خوف مسلط رہتا ہے گو کہ لاک انقلاب کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے دفاع کے لئے بھی تجاویز پیش کی ہیں۔ اس کے باوجود ہم لاک کے نظریہ انقلاب کو مکمل انقلابی نظریہ نہیں کہہ سکتے۔

دراصل لاک کا نظریہ انقلاب ایک مفاہمتی نظریہ ہے جو معاشرتی طبقوں کی حیثیت کے مطابق معاشرے میں مقام تعین کرتا ہے ایک حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد دوسری حکومت کو برسر اقتدار لانا انقلاب نہیں کہلاتا۔ انقلاب پورے سیاسی و معاشرتی نظام کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے صرف ایک حکومت کے تبدیل ہونے سے انقلاب نہیں آجاتے۔ اگر حکومت فرائض خوش اسلوبی سے ادا نہ کرے تو عوام اس کا تختہ الٹ کر دوسری حکومت قائم کر سکتی ہے۔

لاک کا نظریہ انقلاب :

لاک کے نزدیک حکومت ایک ایسا ادارہ ہے اور اس کے پاس جو اختیارات ہوتے ہیں وہ عوام کی امانت ہوتے ہیں اور اگر حکومت عوام کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہوتی ہے تو عوام اسے ختم کرنے کا حق رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لاک حکومت کو بذات خود کوئی مقصد قرار نہیں دیتا بلکہ وہ حکومت کو مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے لاک کے ہاں حکومت کی حیثیت ثانوی

ہے۔ لاک ۔ ثانوی اس لئے کہا کہ اس کو معاشرے نے قائم کیا ہے اس لیے اس کے اختیارات محدود ہیں حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ان تفویض کردہ محدود اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے لوگوں کی زندگی ملکیت اور آزادی کا تحفظ کرے۔ اس کے علاوہ حکومت کا ایک مقصد قانون فطرت کی وضاحت اور اس کا نفاذ کرنا بھی ہے تاکہ بہتر طور پر لوگ اپنے فطری حقوق سے فائدہ اٹھا سکیں۔

لاک کے نزدیک مطلق العنان حکومت کا تصور نہیں بلکہ وہ ایک محدود حکومت کا تصور دیتا ہے۔ اپنے معاہدے کی رو سے حکومت کے دائرہ کار کو تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حکومت لوگوں کو ان کے فطری حقوق کے بغیر استعمال کے مواقع دینے کے لیے وجود میں آئی وہ مزید کہتا ہے کہ حکومت کو معاہدے کی رو سے عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنی چاہیئے حکومت کو عوام پر ٹیکس لگانے کا کوئی حق نہیں لاک کا حکومت کی تنظیم کے بارے میں خیال یہ ہے کہ وہ مقننہ کو عدلیہ پر برتری حاصل ہونی چاہیئے۔ مقننہ کو برتر حیثیت دینا منطقی طور پر اس کے ان مفروضات سے ماخوذ ہے جو اس نے حالت فطری کے متعلق قائم کئے ہیں لاک کے نزدیک فطری مملکت میں برائی ایک مشترکہ اور ضابطہ قانون کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے لاک کے خیال میں مقننہ ہی وہ واحد طریقہ کار ہے جسے ہم قانون کہتے ہیں اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ لاک مقننہ کو لامحدود اختیارات عطا کرتا ہے لاک کے خیال میں چونکہ حکومت کل ہوتے ہوئے بھی محدود ہوتی ہے اس لیے مقننہ بھی اس کا ایک جزو ہونے کے ناطے محدود اختیارات کی حامل ہوگی۔

مثال کے طور پر برطانوی پارلیمنٹ سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ اتنی مقتدر ہے کہ ہر وہ کام کر سکتی ہے جو فطرت کے خلاف نہ ہو۔ یعنی یہ کہ مرد کو عورت اور عورت کو مرد نہیں کہہ سکتی اس کے برخلاف لاک پارلیمنٹ کو محدود اختیارات دینے کا قائل ہے۔

حکومت کی تنظیم کے سلسلے میں لاک کا دوسرا اہم تصور یہ ہے کہ حکومت جب بھی فیصلہ کرے اکثریتی رائے کی بنیاد پر کرے۔ لاک مستقبل کی جمہوریت کے لیے ایک طریقہ کار پیش کر رہا ہے تنظیم حکومت کا ایک اور اہم پہلو جو ہمیں لاک کے نظریہ میں ملتا ہے وہ ہے تفریق اختیارات کا تصور لاک تفریق اختیارات کا حامی نظر آتا ہے اس سلسلے میں اس نے مقننہ اور عاملہ کے اختیارات الگ الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لاک نے تفریق اختیارات کا مکمل تصور پیش کیا۔

جان لاک کے نظریہ قانون فطرت :

جان لاک نے قانون فطرت کا نظریہ رواقیوں کے نقش قدم پر چل کر پیش کیا۔ جان لاک کے خیال میں لوگ قدیم زمانہ میں مل جل کر عقل و ادراک اور استدلال کے تحت زندگی گزارتے تھے کرہ ارض پر ان کا کوئی مشترکہ مقتدر اعلیٰ نہ تھا۔ جو ان کے درمیان منصف بن کر رہتا۔ بلکہ ان کی راہنمائی صرف اور صرف قانون فطرت کیا کرتا تھا۔

قانون فطرت کے تحت قدیم زمانے کے لوگ اپنے اعمال میں آزاد تھے اور وہ [illegible] ارض پر ایک آزادانہ پر مسرت زندگی گزارتے تھے اور کسی دوسرے شخص کے احکامات کے محتاج [illegible] تھے۔

لاک کے مطابق قدیم زمانے میں انسان نے قانون فطرت ہی کو اپنا راہنما بنایا۔ لاک اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ فطری قانون صرف فطری ایکٹ کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ یہ اخلاقی قواعد کا ایک ضابطہ ہے اور اس کی بنیاد استدلال پر ہے۔ لاک کے مطابق قانون فطرت ہی انسانی زندگی میں باقاعدگی پیدا کر دیتا ہے اس قانون کے تحت کائنات میں تمام انسان برابر نہیں اور وہ مساوی طور پر مادی حقوق کے مالک ہوتے ہیں۔ لاک کے نزدیک انسان بالکل آزاد پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ ہی وہ اپنے فطری حقوق بھی ساتھ ہی لے کر آیا ہے اس لیے اس کی خوشیوں میں کسی دوسرے شخص کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ لاک کے مطابق قانون فطرت کے تحت ہی انسان میں [illegible] بقائے زندگی کا تحفظ آزادی کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ لاک کے نزدیک فطری قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا کا فطری شعور بھی موجود ہوتا ہے مختصر یہ کہ لاک کے مطابق قدیم زمانے میں قانون فطرت ہی انسانی زندگی میں باقاعدگی کی تحریک پیدا کرتا تھا۔ جس کے تحت انسانوں کو آزادی حاصل تھی۔ فطری قانون کا بنیادی مقصد معاشرت انسانی نشوونما اور بہتر تحفظ تھا۔

جان لاک کا نظریہ قانون فطرت یہ واضح کرتا ہے کہ زمانہ قدیم میں لوگوں کو اپنی املاک و جان کے تحفظ کے لیے قانون کی ضرورت تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ آزاد اور فطری قوانین کے مطابق زندگی گزارتے ہوئے اپنی جان اور اپنی املاک کا تحفظ کرتے ہیں دراصل امن پسند لوگوں کے خواہش مند دوسرے کے امن و سکون کا خیال رکھتے ہوئے آزادی کی فضا میں سانس لیتے تھے۔

لاک کا نظریہ فطری حقوق :

جان لاک کا نظریہ فطری حقوق اس کے نظریہ فطری قانون سے وابستہ نظر آتا ہے۔ جان لاک کے نزدیک انسان بنیادی طور پر فطری حقوق کو ساتھ لے کر اس دنیا میں جنم لیتا ہے لہذا یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی قوت انسان کو ان حقوق سے دستبردار نہیں کر سکتی لاک کے نزدیک انسان کے فطری حقوق دنیائے زندگی کی جدوجہد آزادی اور املاک پر مبنی ہیں حقوق کی ان اقسام کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ انسان اپنی حیات کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور اس کے لئے [illegible] امور سرانجام دیتا ہے کیونکہ اس کو اپنی جان کی حفاظت کا حق فطری طور پر حاصل ہوا ہے۔

لاک کے خیال میں فطری قانون انسان کو اصلیت اور حقیقت کی طرف خود بخود [illegible] چلے جاتے ہیں۔

جان لاک کا خیال ہے کہ انسان فطری قوانین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنے اعمال و املاک کے بارے میں کلی آزاد ہے اس کے لئے کسی ادارے کی ضرورت نہیں۔

صرف خواہش انسانی ہی وہ بنیادی محرک ہے جس کے ذریعے انسان کو اخلاقی ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے سب کچھ کر سکنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔

جائیداد و مال کی واضحات کے سلسلہ میں لاک کا خیال ہے کہ املاک کا سوال اس وقت سامنے آتا ہے جب فرد مشترکہ ملکیت کو انفرادی دائرے میں کسی خاص مقصد کے تحت شامل کر لیتا ہے۔

لاک زمانہ قدیم کے بارے میں تشریح کرتے ہوئے خیال ظاہر کرتا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگ استدلال سے کام لیتے تھے اور استدلال ہی وہ واحد چیز ہے جو ہر انسان کو یہ سمجھاتا ہے کہ کرہ ارض پر موجود تمام انسان مساوی ہیں دنیا کے تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص کسی بھی شخص کی جان و مال کو نقصان پہنچانے اور قابض ہونے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

لاک کا نظریہ نجی ملکیت :

لاک کا نظریہ نجی ملکیت یونانیوں اور قدیم رومیوں کے نظریات سے قدرے مختلف ہے لاک نے نظریہ ملکیت کی واضحات کرتے ہوئے کہا کہ بنیادی طور پر خدا تعالیٰ نے پوری کائنات انسانی کے لئے مشترکہ بنائی ہے لہٰذا کائنات کی ہر چیز پر تمام انسانوں کا مساوی حق ہے۔

اس لئے کوئی بھی شخص کسی مخصوص چیز پر انفرادی دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ایک طرف تو لاک یہ دلیل پیش کرتا ہے کائنات کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی انسان کی مشترکہ املاک ہوتی ہیں لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انفرادی طور پر ہر شخص کے پاس اس کا حق ملکیت موجود ہوتا ہے۔

اس کی واضحات وہ اس طرح کرتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی محنت و مشقت سے جو چیز حاصل کر لیتا ہے وہ اس کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے۔ نہ کہ مشترکہ۔

یعنی انسان کی ذاتی کاوشوں سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس پر سے مشترکہ حق ختم ہو جاتا ہے کیونکہ انسان صرف اور صرف اپنی ذاتی تسکین کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور اس جدوجہد کے نتیجہ میں اسے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس پر اپنا حق جتاتے ہوئے دوسروں کو اس پر حق جتانے سے دور رکھتا ہے۔

لاک کے خیال میں حق ملکیت کا یہ تصور معاشرتی معاہدے سے پہلے زمانہ قدیم میں موجود تھا۔ لیکن جب معاشرتی معاہدہ ہوا تو ملکیت معاہدے کا جزو بن گئی۔

لاک کے نظریہ فطری مملکت :

لاک کے نظریہ فطری مملکت Natural State کا اگر ہابز کے نظریہ فطری ملک کے ساتھ تقابلی جائزہ لیں تو پھر ہم لاک کے نظریہ فطری مملکت کو آسانی سے سمجھ سکیں گے ہابس نے فطری مملکت کا نہایت ہی تاریک پہلو پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق فطری طوائف الملوکی سی کیفیت ہے یہاں فرد کی زندگی اس کی املاک اور اس کے دیگر حقوق کو کوئی تحفظ حاصل نہیں جہاں جبر و تشدد دھوکہ

جنگ و جدل کا دور دورہ ہے ہابز کے مطابق فطری مملکت میں ہر انسان دوسرے سے برسرپیکار ہے۔ ہابز کے برخلاف لاک نے فطری مملکت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ایک خوش کن تصور پر مبنی ہے۔

لاک کے خیال کے مطابق فطری مملکت خوش حالی امن' بھائی چارہ باہمی تعاون اور بقائے باہمی کے احساس پر مبنی ہے اور وہ لوگ اخلاقی لحاظ سے قانون فطرت کے پابند ہیں وہ فطری قانون کے اصولوں کے تحت اپنی زندگی گزارتے ہیں لاک قانون فطرت کے سلسلے میں بھی ہابز سے مختلف ہے کہتا ہے کہ ہابز کے نزدیک قانون فطرت تضاد پر مبنی ہے جبکہ لاک کہتا ہے کہ قانون فطرت ایک اخلاقی قانون ہے جو خود بخود واضح ہے جس کی تابعداری لوگ اپنے ضمیر کی وجہ سے کرتے ہیں لاک کے نزدیک قانون فطرت کو کسی تحریری وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ انسانی ضمیر خود اس کی وضاحت کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ لاک کے مطابق قانون فطرت انسان وہ سب کچھ بتاتا ہے جو اسے فطری مملکت میں رہتے ہوئے کرتا ہے لاک واضح طور پر کہتا ہے کہ یہ قانون فطرت ہی ہے جو فطری مملکت کے انسانوں کو ان کے فطری حقوق سے جس میں بقائے آزادی اور ملکیت شامل ہیں ان سے متعارف کرتا ہے لاک کی ان وضاحتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فطری مملکت میں جنگ و جدل جبر و تشدد نہیں بلکہ بھائی چارگی کا دور دورہ تھا اب سوچنا یہ ہے کہ اگر فطری مملکت اتنی ہی اچھی تھی اور قانون فطرت ایک اخلاقی اصول تھا جہاں یہ لوگ ایک پر سرشاری زندگی گزارتے تھے تو پھر وہ کون سی وجہ تھی جس کے پیش نظر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اس فطری حالت کو خیرباد کہا جائے اور اس کی جگہ ایک منظم سیاسی معاشرہ قائم کیا جائے اس کی وضاحت یوں ہے کہ فطری دور کی سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ کوئی ایسی مشترکہ نہیں تھی جو قانون فطرت کی یکساں طور پر تشریح کر سکتی صرف یہی نہیں بلکہ ایک دشواری یہ بھی تھی کہ قانون فطرت کو نافذ کرنے کا کوئی مشترکہ طریقہ بھی نہیں تھا۔ اس پر مزید یہ کہ اگر قانون فطرت کی تشریحات پر اختلافات رائے ہو تو اس کا فیصلہ کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا فطری مملکت میں نظام حکومت کی کمی کی وجہ سے مشکلات درپیش آتی ہیں نہ کہ معاشرتی زندگی کی زبوں حالی کی وجہ سے۔ لاک کی فطری مملکت کا دور ایک ایسا دور تھا جس کو قبل از سیاسی دور کہا جا سکتا ہے۔ لاک کا خیال ہے کہ فطری مملکت میں کوئی قانون ساز ادارہ نہیں تھا۔ کوئی عاملانہ ادارہ نہ تھا کوئی مقتدرانہ عدالتی نظام نہ تھا اس کی وجہ سے بعض اوقات یہ صورت حال پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر شخص اپنی جگہ قانون فطرت کی وضاحت کیا کرتا تھا دراصل لاک کے نزدیک فطری مملکت میں ایک عجیب و غریب صورت حال تھی کہ جس کی وجہ سے انصاف اور قانون فطرت کے اصولوں کی خلاف ورزی ہو سکتی تھی اس ضرورت کو دور کرنے کے لئے معاشرتی معاہدے کی ضرورت محسوس ہوئی لاک کے نزدیک سیاسی معاشرہ ایک مقصد کے حصول کے لے قائم کیا گیا۔ یہ مقصد لوگوں کے جان و مال کا تحفظ اور آزادی تھا۔

سوال: فاشزم پر نوٹ لکھیں اور اس کے بنیادی اصول بیان کریں۔ 2002ء، 2003ء، 2005ء، 2006ء، 2007ء، 2008ء، 2009ء

فاشزم

جواب:

مسولینی : Mussolini

۱۸۸۳ء میں مسولینی پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک لوہار تھا جس کے بارے میں مصنفین نے تحریر کیا ہے کہ وہ سوشلسٹ بھی تھا۔

He was socialist, and the son first established a modest reputation as a socialist writer and orator.

مسولینی ۱۹۱۲ء میں Avanti کا ایڈیٹر بنا۔ جو کہ اٹلی کا بہت ہی زیادہ سوشلسٹ اخبار تھا۔

In 1914 he broke with the paper over the question of Italian Intervention in the war. Long a pacifist, mussolini become an aggressive inter ventionist and urged that Italy join forces with the Allied Powers against Germany and confederates His stand resulted in his expulsion from the socialist party but he founded his own news paper "Popolo'd Italia, and continued to argue for war. when Italy entered the conflict, Moussolini joined the army and served AS an enlisted man

The restoration of peace brought to Italy the confusion and difficulties described above. In this setting Mussolini sought to create an organization capable controlling of the nation. His intial strategy was to appeal to the working class for support but in this he was unsuccessful. He then turned to the opposition. In 1919 he organized the fasci di combattiment (combat troops) often called the black shirts with which he terrorized the working people whose support he had formely sought in order to court favor with the industrialists major land owners, and elements of the middle class. 1921 the fascist tested their strength at the polls but made a dismal showing.

فاشزم :

فاشیت یا فاشزم ایک نظریہ کا نام ہے جس کی شبیہہ قدیم افلاطونیت میں بھی ملتی ہیں لاطینی لفظ فاشزم Fascio کے لفظ سے نکلا ہے۔ فاشزم نے ۱۹۱۹ء میں اٹلی میں جنم لیا مسولینی کو اس تحریک کا بانی کہا جاتا ہے۔ مسولینی کا خیال **ہے کہ فاشزم مادی اور اخلاقی قوتوں کی عظیم بیداری کا نام ہے۔** جس کا مقصد قوم پر حکمرانی ہے اور اس کا مقصد اٹلی کے باشندوں کی اخلاقی اور مادی عظمت کو طاقتور بنانا بھی ہے۔ اٹلی میں کلیت پسندی بذریعہ فاشیت کے ظاہر ہوئی۔ جنگ عظیم اول نے یورپ میں نیا جو تباہی پھیلائی اور اس کے نتیجہ میں جو معاہدہ ورسیلز برائے امن وجود میں آیا جس کے ذریعے جرمنی اور اٹلی کے حقوق کو بری طرح پامال کیا گیا۔ نظریہ فاشزم اس کی روک تھام کرنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے کہ جنگ عظیم اول کے بعد وقتی طور پر آزادی پسند جمہوریت کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ چونکہ مفتوحین اور شکست خوردہ قوتیں جنگ کی تباہ کاریوں سے بری طرح خوف زدہ ہو چکے تھے اس لئے امن کے خواہش مند تھے چنانچہ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی ورسیلز کے مقام پر متعدد ممالک کے مندوبین و ماہرین جمع ہوئے تاکہ معاہدہ امن کی شرائط کو عملی جامہ پہنایا جا سکے اس میں قومی ریاست کے نظریے اور حق خودارادیت کے اصول کی رہنمائی میں نئی ملکی حدود متعین کی گئیں اس طرح یورپ میں متعدد چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں جو کہ سیاسی' اقتصادی' معاشی و جغرافیائی لحاظ سے بہت ہی کمزور تھیں۔ یورپ میں امریکہ کی طرز کی وفاق و مرکزیت کا قیام عمل میں نہ آیا بلکہ ایک ادارہ کو قائم کیا گیا جس کا نام "انجمن اقوام" رکھا گیا اور ایسی انجمن اقوام کے منشور کو معاہدہ امن کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا لیکن اس بین الاقوامی تنظیم کو بڑی طاقتوں نے اپنے ذاتی مقاصد میں استعمال کرنا

شروع کر دی اور کئی نو آبادیاں اپنی تولیت میں لے لیں۔
انجمن اقوام کا توثیقی شعبہ اس بناء پر قائم کیا گیا کہ شکست خوردہ ممالک پر تاوان جنگ کا
بھاری بوجھ رقم کی صورت میں ڈال دیا جائے اس خیال کے پیش نظر جنگ کی کلی ذمہ داری جرمنی
کے سر تھوپ دی گئی۔ جبکہ جنگ کے بعد کسی بھی ملک کے اقتصادی نظام کو مضبوط بنانے کے لئے کوئی
بھی خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا۔ پوری دنیا کے اقتصادی مقاصد فاتحین کے سپرد کر دیئے گئے۔ اگرچہ
اجتماعی تحفظ کا انتظام کیا گیا لیکن اس سلسلے میں عملی طور پر کوئی کام انجام نہ دیا گیا جب بھی کسی قوم
اور کسی ملک نے جارحانہ رویہ اختیار کیا تو بڑی طاقتوں نے منافقانہ طور پر نظراندازی اختیار کی اور
کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ اور فتح حاصل کرنے کے بعد فرانس اور برطانوی حکومت میں ایک سکوت
طاری ہوگیا ان کے پاس فوج کی ایک بڑی تعداد موجود تھی لیکن وہ اس طاقت کو اور اس فوج کو عالمی
امن کو بحال کرنے کے لئے استعمال کرنے پر رضامند نہ تھے انجمن اقوام کو جارحانہ ممالک کے خلاف
کارروائی کرنے کا کلی اختیار تھا لیکن اس ادارہ امن نے اس اختیار کو کبھی بھی استعمال نہ کیا جب اٹلی
نے ۱۹۳۵ء میں حبشہ پر چڑھائی کی۔ جن ممالک نے انجمن اقوام میں اس جارحیت کو ناپسند کیا وہ خود ہی
اٹلی پر اقتصادی پابندی لگانے کے خلاف ہوگئے۔ اور اٹلی کے خلاف کسی قسم کا ایکشن نہ لیا اس طرح
کے دیگر حالات و واقعات جمہوری قدروں کو پامال کرنے کے لئے کافی تھے دوسری طرف نظریہ اشتمالی
عالمی انقلاب کا مقصد تھا منظر عام پر ظاہر ہوا۔ یورپ کے ان حالات نے جرمنی میں نیشنل سوشلزم اور
اٹلی میں فاشیت کو پھلنے اور پروان چڑھانے کا موقع فراہم کیا انجمن اقوام کے معاہدے میں شامل
فاتحین ریاستیں دراصل اپنی فتح کے نشے میں چور چور تھیں اور وہ مفتوحین سے زیادہ سے زیادہ فائدہ
حاصل کرنا چاہتی تھیں چنانچہ انہوں نے مفتوحین کو اقتصادی لحاظ سے کمزور کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔
جس کا اثر اٹلی اور جرمنی کی اقوام نے بھی کیا۔

فاشیت

پس منظر :

اطالوی جزیرہ نما میں انیسویں صدی کے آخری ایام میں متعدد ریاستیں قائم تھیں جن کو یکجا
کرنے کے لئے ماہرین سیاسیات گیری بالڈی اور کیوور جیسے رہنماؤں اور قائدین نے بھرپور جدوجہد کی
جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخرکار یہ تمام ریاستیں پیڈمونٹ کے بادشاہ وکٹر ایمانویل کے دور اقتدار اور
قیادت میں باہم یکجا ہوگئیں اور پیڈمونٹ ۱۸۴۸ء کا آئین پوری ریاست اٹلی کا آئین تسلیم کر لیا گیا۔
اس آئین کی مناسبت سے برطانوی طرز کی پارلیمانی حکومت اٹلی میں قائم کی گئی۔ اور جبکہ
انتظامی امور فرانسیسی طرز کے رائج کئے گئے مگر اس نظام جمہوریت میں بارہا خامیاں تھیں۔ جس کی وجہ
سے عوام کو آزادی پسند پارلیمانی جمہوریت چلانے میں بڑی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا تھا۔

چند ایک مشکلات اور رکاوٹیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ کمزور اور ناقص جماعتی نظام

۲۔ مقامی تعصبات کی مستحکم روایات۔

۳۔ غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت

۴۔ کئی سیاسی جماعتوں کا قائم ہونا

۵۔ غلط رواجات کی پیروی

ان اندرونی رکاوٹوں اور مشکلات کے علاوہ اٹلی بیرونی طور پر بھی مطمئن اور مربوط نہ تھا۔ (اٹلی نے جنگ عظیم اول میں بڑی طاقتوں (برطانیہ۔ فرانس۔ امریکہ) کا ساتھ اس بناء پر دیا کہ اسے افریقہ ایشیا اور البانیہ میں کئی علاقے حاصل ہو جائیں گے۔ لیکن جنگ کے خاتمہ پر اٹلی کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ جس کی وجہ سے اٹلی کو خاصا نقصان ہوا۔ کیونکہ اتحادیوں نے اٹلی کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک روا رکھا۔ جس کی وجہ سے اطالوی باشندے اس قسم کے رویے سے کافی مایوس ہوگئے۔)

جنگ کے اثرات سے اٹلی میں کئی معاشرتی' سیاسی اور اقتصادی مسائل پیدا ہوئے۔ حکومت کے مختلف شعبوں اور صنعتی اداروں میں بدعنوانی کا چرچا تھا۔ افراط زر اور بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔ ہڑتالوں کا رواج عام تھا۔ اور انہی حالات میں روس میں بالشویک تحریک زور پکڑ کر کامیابی کے دوراہے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے اثرات اطالوی محنت کشوں پر گہرے ہوئے۔ چنانچہ انہی دنوں اٹلی کا سرمایہ دارانہ نظام اور مراعات یافتہ طبقہ اشتمالی انقلاب اور رجحانات سے بری طرح خوف زدہ تھا۔ جو سپاہی جنگ کے بعد واپس آئے وہ بے روزگاری کا شکار ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے پارلیمانی نظام غیر موثر بن کر رہ گیا تھا۔ انتظامیہ نااہل اور کمزور تھی۔ اشتمالی نظام سے خائف سیاست دان بڑی تعداد نجی جائیداد کے اضافے میں مصروف تھے۔ محنت کش طبقہ کا کوئی پرسان حال نہ تھا مزدور طبقہ میں کشیدگی اور کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ پرولتاری طبقہ اپنی حق تلفی کے سبب ناراض تھا اور ایک شدید انقلاب کا خواہش مند تھا۔ اس سیاسی' اقتصادی' معاشی' معاشرتی انتشار اور کشیدگی نے مسولینی اور اس کے حواریوں کو فاشی تحریک کو پروان چڑھانے اور متعارف کرانے کا اسباب مہیا کیا۔

آغاز فاشیت :

فاشزم کا آغاز اٹلی سے ہوا۔ فاشزم دراصل Fascio سے مشتق ہے جس سے مراد ہے کہ "چھڑیوں کا گٹھا" یہ گٹھا اتحاد اتفاق' قوت اور تنظیم کا استعارہ ہے۔ زمانہ جنگ میں اس سے مراد ان لوگوں کا اتحاد تھا جو زندگی اور موت کے لئے یکساں اور اکٹھے تیار ہوں۔

۱۹۱۵ء میں میلان کے مقام پر مسولینی کی قیادت میں پہلی فاشیت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اشتمالیت کے حریف کے طور پر پیش کرنے کے لئے اس کی ۱۹۱۹ء میں دوبارہ تنظیم نو کی گئی اور ۱۹۱۹ء کے انتخابات پارلیمان میں اس نے شمولیت اختیار کی جس میں اس کو مکمل طور پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

یہاں تک کہ مسولینی کو بھی اپنے حلقہ ہائے انتخاب میں مکمل طور پر شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ مسولینی کو اس کی ناکامی کے سبب ایک زندہ لاش سے تشبیہ دی گئی ایک ایسی لاش جو قبر میں دفن ہونے کے لئے بالکل تیار ہو لیکن مسولینی نے اپنے عزم اور ہمت کے ساتھ اس لاش کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ تین سال کے کم عرصہ میں اٹلی کے اقتدار اعلیٰ کے تمام اختیارات پر بھی قبضہ کرلیا اور پھر فاشیت تیزی سے حکومت کی طرف بڑھتی گئی۔ **اس کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے** کہ جنگ عظیم اول کے بعد اٹلی میں ایک کمزور حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ معاہدہ امن میں جو ناانصافی اٹلی کے ساتھ ہوئی اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت کی ناقص پالیسی کی وجہ سے قرار دیا گیا اٹلی اگرچہ فاتح ممالک کی صف میں شامل تھا لیکن اس کو مقبوضہ علاقوں میں مناسب حصہ نہ فراہم کیا گیا بلکہ اٹلی کو قرضوں کے بوجھ سے لاد دیا گیا۔ عوام کے درمیان کشیدگی کی فضا نے ملک کے اقتصادی حالات کو کافی نقصان پہنچایا انہی دنوں اشتمالی کارکن اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور وہ کامیاب انقلاب برپا کرنے کے خواہشمند تھے پارلیمان کی کارروائیوں میں متعدد رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے حکومت کوئی اگلا قدم اٹھاتے ہوئے جھجکتی اور ڈرتی تھی۔

اس قسم کے حالات مسولینی کے لئے سومند ثابت ہوئے اور مسولینی متحدہ اٹلی میں ایک طاقتور مستحکم حکومت اور موزوں نظم و ضبط کو قائم کرنے میں کامیاب رہا جنگ عظیم اول کے دوران مسولینی نے اپنے نظریات کو چھوڑ دیا وہ **پہلے عالمی اشتراکیت کا علمبردار تھا** لیکن بعد میں ملکی حالات لوگوں کے جذبات دیکھ کر وہ حب الوطنی کے جذبے سے لبریز ہوگیا۔ اور اٹلی کو یورپ کی بڑی طاقت بنانے کا تہیہ کرلیا اس مقصد کے لئے مسولینی نے ایک فوج میں ایک ایسا دستہ تیار کیا جس کا کام محنت کش طبقہ کے انقلاب برپا کرنے والے اور ہڑتال کرنے والے افراد کو کچلنا تھا۔ اشتمالیت کے خلاف مکمل طور پر سرپیکار رہنا تھا اور فاشیت کے حریف کو پوری طرح ختم کرنا بھی اس فوجی دستہ کی ذمہ داری تھی **مسولینی جنگ سے پہلے اشتراکی نظریات کا حامی تھا اور اشتراکی** مفکر جارج مورلیل سے بہت زیادہ متاثر تھا اور اس تصور راست اقدام کو بہت پسند کرتا ہے۔ جنگ کے بعد مسولینی نے اپنے اشتراکی نظریات کو بدل دیا لیکن نظریہ راست اقدام سے اس نے بہت فائدہ حاصل کیا اور اسی راست اقدام کے ذریعے ہی اس نے اٹلی میں سیاسی طاقت مضبوط کی۔ اٹلی میں عام ہڑتال کا اعلان یکم اگست ۱۹۲۲ کو کیا اس ہڑتال نے مسولینی کو اس کے مفادات و مقاصد حاصل کرنے میں بڑی مدد کی مسولینی نے اپنی فوج کے ذریعے تمام حساس اداروں کو اپنے قبضہ میں لے کر ۲۴ گھنٹہ کے اندر مزدور اور محنت کش طبقہ کی اس ہڑتال کو ناکام کر دیا۔ اس راست اقدام نے آبادی کے زیادہ حصے میں اعتماد پیدا کر دیا۔ مسولینی کے اس حکمت عملی سے سب لوگ کافی حد تک مطمئن ہوگئے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مسولینی اور اس کے فوجی دستے روم کی طرف بڑھنے لگے جب کہ ملک کے حالات اس قدر خراب ہوگئے کہ حکومت پر برسراقتدار طبقہ ناکارہ اور بدنام ہو چکا روم میں سرکاری دفاتر۔ ریلوں ڈاک خانوں اور تار گھروں وغیرہ پر مسولینی کا قبضہ بغیر کسی جنگ و جدل کے ہوگیا۔

ان حالات میں حکومت نے راہ فرار کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی پھر مسولینی نے اس حکومت کا اعلان کر دیا۔ اور پھر ۲۴ جولائی ۱۹۴۳ء تک اٹلی کا حکمران رہا حکومت پر برسراقتدار آنے کے بعد مسولینی کے پاس ملک کے لئے کوئی مستحکم اور ٹھوس لائحہ عمل نہ تھا۔ اس لئے اس نے اعلان کیا کہ اٹلی کو لفاظی نظریات کی ضرورت نہیں بلکہ عملی امور انجام دینے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۲۶ء تک اس کی وزارتوں میں مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو شامل کیا گیا لیکن اس کے بعد حکومت نے مکمل طور پر فاشی آمریت کی شکل اختیار کر گئی۔ مسولینی نے نومبر ۱۹۲۶ء تک فاشی جماعت کے علاوہ تمام جماعتوں کو ختم کر دیا۔

اور آزادی پریس کا خاتمہ کر دیا بعدازاں متعدد قوانین و اصولوں کو لاگو کر کے وزارت کی پارلیمان کے سامنے جواب دہی کے طریقہ کو بھی ختم کر دیا ور جلد ہی مسولینی حکومت کا مختار کل بن گیا جو صرف بادشاہ کے سامنے جواب دہ تھا۔ ۱۹۲۹ء میں بادشاہ صرف نام کا حاکم تھا اس کے تمام اختیارات بھی آہستہ آہستہ مسولینی کی ذات میں منتقل ہو گئے۔

مسولینی نے حکم نامے جاری کرنے کا اختیار بھی حاصل کر لیا جنہیں ہر طرح سے قانون کا درجہ حاصل تھا۔ تمام وزراء مسولینی کے ساتھی نہ تھے بلکہ اب ایک جابر آمر کے ماتحت تھے اور مسولینی کے لئے قائد کا لقب اختیار کیا گیا۔

پھر ایوان نمائندگان کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک کارپوریٹو Carporative پارلیمان نے لے لی۔ یہ پارلیمان 400 چار سو اراکین پر مشتمل تھی۔ جو مختلف علاقوں کے نمائندے ہونے کی بجائے مختلف اقتصادی مفادات کی نمائندگی کرتے تھے۔

یہ ممبران اعلیٰ فاشی کونسل کے بااعتماد ساتھی اور کارکن تھے۔ اعلیٰ فاشی کونسل با اختیار ادارہ ہونے کے علاوہ قومی ریاست کی اعلیٰ کونسل بھی تھی۔ پارلیمان ایوان کے اختیارات محدود تھے یہ صرف سربراہ کی پیش کردہ تجاویز اور رائے پر غور و فکر کر کے مناسب اور موزوں سفارشات کر سکتی تھی جبکہ ایوان خود سے کوئی نئی تجویز پیش کرنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ اور اس طرح فاشی جماعت کا سربراہ ہی حکومت کا سربراہ بھی تھا۔ جس کو کافی اختیارات حاصل تھے۔ ایوان بالا کو سینٹ کا نام دیا گیا اور یہ سینٹ شاہی خاندان کے افراد کے علاوہ ان افراد کو بھی اپنے اندر شامل کرتی تھی جنہیں بادشاہ اپنے وزیراعظم کی رائے سے تاحیات نامزد کر کے تعینات کرتا تھا۔

سینٹ کو مسودہ قانون پر بحث کرنے کا مکمل اختیار حاصل تھا اس کے علاوہ سینٹ کے اختیار میں قانون میں ترامیم کرنے اسے منظور کرنے اور رد کرنے کا بھی اختیار حاصل تھا۔

اور بعض اوقات سینٹ بعض قوانین میں ترامیم کر کے انہیں دوبارہ ایوان کی طرف غور کرنے کے لئے بھیج سکتی تھی۔

یعنی سینٹ ریاست میں ایک ایسا ادارہ تھا جس میں شاہ اور حکمران کے بااعتماد لوگ شامل تھے اس لئے اس میں اہم امور انجام دیئے جاتے تھے۔ اسمیں قوانین پر نظرثانی بھی ہوتی اور ان میں ترمیم

بھی چونکہ اس کے ممبران تاحیات ممبر ہوتے تھے اس لئے وہ قابل اور ہر لوک شمار ہوتے تھے اور ان میں باصلاحیت اور قابل لوگوں کا ایک خاص گروہ شامل تھا۔

فاشی نظریہ:

مسولینی کا خیال ہے کہ آزادی پسند جمہوریت دراصل ایک عیاشی ہے جس کے برطانیہ فرانس یا امریکہ [illegible] سکتے ہیں۔ مگر یہ نظام حکومت اٹلی جیسے ترقی پذیر ملک کے لئے [illegible] اٹلی کو تنظیم اور مضبوط قیادت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اٹلی کے نظام حکومت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس ملک میں جمہوریت کو بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور جمہوریت کی ناکامی کے ساتھ ساتھ مغرب کے جمہوری ممالک نے معاہدہ امن کے وقت اور اس کے بعد اٹلی کو ہر طرح سے کمزور کرنے کی کوشش کی اس لئے مسولینی نے کہا کہ اٹلی کو جمہوری نظام راس نہیں۔ بلکہ اس ملک کے لئے یہ ناموزوں نظام ہے۔ جمہوریت پر سے اعتماد ختم ہونے کے بعد اٹلی کی عوام کو انجمن اقوام پر بھروسہ نہ رہا۔ کیونکہ وہاں بھی برطانیہ فرانس اور امریکہ جیسے ممالک اپنی طاقت کا سکہ منوائے ہوئے تھے اس بناء پر اٹلی کی تمام امیدوں کا مرکز مسولینی کی ذات تھی۔ اور اٹلی کی عوام مسولینی کو ہی اپنا نجات دہندہ تسلیم کئے ہوئے تھے چونکہ قدیم رومن سلطنت کے آثار ابھی زندہ تھے اس سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے قومی جارحانہ پالیسی کی اشد ضرورت تھی۔ جو صرف فاشی تحریک کے ذریعے ہی ممکن تھی جبکہ فاشی تحریک نے جب اپنی ذمہ داری سنبھالی تو اس کے پیچھے کوئی باقاعدہ منصوبہ اور لائحہ عمل اور باقاعدہ اصول اور قواعد نہ تھے۔ بلکہ جنگ عظیم اول کے بعد اٹلی کے اندرونی حالات نے جو رخ اختیار کر رکھا تھا فاشیت اس کا نچوڑ تھا۔ یہ فاشیت تحریک قومی اقدام کا پرچار کر رہی تھی۔ اور انفرادیت سرمایہ دارانہ نظام اور پارلیمانی جمہوریت جیسے تمام نظاموں اور عناصر کی شدید مخالف تھی۔ اشتمالیت کو بہت ہی زیادہ ناپسند کرتی تھی۔ جبکہ فاشی نظریہ کے مبسوط اصول ناپید ہیں۔

اگر فاشی تحریک کے قواعد و قوانین پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے تمام اصول و قواعد یا تو کئے ہوئے اقدامات و وقعات کی حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے بنائے گئے یا ان اقدامات کے حق میں بنائے گئے جنہیں فاشی حکومت اختیار کرنا چاہتی تھی۔ اس طریقہ کار کو دیکھتے ہوئے پروفیسر سیباشن نے فاشی نظریے کو بنیادی طور پر غیر عقلی قرار دے دیا۔

کیونکہ فاشی نظریہ دراصل قومی یک جہتی اور عمل کا حامی ہے اور صلح و مصالحت، بحث و مباحثہ، بین الاقوامی کے جمہوری قواعد اور بین الاقوامی تحریک کو شدت سے ناپسند کرتی تھی۔ اس لئے فاشیوں کو دلائل اور عقلیت پسند Relationalism پر ذرا اعتماد نہ تھا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ نظریہ انسانی جذبات پر زور اپیل کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے فوجی تنظیم نعرہ بازی اور آتش بیانی جیسے ذرائع بروئے کار لاتا ہے فاشیوں کا خیال ہے کہ معاشرے کے تمام افراد نہ تو سیاسی معاملات میں

مداخلت کے خواہاں ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ پورے معاشرے پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں درمیانے درجے کے طبقات نہ تو حکومت کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور نہ ہی صنعتوں کو اپنی گرفت اور قبضے میں لینے کے خواہاں ہوتے ہیں اور اگر انہیں زندگی میں کسی چیز میں دلچسپی ہے تو وہ ان کی روزی ہے یعنی روزگار کی فراہمی تک ان کی سوچ محدود ہے یا پھر قومی رہنماؤں کی بلا روک ٹوک ان کی پیروی کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹلی میں پارلیمانی جمہوریت کی جڑیں کبھی مستحکم نہ ہو سکی نہیں۔ اس لئے اٹلی کی عوام کے لئے آمریت کوئی نئی چیز نہ تھی۔ فاشی تحریک جماعتی نظام کو کمزور طرز حکومت قرار دیتی ہے اور صریح الفاظ میں ایک جماعت کی حکومت کا اصول تسلیم کرتی ہے۔ اس لئے فاشی ریاست میں حزب اختلاف اور حریف لوگوں کی کوئی جگہ نہیں یہی وجہ تھی کہ مسولینی نے اٹلی پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد تمام مخالفین اور عناد پرست اور شرپسند عناصر کا قلع قمع کر دیا یا پھر ہمیشہ کے لئے خاموش رہنے پہ مجبور کر دیا۔ فاشی جماعت نئی روح کا ظاہری روپ سمجھ لی گئی اور اس کو ناپسند کرنے والے عناصر کو ملک دشمن عناصر سے تشبیہ دی گئی صرف یہاں تک ہی نہیں بلکہ ٹریڈ یونین اداروں کا خاتمہ کر کے نئی فاشی مزدوروں کی تنظیمیں قائم کی گئیں۔ اگر اٹلی کی فاشی مزدور تنظیموں کا مقابلہ نازی جرمن تنظیموں سے کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کو نازی جرمن کی نسبت کافی حد تک اندرونی خود مختاری حاصل تھی۔

جائزہ :

فاسی کے ارتقاء پر نظر دوڑانے کے بعد اگر اس کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ فاشی تحریک اٹلی میں دباؤ، خوف و ہراس، جنگ و جدل کا دوسرا نام تھا۔ اٹلی میں فاشی نظام ۲۰ بیس سال سے زیادہ عرصہ کامیابی سے چلتا رہا۔ اس کا بڑا سبب مسولینی کی پرزور سربراہی تھی۔ جب مسولینی اقتدار پر قابض ہوا اس وقت اٹلی کی حیثیت مغربی ممالک کے نزدیک ایک غریب ملک سے زیادہ نہ تھی لیکن مسولینی کی جدوجہد نے اور دن رات کی تگ و دو نے تھوڑے ہی عرصہ میں اٹلی کو یورپ کی سب سے بڑی طاقت کے روپ میں دنیا کے سامنے متعارف کروایا جس نے شمالی افریقہ میں نئے مقبوضات کے حصول کے لئے اپنی تمام تر توجہ صرف کر دی۔ جس بناء پر اشتراکی اور اشتمالی تحریکیں اپنے قدم جمانے میں ناکام اور نامراد رہیں اس کے مقابلے میں لیکن یہ مسولینی اور فاشیت تحریک کا نمایاں کارنامہ ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد تھوڑے عرصہ ہی میں اٹلی کو ایک مستحکم قیادت فراہم کی۔ اشتراکیت پسند پارلیمانی ذہنیت کے غلام بن کر رہ گئے اور دلیل و اصول کے ذریعے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف اشتمالیت پسند طبقاتی کشیدگی اور عالمی انقلاب کے نعرے لگا کر نہ ہی صرف سرمایہ داروں اور درمیانے طبقے کے لوگوں کو خوف زدہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے محنت کش طبقہ کی بڑی تعداد بھی ان نعروں سے خوف زدہ تھی۔ ان حالات میں مسولینی کے لئے اقتدار حاصل کرنا اور تمام لوگوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنا بڑی آسان بات تھی۔ فاشیت کے حامی مکمل طور پر قوم پرست تھے لیکن ان کی

قوم پرستی کے نظریے اور جارحیت جیسے عناصر پر مشتمل تھی۔

علی الاعلان جنگ اور سلطنت کو وسیع بنیادوں پر قائم کرنے کے خواہش مند ہیں ان کے اس قول و عمل سے اس طرح معلوم ہوتا کہ جیسے میکاولی ایک بار پھر اپنے نظریات کے ہمراہ زندہ ہو گیا ہے۔ جو اٹلی کی فلاح کے لئے ہر جارحانہ اقدام کو جائز قرار دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم دوم میں اٹلی نے اپنے مفادات کو ترجیح دی اور موقع پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے مواقع سے فائدہ حاصل کرنے کی جدوجہد تیز کر دی۔ جب دوسری جنگ عظیم کے دوران اٹلی نے محسوس کیا کہ فرانس روز بروز کمزور اور فاشی بدحالی کا شکار ہو رہا ہے تو اس نے فرانس کی جگہ جرمن کا ساتھ دیا اور اس طرح فرانس کو شکست سے دوچار کرنے میں جرمن کی بھرپور مدد کی۔

فاشی تحریک دیگر اقوام کے ساتھ پرامن تعلقات قائم کرنے کی بھی مخالف تھی اور بین الاقوامی امن کو بزدلی کے متناسب گردانتے ہیں مسولینی کے خود اپنے الفاظ ہیں کہ امپیریلزم زندگی کا ازلی ابدی قانون ہے۔ مسولینی نے قوم کی بزدلی کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ ہم تعداد میں چار کروڑ ہیں لیکن ایک مگر خوبصورت جزیرہ نما ریاست میں سمائے ہوئے ہیں۔

مسولینی نے اعلان کیا کہ اگر اٹلی اپنی حدود سے باہر نہ نکلا تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ گنجان آبادی سے باہر نکلنے کے لئے چھوٹی سی بات کو کشیدگی کا نام دے کر حبشہ پر فوج کشی کر دی آخر کار ۱۹۳۶ء میں اس ملک پر اٹلی کا قبضہ ہوگیا۔ مسولینی نے کہا کہ اگر اطالوی سلطنت وسعت نہ دی گئی تو اپنی موت آپ مرجائے گی۔ ایک بار مسولینی نے یہ بھی کہا کہ صرف جنگ تمام انسانی قوموں کو مضبوط کرتی ہے اور ان لوگوں پر بزرگی کے نشان چھوڑتی ہے جو میدان کارزار میں اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ ان تمام اقوال و اعمال کے ذریعے دراصل فاشی تحریک نے عوام کی توجہ داخلی مسائل سے ہٹانے کے لئے کی۔ اور دانستہ طور پر ایسی داخلی پالیسی پر عمل درآمد کیا گیا جس کا خارجی نتیجہ جنگ و جدل تھا۔ دراصل فاشیت نہ ہی عالمگیر امن و سکون کو ممکن سمجھتی ہے اور بین الاقوامی اقلیت کو مانتی ہے۔ فاشی ریاست انفرادی آزادی اور مساوات جیسے جمہوری قواعد کو ناپسند کر کے مطلق العنانیت پسندی کی طرف اقوام کو راغب کرتی ہے فاشی ریاست کا شہری صرف ریاست کی بقاء کے لئے زندہ رہتا ہے زندگی کا مقصد ریاست کی برتری ہے اور افراد کی تمام تر تگ و دو اس ریاست کے بقاء کے لئے ہے۔ فاشی تحریک کے حامیوں کا خیال ہے کہ سچ اور حقیقت وہی ہے جس کو ایک آمر سچ اور حقیقت کے روپ میں تسلیم کرکے باقی تمام اقوال و اعمال جھوٹے اور باطل ہیں تمام افراد ایک اضافی چیز ہیں فاشیت دراصل قومی تفوق کا جذبہ لے کر آگے کی طرف بڑھی جبکہ نازیت نسلی برتری اور قومی عظمت کو لے کر پروان چڑھی۔ مگر ان دونوں کے پس پردہ مایوسی اور محرومی کا جذبہ کارفرما تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریہ فاشیت صرف ایسے ممالک میں پروان چڑھ سکتا ہے جو جمہوریت کا تجربہ رکھتے ہوں لیکن اس علاقے میں جمہوریت کی جڑیں ابھی مستحکم نہ ہوئی ہوں لیکن جن ممالک میں لمبے عرصہ تک جمہوری حکومت برسر اقتدار رہی ہو وہاں پر فاشی تحریک

کی کامیابی اور نشوونما ممکن نہیں۔ نظریہ فاشیت کی کامیابی کے لئے لازم ہے کہ ملک صنعتی تجربے سے بالکل محروم نہ ہو۔ نظریہ فاشیت اپنے ابتدائی ادوار میں صنعت کاروں' سرمایہ داروں اور زمینداروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی دعوت دیتا ہے جو اشتمالیت یا دوسری انقلابی سیاسی تحریکوں سے بچنے کے لئے اس کے ہمراہ ہو جائیں جبکہ متوسط طبقہ فاشیت کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ وہ ایسے معاشرے کو ناپسند کرتا ہے جس میں مزدور کو فوقیت حاصل ہو۔

بعض سیاسی ماہرین کا خیال ہے کہ کشیدگی ناامیدی اور بے بسی کے دور میں ووٹ فاشیت کے بے حد پرستار اور پیروکار ہوتے ہیں جو مایوس ناامید بے روزگار ہوں اور جنہیں معاشرہ نظر انداز کر چکا ہو۔

فاشیت کو جمہوریت پسند ممالک بڑھنے کا موقع فراہم نہیں کرتے کیونکہ یہ مرکزیت اور بین الاقوامی امن کو پسند نہیں کرتی۔ فاشی تحریک میں زیادہ تر ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کا تعلق متوسط طبقہ سے ہو۔ فاشیت سرمایہ داروں کو تحفظ فراہم کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے روزگار اور افلاس زدہ افراد کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہے۔

فاشزم کے بنیادی اصول (Basic Principles of Fascism)

فسطائیت کے بنیادی اصول یا تصورات جن کے سہارے اس تحریک نے کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا درج ذیل ہیں:

1- طاقت کا استعمال

فسطائی مفکرین کے نزدیک مقصد کے حصول کے لیے طاقت کا استعمال انتہائی ضروری ہے۔ اس ضمن میں اٹلی کا فسطائی رہنما مسولینی یوں رقمطراز ہے "فسطائیت فکر بھی ہے اور عمل بھی۔ یہ تحریک بعض قسم کے اداروں کو تخلیق کرنے کے لیے معرض وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ انسان کی روحانی زندگی کی معلمہ بھی ہے۔ یہ انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا عزم رکھتی ہے۔ اس کے پیش نظر انسان، اس کے اخلاق اور اعتقادات کو تبدیل کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ طاقت کے استعمال کو بالکل ٹھیک اور جائز گردانتی ہے۔"

2- قوم پرستی

فسطائیت کے علمبرداروں نے اقتدار کی ہوس اور طاقت کے نشے کے لیے قوم پرستی کے جذبے کو بہت زیادہ اہمیت دی بلکہ انہوں نے اس کے لیے قوم پرستی کے جذبے کو خوب پروان چڑھایا۔ [illegible] فسطائی حکمران [illegible] اس سلسلے میں کہتا ہے فسطائیت ایک ایسا عقیدہ ہے جو خون، رنگ، نسل اور شخصیت کی [illegible] ہے۔"

3- مملکت کی اہمیت

فسطائیت کے علمبردار اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ مملکت کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ مقصود بالذات ہے۔ اس میں الوہیت کی صفات بھی موجود ہیں اس لیے انسان کو اس کے آگے سرنگوں رہنا چاہیے۔ ان کے نزدیک انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ مملکت کی پرستش کرے اور اپنی زندگی کو ریاست کی زندگی سے منسلک سمجھے۔

4- فرد کی نفی

اس نظریے کے مطابق فرد کی اپنی کوئی الگ حیثیت نہیں ہے اس کا جینا اور مرنا صرف ریاست کے لیے ہونا چاہیے۔ فرد کا وجود ریاست کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے اور اسے اپنی زندگی ریاست کے لیے ماتھے پر شکن ڈالے بغیر قربان کر دینی چاہیے۔

5- ریاست کی ہمہ گیریت

فسطائیت کا پرچار کرنے والوں کے نزدیک ریاست کی حیثیت ایک ہمہ گیر ادارہ کی ہے۔ اور ریاست کے وجود کے علاوہ کسی دوسری چیز کا وجود نہیں۔ ریاست ہے تو فرد ہے ریاست نہیں تو فرد کا وجود بھی نہیں۔ اس نظام میں ریاست فرد کو صرف اس حد تک تسلیم کرتی ہے جب اس کے فرد کے مفادات ہم آہنگ رہیں۔ اس سلسلہ میں اٹلی کا فسطائی رہنما مسولینی کہتا ہے:

> زندگی کے فسطائی تصور میں ریاست کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ تصور ایک فرد کے وجود کو اسی حد تک تسلیم کرتا ہے جس حد تک اس کا مفاد ریاست کے مفاد سے ہم آہنگ ہو۔ ہمارے اس نظام فکر میں ریاست ہمہ گیر ہے۔ اس سے ہٹ کر نہ تو کسی انسانی یا روحانی قدر کو مانا جاسکتا ہے اور نہ اسے کسی قدر و قیمت کا حامل سمجھا جاسکتا ہے۔ جو کچھ بھی دنیا میں موجود ہے وہ ریاست کے دم قدم سے ہے۔ ریاست کے علاوہ دنیا میں کسی دوسری چیز کا وجود نہیں۔"

6- حکومت کے اختیارات

فسطائیت کے تصور سیاست میں حکومت کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے کہ اسے لامحدود اختیار کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اس تصور کے مطابق حکومت اپنے اعمال اور دائرہ اختیارات میں بالکل آزاد ہے اور اس پر کسی قسم کی کوئی بھی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔

7- مذاہب واخلاق

فسطائی تصور سیاست میں مذہب اور اخلاقیات کو صرف اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے جس قدر یہ

ریاست اور حکومت کے مقاصد کے حصول کے لیے مدد معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر مذہب اور اخلاق و پر بیان کردہ مقاصد کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکیں تو انہیں اختیار کرنے، ان پر عمل پیرا ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر وہ ان مقاصد کے حصول کے راستے میں حارج ہوں تو انہیں چھوڑنے میں بھی [illegible] نہیں ہے۔

[illegible] (Positive Aspects of Fascism)

جس طرح کسی بھی نظام سیاست کے مثبت اور منفی پہلو ہوتے ہیں اسی طرح فاشزم بھی [illegible] سے مبرا نہیں ہے۔ اس کے جہاں مثبت پہلو ہیں وہاں منفی پہلو بھی ہیں جنہیں اس نظریہ کے مخالف [illegible] بناتے ہیں۔ یہاں ہم سب سے پہلے اس تصور کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جو مندرجہ ذیل [illegible]

1- معاشی اونچ نیچ کی حوصلہ شکنی

فسطائیت کے حامی معاشرے میں معاشی تفاوت کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ ان [illegible] معاشرے میں جتنا معاشی تفاوت کم ہوگا معاشرہ اتنی ہی زیادہ ترقی کرے گا اور ریاست کو معاملات [illegible] آسانی میسر ہوگی۔

2- انفرادی حق ملکیت

فسطائیت میں ہر فرد کو نجی ملکیت کا حق حاصل ہے۔ فسطائی نظریات کے حامی اس بات [illegible] ہیں کہ اگر انفرادی ملکیت کا حق اجتماعی مفاد کے تحت ہو تو یہ قومی ترقی میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے [illegible] کے مراحل احسن طریقے سے طے کر سکتی ہے۔

3- سودی کاروبار کی حوصلہ شکنی

فسطائیت میں سود پر مبنی کاروبار کی مذمت کی گئی ہے۔ فسطائی تصور سیاست کے حامی اس بات پر متفق ہیں کہ سود معاشی ترقی کا ضامن نہیں بلکہ اس کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ سود کے کاروبار [illegible] بعض طبقات کو بعض طبقات کی نسبت آسانی سے دولت مل جاتی ہے جس کی وجہ سے ایسی دولت حاصل کر [illegible] افراد سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سستی اور کاہلی ایسا مرض ہے جو ریاست کی ترقی اور نشوونما میں [illegible] بنتا ہے۔ چونکہ فسطائیوں کے نزدیک ریاست سب سے مقدم ہے اس لیے ہر وہ چیز جو ریاست کے [illegible] وہ ہو وہ قابل مذمت ہوتی ہے۔

4- آجر و اجیر کے حقوق و فرائض کا تعین

فسطائیت میں آجر اور اجیر کے حقوق و فرائض کا تعین واضح انداز میں کر دیا گیا ہے۔ ایسا کر [illegible] معاشرے کے یہ دونوں طبقات اپنی اپنی حدود میں رہتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ [illegible] اور

اپنے فرائض سے غفلت کا ارتکاب کرنے کا موقع نہیں ملتا جس سے معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن رہتا ہے اور ریاست کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آسانیاں میسر آتی ہیں۔

5- بیماروں، بوڑھوں اور معذوروں کے حقوق

فاشزم میں ضعیف شہریوں، اپاہج افراد اور بیماروں کے حقوق کا خیال رکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے فسطائی اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ان افراد کے حقوق کے تحفظ کے لیے سوشل انشورنس کا قیام عمل میں لانا چاہیے تاکہ معاشرے میں موجود بوڑھے، بیمار اور معذور افراد بھی احسن طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ فاشزم لاکھ برا نظام سیاست سہی لیکن اس کے اس لائحہ عمل سے جزوی طور پر ہی سہی ایک فلاحی ریاست کا مبہم سا خاکہ ضرور ابھرتا ہے۔

6- معاشی وسائل کا بہتر استعمال

سیاست اور معیشت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور ایک کے مسائل دوسرے کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ اگر ریاست میں کرپشن ہو تو اس کا اثر اقتصادیات پر لازمی ہے، اور اسی طرح اگر اقتصادی حالت پتلی ہو تو قومی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ لہٰذا سیاسی استحکام کے لیے فسطائیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ معاشی وسائل کو بہتر انداز میں استعمال کیا جائے تاکہ سیاست پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوں۔ اس مقصد کے لیے فسطائیت میں تنظیم کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں معاشی وسائل بہتر انداز میں استعمال ہوتے ہیں اور بے روزگاری کا خاتمہ ہوتا ہے۔

فسطائیت کے منفی پہلو (Negative Aspects of Fascism)

فاشزم کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے منفی پہلو بھی ہیں جن پر اس نظریے کے مخالف کھل کر تنقید کرتے ہیں۔ یہ پہلو درج ذیل ہیں۔

1 شخصی آزادی کا خاتمہ

فسطائیت پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں شخصی آزادی بالکل سلب کر لی جاتی ہے اور فرد کی زندگی کا مقصد ہی ریاست کی بقاء کا ضامن ہونا قرار دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق حکومتی پارٹی سے اختلاف سنگین جرم قرار دیا گیا، جس سے ایک پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ قائم نہ کرنے کی راہ ہموار کی گئی۔ اس کا یہ پہلو جمہوری روح کے خلاف ہے اس لیے فسطائیت کو جمہوریت دشمن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں فرد سے اختلاف کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ گویا برسراقتدار پارٹی یا حکومت فرد کو اپنی زنجیروں میں جکڑ کر رکھتی ہیں۔ فسطائیت فرد کو انسان نہیں بننے دیتی بلکہ موم کی ایک ایسی ناک بنا کے رکھ دیتی ہے۔ جب چاہا جدھر چاہا اپنی مرضی سے موڑ لیا۔

2 ٹھوس نظریے کا فقدان

فسطائیت میں مقاصد کے حصول کے لیے کوئی ٹھوس نظریہ پیش نہیں کیا گیا بلکہ اس میں صرف انسانی

جذبات کو ابھار کر ان کا استحصال کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اٹلی جو کبھی فسطائیت کا گہوارہ تھا ... را ... ایسا بنانے والا مسولینی تھا جس کے بارے میں اس کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے۔

"یہ عظیم شخصیت (مسولینی) صرف جذبات کے تحت کام کرنا جانتی تھی۔ کوئی عقلی دلیل، کو... عملی مشورہ اسے قبول نہ تھا۔ وہ انہی لوگوں کو قبول کرتا جو اس کے منہ سے نکلنے والی ہر بات بلا ہچکچاہٹ سنتے اور بلا تامل اس پر عمل کرتے۔ وہ جن چیزوں کو حق سمجھتا، عوام انہیں اس حیثیت سے مانتے غرض یہ کہ دنیا کے حقائق کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھالنے ہی میں اپنی سب سے بڑی سعادت خیال کرتے۔ یہ شخص بھی اپنی فکر و شعور کی قوتوں سے زیادہ کا... لینا پسند نہ کرتا بلکہ صرف اپنے جبلی داعیات کی رہنمائی میں اپنا لائحہ عمل تیار کرتا۔"

3- جنگ پر زور

اس تحریک نے جنگ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی بلکہ جنگ اور امن کے بارے میں ہٹلر ... کے خیالات جان کر تو بندہ اس تحریک کو امن عالم کی دشمن تحریک کہہ سکتا ہے۔

ہٹلر اپنی کتاب میری جدوجہد (My Struggle) میں یوں رقمطراز ہے "کوئی اتحا... جس میں جنگ کی نیت شامل نہ ہو بالکل بے کار ہے۔"

اسی طرح امن کو ایک بے کار اور فضول شے کہنے والا مسولینی جنگ کو یوں خوش آمدید کہتا...:

"اے جنگ خوش آمدید! کیا مجھے یہ نعرہ بلند کرنے کی اجازت ہے۔ تین بار مرحبا، اے اٹلی کی جنگ، تو مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ حسین ہے۔"

فسطائیت کے محاسن و نقائص کا جائزہ لینے اور ہٹلر اور مسولینی کے نظریات جاننے کے بعد ... کہہ سکتے ہیں کہ فسطائیت ایک ایسی طاقتور مملکت کے قیام کی خواہاں ہے جس کے کسی بھی اقدام پر اس کا کوئی ... فرد ... کسی بھی قسم کی تنقید نہیں کر سکتا۔ یہ آمریت کا وہ روپ ہے جہاں تنقید کا جواب گولی یا پھانسی سے بھی دیا جا... ہے ... ایک فرد کے توسیع پسندانہ نظریات کے لیے لاکھوں افراد کو جنگ کی ہولناک بھٹی میں بھی جھونکا جا سکتا ہے۔ یہ تحریک جہاں فرد کو ذاتی ملکیت کا حق دیتی ہے وہاں اس کی زندگی چھین لینے کا حق رکھتی بھی ہے، اس ... جہاں بیماروں اور بوڑھوں کو سوشل انشورنس کا تحفظ فراہم کیا جاتا ہے وہاں ان کے سروں پر ہر وقت جنگ کی تلوار ... آویزاں رکھی جاتی ہے۔ چونکہ اس تحریک کا بنیادی ماخذ طاقت تھا اور طاقت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی اس لیے یہ تحریک بھی اٹھی اور اس نے جرمنی اور اٹلی کو اپنی گرفت میں لے لیا، انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی اور بالآخر اپنی موت آپ مرگئی۔

سوال: مغرب میں سیکولرازم ایک نظریہ کی حیثیت سے بیان کریں۔ 2002ء، 2003ء

جواب

تمہید و مطالب

لفظ سیکولر (Cecular) کے لغوی معنی دنیوی امور سے متعلق، کلیسا یا خانقاہ سے بے تعلق اور روحانی، مذہبی یا مقدس کی ضد کے ہیں۔

سیاسی اصطلاح میں سیکرلرازم ایک ایسی تحریک ہے جو حکومت اور مذہب کی علیحدگی پر زور دیتی ہے۔

Secularism کی اصطلاح سب سے پہلے برطانوی مصنف جارج ہولی اوک نے 1846ء میں استعمال کی کیونکہ جارج ہولی اوک نے 1846ء میں یہ اصطلاح استعمال کی لیکن اس طرح کی آزاد خیالی کی جڑیں ہمیں سارے انسانی تاریخ میں ملتی ہیں۔ خاص طور پر ابتدائی سیکولر تصورات ہمیں ابن رشد کے فلسفے میں ملتے ہیں جہاں وہ فلسفہ اور مذہب کے ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے پر زور دیتے ہیں۔

جارج ہولی اوک نے سیکولرازم کی اصطلاح اپنا سوشل آرڈر پیش کرنے کے لیے ایجاد کی جو مذہب سے بالکل الگ ہو لیکن اس نے ایسا کرتے ہوئے نہ تو زیادہ سرگرمی سے مذہبی عقائد پر تنقید کی اور نہ انہیں رد کیا۔ ہولی اوک کے مطابق سیکولرازم عیسائیت کے خلاف ایک دلیل نہیں بلکہ اس سے بالکل آزاد ہے۔ سیکولرازم عیسائیت کے بنیادی عقائد کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتی بلکہ وہ کچھ اپنے خیالات پیش کرتی ہے۔

ہولی اوک کے مطابق سیکولرازم یہ نہیں کہتی کہ دنیا کو کہیں اور سے کوئی ہدایت یا رہنمائی نہیں ملتی بلکہ وہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ سیکولر حقائق کی اپنی ایک رہنمائی اور ہدایت ہے جو اپنا آزادانہ وجود قائم رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ سیکولرازم کے علمبردار سیاست اور مذہب کا ایک دوسرے سے الگ رہنے کا فلسفہ پیش کرتے ہیں۔

سیکولرازم کے اصول (Principles of Secularism)

تمام دیگر سیاسی تحریکوں کی طرح سیکولرازم کے بھی کچھ بنیادی اصول ہیں جن کے تحت یہ امور ریاست چلانے پر زور دیتی ہے۔ سیکولرازم کے یہ اصول درج ذیل ہیں۔

1۔ مذہب اور حکومت کی الگ الگ حیثیت

سیکولر خیالات کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں بعض اعمال اور ادارے، مذہب یا مذہبی عقائد سے بالکل الگ ہونے چاہئیں۔ یہ نجی اور اجتماعی زندگی میں مذہبی سوچ پر سیکولر سوچ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ حکومت کو عوام پر کوئی بھی مذہب مسلط نہیں کرنا چاہیے۔

2- ریاست کی غیر جانبداری

سیکولرازم کے علمبردار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مذہب کے معاملے میں ریاست کو غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ اور یہ بھی کہ ریاست مذاہب کو کسی قسم کی خصوصی رعایت یا سبسڈی دینے کی بھی مجاز نہیں ہونی چاہیے۔ ان کے مطابق انسان کے سیاسی فیصلے اور سرگرمیوں کی بنیاد ثبوت اور حقائق پر مبنی ہونی چاہیے کہ انہیں مذہب کے زیر اثر ہونا چاہیے۔

3- جدیدیت کی طرف سفر

بہت سے یورپی ممالک میں سیکولرازم کو جدیدیت کی طرف لے جانے والی تحریک سمجھا جاتا ہے جس کا روایتی مذہبی اقدار سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی سیکولرازم میں کسی حد تک ریاستی مذہب اور ریاست کی طرف سے مذہب کی حمایت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی سیکولرازم کے بعض علمبرداروں کا خیال ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سیکولرازم نے کافی حد تک مذہب کو حکومتی مداخلت سے تحفظ فراہم کیا ہے۔

4- جمہوریت کی مددگار

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ سیکولرازم حکومت اور ریاستی مذہب کے درمیان تعلقات کو ختم کرنے پر زور دیتی ہے۔ اس کے حامیوں کا خیال ہے کہ سیکولرازم نے اپنے اس طرز عمل سے مذہب کی بنیاد پر روا رکھا جانے والا امتیاز ختم کر کے مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔ اور یہ جمہوریت کا وصف ہے کہ اس میں تمام شہریوں کو برابر شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح سیکولرازم نے مذہبی بنیاد پر پائے جانے والے امتیاز کو ختم کر کے جمہوریت کے تاثر میں اضافہ کیا ہے۔

5- مذہبی قوانین کے بجائے سول لاز پر زور

سیکولرازم کے حامیوں کا نقطہ نظر ہے کہ ریاست میں موجود قوانین کی بنیاد مقدس کتابوں سے ملنے والے قوانین پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان کی جگہ معاشرے میں سول قوانین (Civil Laws) کا نفاذ ہونا چاہیے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اس بات کا حوالہ دیتے ہیں کہ مذہبی قوانین میں ریاستی مذہب کے پیروکاروں کے علاوہ دوسرے مذہب کے حامیوں کے حقوق متاثر ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس لیے ریاست کو چاہیے کہ وہ مذہب کے بجائے سول لاز کا نفاذ یقینی بنائے۔

[illegible]

مذہب اور ریاست کے الگ الگ ہونے کی بناء پر سیکولرسٹ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں

سیاست انوں کو چاہیے کہ وہ فیصلے کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھیں کہ یہ فیصلے مذہبی بنیادوں پر نہیں بلکہ سیکولر بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔ اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض تنظیموں نے اسقاط حمل، جنسی تعلیم اور ہم جنس شادی سے متعلق قانون سازی پر بھرپور توجہ دی۔ ان تنظیموں میں سرفہرست امریکی تنظیم "سنٹر فار انکوائری" (Centre for Inquiry) رہی۔

سیکولرازم کی اقسام
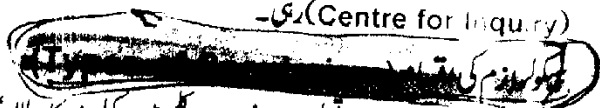
بیری کاسمن جن کا تعلق "معاشرے اور کلچر میں سیکولرازم کا مطالعہ" کے ادارے سے ہے، نے جدید سیکولرازم کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ جن میں ایک Hard Secularism یعنی سخت گیر سیکولرازم اور دوسری لچکدار سیکولرازم یعنی Soft Secularism ہے۔ یہاں ہم ان دونوں اقسام کی مختصر تفصیل بیان کرتے ہیں۔

1 سخت گیر سیکولرازم (Hard Secularism)

بیری کاسمن کے مطابق سخت گیر سیکولرسٹ مذہبی قوانین و عقائد کو علمی حوالے سے مغالطے پر مبنی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان اصول و ضوابط کی توثیق نہ تو مذہبی حوالے سے اور نہ ہی تجربے سے ہو سکتی ہے۔

لچکدار سیکولرازم (Soft Secularism)

لچکدار سیکولرسٹ طبقہ فکر کے نزدیک مطلق سچائی کا حصول ناممکن ہے اس لیے تشکیک پسندی اور قوت برداشت سائنسی اور مذہبی مباحث کا اصل اور فائق اصول ہونا چاہیے۔

سیکولرازم کے حق میں اور مخالف دلائل

(Arguments for and Against Secularism)

سیکولرازم کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس تحریک کی وجہ سے تمام سیکولرازم ریاستوں میں مذہب زوال کا شکار ہوا ہے اور یہ سب خرد افروزی یعنی (Age of Enlightenment) کی وجہ سے ہوا ہے۔ لوگوں نے توہم پرستی اور مذہبی عقائد سے ہٹ کر سائنسی اور عقلیت پر مبنی سوچ اپنائی ہے۔

اس کے برعکس سیکولرازم کے مخالفین کا نظریہ ہے کہ سیکولر حکومت جتنے مسائل حل کرتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر مسائل پیدا کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔ اور ایک مذہبی اعتقادات پر مبنی یا کم از کم غیر سیکولر حکومت سیکولر حکومت سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ سیکولرازم کے بعض عیسائی مخالفین کا خیال ہے کہ ایک عیسائی ریاست عوام کو سیکولر ریاست کی نسبت زیادہ مذہبی آزادی عطا کرتی ہے۔ وہ اس ضمن میں ناروے، آئس لینڈ، فن لینڈ اور ڈنمارک کی مثال دیتے ہیں جہاں کلیسا اور ریاست کے درمیان ایک آئینی رابطہ موجود ہے۔ ان کی رائے میں یہ ممالک ان ممالک کی نسبت زیادہ ترقی پسند اور آزاد خیال ہیں جن میں ریاست اور کلیسا کے درمیان ایسا آئینی ربط موجود نہیں ہے۔ یہ مخالفین اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے آئس لینڈ کی مثال دیتے ہیں جو ان اولین

ممالک میں شامل ہے جہاں اسقاط حمل کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔اس کے علاوہ وہ فن لینڈ کا حوالہ دیتے ہیں جس کی حکومت مساجد کی تعمیر کے لیے فنڈز مہیا کرتی ہے۔

2- سیکولرازم کے علمبردار سیکنڈے نیویائی ممالک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ممالک سماجی لحاظ سے دنیا کے سب سے زیادہ سیکولر ممالک ہیں جہاں مذہبی عقائد کے حامل افراد کی اوسط انتہائی کم ہے حال ہی میں ناروے میں اس حوالے سے ایک کھلے مباحثے کا بھی انتظام کیا گیا جہاں کلیسا کو سرکاری امداد و حمایت سے محروم کرنے کے لیے مختلف تحریکیں مصروف عمل ہیں۔

دوسری جانب سیکولرازم کے بعض جدید نقاد سیکولرازم کو مذہب مخالف، الحادی اور یہاں تک کہ شیطانی نظام قرار دیتے ہیں۔اور بعض مذہبی قدامت پسند تو اس سے بھی آگے نکل کر سیکولرازم کی مخالفت کرتے ہیں۔ جیسا کہ پوپ بنی ڈکٹ چہار دہم نے سیکولرازم کی جاری لہر کو جدید معاشرے کی بنیادی خرابی قرار دیا ہے۔ اگرچہ سیکولر ریاست کا مقصد مذہبی حوالے سے غیر جانبدار رہنا ہوتا ہے۔مگر اس کے مخالفین کا کہنا ہے کہ مذہب کے بعض پہلوؤں پر بیشتر اوقات دباؤ والا رویہ اختیار کر جاتی ہے۔

3- بعض سیاسی نظام ہائے فکر، جن میں مارکسزم بھی شامل ہے، اس نظریے کے حامی ہیں کہ ریاست یا معاشرے پر مذہبی اثر ہمیشہ منفی ہی ہوتا ہے۔ایسے ممالک جن میں یہ رجحان پایا جاتا ہے (ان ممالک میں مشرقی یورپی کمیونسٹ بلاک ممالک شامل ہیں) وہاں عوام کے مفادات کا تحفظ کی خاطر مذہبی اداروں کو سیکولر ریاست کے ماتحت کر دیا گیا۔اور عبادت کرنے کی آزادی بھی بعض پابندیوں کے ساتھ مشروط کر دی گئی۔

سیکولرازم کے اس پہلو پر اس کے مخالفین تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغرب کے کئی جمہوری ممالک میں بھی اس بات پر تمام اتفاق پایا جاتا ہے کہ سیکولرازم کی اس طرح کی پالیسیاں مکمل مذہبی آزادی سے باہم متصادم ہیں اور ان کا اطلاق مذہبی آزادی کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

4- سیکولرازم کے کچھ حامیوں کا عقیدہ ہے کہ ریاست کو مذہب سے بالکل الگ ہونا چاہیے اور ساتھ ہی مذہبی اداروں کو بھی حکومتی عمل دخل سے آزاد ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ کچھ دیگر سیکولرسٹ ریاست کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ مذہبی اداروں کو ٹیکس فری قرار دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرے اور وہ اس بات پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ ریاست کو کسی بھی مذہب کو ریاستی مذہب قرار نہیں دینا چاہیے۔

کلاسیکی آزاد خیال (Classical Liberals) اس بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ ریاست کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مذہبی تنظیم کو ٹیکس سے مبرا قرار دے کیونکہ ریاست کے پاس ٹیکس لگانے اور اسے منظم کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے۔ان کے نزدیک اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیاوی اور روحانی ہر دو اتھارٹی کو ایک دوسرے کے لیے تکمیلیت کے دائرہ میں رہ کر کام کرنا چاہیے اور ان دو میں سے کوئی ایک بھی اخلاقی اقدار یا جائیداد کے حقوق کے حوالے سے اپنے دائرہ عمل سے تجاوز نہ کرے۔اور نہ ہی ان دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر اختیار حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔اور اگر ایسا ہو تو پھر ایک ایسا لائحہ عمل طے کیا جانا

چاہیے جس کے تحت معاشرہ ریاست کو مذہب یا مذہب کو ریاست کا مطیع بنائے بغیر اپنے مسائل حل کر سکے۔

سیکولرازم کے مزید منفی پہلو

(More Negative Aspects of Secularism)

سیکولرازم کے بعض منفی پہلوؤں کا ذکر ہم نے ''سیکولرازم کے حق میں اور خلاف دلائل'' والے حصے میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کے کچھ منفی پہلو ہیں جنہیں یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

1- مذہب کے بارے میں دو آراء

سیکولرازم کے بعض حامی مذہب اور ریاست کے الگ الگ ہونے کی بات کرتے ہوئے مذہب کے کردار کو بالکل ہی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب کا ریاستی طریق کار میں کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ سخت گیر سیکولرازم کے حامیوں کا خیال ہے۔ وہ تو مذہبی عقائد کو علمی مغالطے پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف بعض سیکولرسٹ کا خیال ہے کہ سیکولرازم سے مراد قریب قریب ایسی مذہبی آزادی ہے جس میں ایک فرد کوئی ایک مذہب یا ایک سے زیادہ مذاہب بھی اپنا سکتا ہے یا پھر اس کو کسی قانونی اور معاشرتی پابندی کے بغیر اس بات کی بھی اجازت ہے کہ وہ چاہے کسی بھی قسم کے مذہبی عقائد پر یقین نہ رکھے۔

اس طرح سیکولرازم میں مذہب کی حیثیت بارے کوئی ایک رائے نہیں ہے اور اس تحریک میں مذہب کے مقام کے بارے میں اس کے آغاز سے لے کر اب تک بحث جاری ہے۔ بعض لوگ اسے لادینیت قرار دیتے ہیں اور بعض اسے ایسا نظام حکومت کہنے پر مصر ہیں جس میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے اپنے مذاہب پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔

2- مذہب اور ریاست میں تصادم کا خدشہ

سیکولرازم میں ریاست اور مذہب کو الگ الگ رکھ کر اپنی طرف سے اختیارات کی جنگ کا خاتمہ کیا جاتا ہے جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہوتا جس کے تمام کے تمام باشندے مذہب پر یقین نہ رکھتے ہوں۔ چاہے کسی ملک کی اکثریت لادین ہو، سیکولرازم پر مبنی نظام حکومت رائج ہو، پھر بھی وہاں کچھ شہری ایسے ضرور ہوتے ہیں جو مذہبی عقائد پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ ریاست میں دو واضح طاقتیں بن جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صورت حال اس نہج پر آ جاتی ہے کہ ان دونوں طاقتوں میں کشیدگی پیدا ہونے کے امکانات جنم لیتے ہیں جو آخرکار دینی اور لادینیت کے تصادم پر منتج ہوتے ہیں۔

3- اخلاقی بے راہروی

دنیا میں موجود مذاہب میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں اخلاقی بے راہروی، شراب نوشی، زنا،

اسقاط حمل اور دیگر ایسی قباحتوں کی اجازت دی گئی ہو جبکہ سیکولرازم میں یہ کہہ کر ان معاشرتی آلائشوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مذہب کا انسان ذاتی معاملہ ہے۔ اگر یہ طریق کار قائم رہے اور لادینیت کو ریاستی سرپرستی حاصل رہے تو پھر معاشرے کو ان آلائشوں سے بچانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ اس درجے کی بے راہروی اور اخلاقی گراوٹ میں نکلتا ہے کہ معاشرہ تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اقتصادی نظریہ کا فقدان

اگر سیکولرازم کو مکمل نظام حکومت تسلیم کر لیا جائے تو اس میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کا زیادہ تر زور ریاست اور مذہب کی علیحدگی پر ہی رہتا ہے جبکہ یہ کوئی ٹھوس اقتصادی نظریہ پیش نہیں کرتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دور جدید میں اقتصادیات و سیاسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے بلکہ بعض اقوام تو اقتصادیات پر زیادہ زور دیتی ہیں کیونکہ حقیقی ترقی کا راز ہی معاشی خوشحالی میں مضمر سمجھا جاتا ہے۔

سیکولر تنظیمیں (Secularist Organizations)

دنیا کے مختلف خطوں میں سیکولرازم کا پرچار کرنے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس نظریے کا قائل کرنے کے لیے مختلف تنظیمیں مصروف عمل ہیں جن میں کچھ اہم درج ذیل ہیں۔

1- لائیسسٹر سیکولر سوسائٹی (Leicester Secular Society)

سیکولرازم کے حامیوں نے 1851ء میں لائیسسٹر سیکولر سوسائٹی نامی تنظیم کی بنیاد رکھی یہ تنظیم دنیا کی سب سے پرانی سیکولر سوسائٹی ہے۔

2- امریکنز یونائیٹڈ اور نیشنل سیکولر سوسائٹی (برطانیہ)

(National Secular Society(UK) and Americans United)

امریکنز یونائیٹڈ اور نیشنل سیکولر سوسائٹی (برطانیہ) ایسے گروپ ہیں جو سیکولرازم کی وکالت کرتے ہیں اور اس نظریے کی ترویج کے لیے مشغول ہیں۔ ان گروپوں کی حمایت سیکولر انسان دوست نظریات کے حامل افراد بھی کرتے ہیں۔ نیشنل سیکولر سوسائٹی نے 2005ء میں ''سیکولرسٹ آف دا ائیر'' ایوارڈ کی تقریب بھی منعقد کی۔ اس تقریب میں ''Secularist of the Year'' کا ایوارڈ ایران کی ''ورکرز کمیونسٹ پارٹی'' ڈاکٹر مریم نمازی کو دیا گیا۔

3- امریکہ کا سیکولر اتحاد (Secular Coalition for America)

سیکولر نظریات کی پرچارک یہ ایک ایسی تنظیم ہے جو کئی سیکولر انسان دوست تنظیموں سے منسلک ہے اور بے شمار ایسی دیگر تنظیمیں اس کی حامی ہیں۔

4- ویسٹ مشی گن کی آزاد خیال ایسوسی ایشن

(Freethought Association of West Michigan)

اس تنظیم کے حامی اپنے اپنے حلقہ احباب میں سیکولر نظریات کی وکالت کرنے کے لیے مصروف عمل ہیں۔ یہ اپنے حلقے میں سیکولرازم کے حامیوں، آزاد خیال، الحاد پرستوں، انسان دوست نظریات کے حامل افراد کو اپنی چھتر چھایہ میں لینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

5- ٹورنٹو سیکولر اتحاد (Toronto Secular Alliance)

یہ ایک طلبہ تنظیم ہے۔ جس کے ارکان اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں سیکولرازم کے فروغ کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔

6- سیکولر طلبا اتحاد (The Secular Student Alliance)

یہ بھی ایک تعلیمی تنظیم ہے جو ہائی سکولوں اور کالجوں میں سیکولر گروپوں کو منظم کرتی ہے اور ان کے لیے مالی امداد بھی کرتی ہے۔ یہ تنظیم زیادہ تر ان ہی طلبہ کی بہتری کے لیے کام کرتی ہے جو سیکولر نظریات کے حامل یا حامی ہیں۔

7- اتاترک تھاٹ ایسوسی ایشن (Ataturk's thought Association)

یہ ترکی کی سب سے معروف اور فعال تنظیم ہے جو سیکولر نظریات کا تحفظ کرتی ہے۔ 2007ء میں ترکی کے چار بڑے شہروں میں مظاہرے منظم کرنے کا سہرا بھی اسی تنظیم کے سر ہے۔ ان مظاہروں میں تقریباً (2 لاکھ) افراد نے حصہ لیا جن میں اکثریت خواتین کی تھی۔ یہ افراد مصطفیٰ اتاترک کے متعارف کردہ سیکولر نظریات کا دفاع کرنے کے لیے سڑکوں پر نکلے تھے۔

☆---☆---☆

The liberal soul shall be ... fat
=> give ... liberty ... give ... death

سوال: جدید لبرل ازم کی تعریف کریں اور یورپ پر اس کے اثرات کا جائزہ لیں۔ 2002ء، 2003ء، 2006ء، 2007ء، 2009ء

سوال: اس عہد کا جائزہ لیجیے جس میں برطانیہ اور امریکہ میں لبرل کنزرویٹو نزاع رونما ہوا کیا اب اس بات کو درست کہتے ہیں لبرل ازم کو اب جدید دنیا کے غالب سیاسی کلچر کی حیثیت حاصل ہے۔ 2004ء، 2005ء

لبرل ازم (آزاد خیالی)

(Liberalism)

جواب: لفظ لبرل لاطینی زبان کے لفظ (Liber) سے ماخذ ہے جس کا مطلب آزاد (Free) ہے۔ وسیع معنوں میں اس لفظ کا ناتا لفظ (Liberty) یعنی آزادی سے جوڑا جاتا ہے۔

سیاسیات میں لبرل ازم سے مراد ایسے تصورات و نظریات پر مبنی نظام حکومت ہے جس کا سب سے اہم مقصد ایک فرد کی آزادی کا حصول ہے۔ جدید لبرل ازم کی جڑیں خرد افروزی کے دور (Age of Enlightenment) سے نکلتی ہیں۔ لبرل ازم کے مبلغین میں جان لاک، مونٹیسکیو، ایمانویل کانٹ، ایڈم سمتھ، تھامس پین، جان اسٹورٹ مل اور دیگر شامل ہیں۔ ان تمام ماہرین عمرانیات نے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے انداز سے آزاد خیالی کا پرچار کیا۔

لبرل ازم میں انفرادی حقوق اور ہر فرد کے لیے مواقع کی مساوی فراہمی پر زور دیا جاتا ہے۔ لبرل ازم کی مختلف قسمیں مختلف قسم کی پالیسیاں پیش کرتی ہیں۔ مگر بعض اصولوں پر لبرل ازم کے تمام مکاتب فکر اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ سب سوچ اور اظہار رائے کے بارے میں مطلق آزادی، قانون کی حکمرانی، آزادانہ تبادلہ خیال، حکومت کے دائرہ اختیار پر بعض پابندیاں لگانے، شفاف نظام حکومت اور مارکیٹ بیسڈ یا مشترکہ معیشت پر زور دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ لبرل ازم میں انفرادی جائیداد بنانے پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

(Principles of Liberalism) لبرل ازم کے اصول

لبرل ازم کے بارے میں مختصراً جاننے کے بعد اب ہم اس نظریے کے اصولوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

1- فرد کے شہری حقوق پر زور (Civil Right of Individual)

لبرل ازم تمام شہریوں کے سول رائٹس پر زور دیتی ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ان آزادی اور اس کے تحفظ کا حق ہر شہری کو حاصل ہے جو قانون بلا تخصیص سب کو فراہم کرنے کا پابند ہے۔ اس سے یہ

بھی ش[illegible] ل ہے کہ تمام شہریوں کے ساتھ بلا امتیاز رنگ و نسل اور جنس یکساں سلوک روا رکھا جائے گا۔ ان حقوق میں تع[illegible] خوراک، رہائش، آزادی، جائیداد سب سے اہم زندہ رہنے کا حق ہے۔ لبرل ازم کی طرف سے فرد کو دیئے [illegible] انسانی حقوق پر بعض حلقے تنقید کرتے ہیں مثلاً انسانی حقوق کے ایک بین الاقوامی مکتب فکر کے نقاد کا خیال ہے کہ لبرل ازم میں جن حقوق کی وکالت کی جاتی ہے ان تک تمام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی بلکہ ان حقوق کو بعض [illegible] ریاستوں کے شہریوں تک محدود کر لیا جاتا ہے اور اس طرح قومیت کے حوالے سے بعض لوگ غیر مساویا[illegible] سلوک کا شکار ہو سکتے ہیں۔

[illegible] سوچ اور اظہار رائے کی آزادی (Freedom of Thought & Speech)

لبرل ازم کے حامی اس بات کے پرچارک ہیں کہ فرد کی سوچ اور اس کے اظہار پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا[illegible] نی ہے۔ کیونکہ سوچ کی آزادی ہی انسان کی اصل آزادی کی ابتداء ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر فرد کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ جو کچھ سوچے اس کا اظہار اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کر سکے۔ اس کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے [illegible] وہ اپنے خیالات کا آزادانہ تبادلہ کر سکے۔ لبرل ازم کے مخالف اس بات پر تنقید کرتے ہوئے یہ نقطہ نظر اختیار کر[illegible]تے ہیں کہ آزادی اظہار کا غلط استعمال فحش گوئی، بہتان طرازی اور اشتعال انگیز گفتگو پر منتج ہونے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں جن کے سبب افراتفری پھیلنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات آزادی اظہار کے نام [illegible] دوسروں کے مذہبی جذبات کو بھی ٹھیس پہنچائی جاتی ہے۔

3 - اق[illegible]صادی آزادی (Economic Freedom)

لبرل ازم کے حامی اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ فرد کو اس بات کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی لیاقت و [illegible]ستعداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ کما سکے۔ یہ لوگ آزاد مارکیٹ (Free Market) کی وکالت کرتے [illegible]ں۔ ان کے خیال میں اصل آزادی جبر سے آزادی ہے۔ اور جابرانہ طاقت کے ذریعے معیشت میں مداخلت [illegible]ولی اقتصادی آزادی کو جکڑ لیتی ہے اس لیے یہ لوگ عدم مداخلت (Laissez- Faire) پر مبنی اقتصادی [illegible]یسی کی حمایت کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حامی آزاد خیال کلاسیکی لبرل (Classical [illegible]beral) کہلاتے ہیں۔ اس نظریے کے مخالفین کا خیال ہے کہ معاشی آزادی انتہائی شدید قسم کی معاشی عدم مساوات [illegible]سبب بن سکتی ہے۔

4 - قا[illegible]ن کی حکمرانی (Rule of Law)

[illegible]برل ازم کے مبلغین کے مطابق شہری اپنے لیے قوانین بناتے ہیں اور پھر خود ہی ان قوانین کی پابندی کا [illegible]د کرتے ہیں۔ لہٰذا قانون کی حکمرانی اور قانون سب کے لیے برابر کا عنصر لبرل ازم کا لازمہ ہے اور حکومت با[illegible]عدہ طریق کار کے تحت بنائے گئے قوانین کی حدود میں رہتے ہوئے جائز طریقے سے ہی اپنی اتھارٹی کا [illegible]ستعمال کر سکتی ہے۔ قانون کی حکمرانی کا ایک اور اہم پہلو آزاد عدلیہ کی ضمانت دینا بھی ہے۔ آزاد خیال ماہر[illegible] عمرانیات و سیاسیات کے نزدیک قانون کی حکمرانی ظلم و استبداد، جبر و استحصال اور حکومت کی طاقت

پر کچھ پابندیاں لگانے کا ایک موثر آلہ ہے۔ لبرل ازم کے حامیوں کے نزدیک بعض سزائیں جن [illegible] سزائے موت بھی شامل ہے۔ بالکل غیر انسانی ہیں۔

5- لبرل جمہوریت (Liberal Democracy)

لبرل ازم نمائندہ لبرل جمہوریت کو حکومت کی بہترین شکل قرار دیتے ہوئے اس کی [illegible]یت [illegible] زور دیتی ہے۔ ان کے نزدیک منتخب جمہوری نمائندے قانون کی حکمرانی کے پابند ہوتے ہیں، [illegible] افراد کی آزادیوں اور حقوق کے تحفظ پر زور دیتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اکثریت کی مرضی کو بھی حدود میں ر[illegible] ہے۔ [illegible]زاد خیال ماہرین سیاسیات تکثیری نظام کی بھی حمایت کرتے ہیں کیونکہ اس نظام کے ذریعے مختلف سیا[illegible] [illegible]رمعاشرتی نظریات کے حامل افراد جمہوری بنیادوں پر سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے میدان عمل میں ا[illegible]تے [illegible]ں۔ اس طرح انہیں گاہے بگاہے منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعے طاقت کے حصول کا موقع [illegible] ہے۔ [illegible]زاد خیال اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ مختلف تنازعات کو جمہوری حدود میں رہتے ہوئے قانونی [illegible]یق کار کے تحت پرامن طریقے سے حل کیا جانا چاہیے۔ بہت سے آزاد خیال اس بات کے بھی حامی ہیں کہ جم[illegible]ی عمل میں زیادہ سے زیادہ شہریوں کی شمولیت کو یقینی بنایا جانا چاہیے جبکہ بعض آزاد خیال نمائندہ جمہوریت [illegible] بجائے براہ راست جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں۔

6- غیر جانبدار حکومت (Neutral Government)

لبرل ازم کے پرچارک غیر جانبدار حکومت کے قیام پر زور دیتے ہیں۔ اس ضمن میں [illegible] اس امر پر بحث کرتے ہیں کہ ریاست کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ اپنی رعایا کے لیے شخصی اقدار کا تعین کرے۔ [illegible]یسا کہ جان راولز نے کہا ہے: ''ریاست کو اچھی زندگی کا خاص تصور متعین کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔'' ر[illegible] [illegible]ائے متحدہ امریکہ میں اس غیر جانبداری کا اظہار آزادی کے علامیہ (Declaration of Independence) سے ہوتا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں تو خواتین کے علاوہ ہم جنس پرستوں کے لیے بھی مساوی حقوق [illegible] وکالت کی جاتی ہے۔

7- سماجی ترقی کا میلان (Social Progressivism)

لبرل نظریے کا ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ روایات (Traditions) اقدار کو کسی خا[illegible] گروہ یا فرد کے لیے ورثے کے طور پر ساتھ لے کر نہیں چلتی ہیں۔ لبرل ازم کے نزدیک سماجی رسم و رواج کو [illegible]سانیت کے بہترین مفاد کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر رہنا چاہیے تاکہ انہیں کسی خاص وقت [illegible] انسانوں کی بہتری کے لیے ان کے حالات کے موافق بنایا جا سکے۔

8- حکومت کے بعض اساسی (بنیادی) مفروضوں کی نفی

(Rejection of Some Fundamental Assumptions of Government)

لبرل ازم حکومت کے بارے میں ابتدائی نظریات میں پائے جانے والے بعض بنیا[illegible] مفروضوں

(Fundamental Assumptions) کو رد کرتی ہے۔ ان مفروضوں میں شہنشاہوں کا خدائی حق (Divine Right of Kings)، موروثی مراتب اور تسلیم شدہ مذہبی عقائد شامل ہیں۔ لبرل ازم اس نظریے کی بھی حامی ہے کہ انسانی معاشرہ کچھ ایسے حقوق کی مطابقت سے منظم کیا جانا چاہیے جن کو نہ تو بدلا جا سکے اور نہ ہی جبر سے روگردانی کی جا سکے۔ ان حقوق میں زندہ رہنے کا حق، آزادی کا حق اور جائیداد کا حق ہے۔ اگر اس نظریے پر غور کیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اگر شہنشاہوں کے خدائی حق کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ان تینوں حقوق کی پاسداری تقریباً ناممکن ہو کر رہ جاتی ہے۔

لبرل ازم کا دائرہ کار (Scope or Forms of Liberalism)

ویسے تو لبرل ازم نے زندگی کے تقریباً سبھی شعبوں کے لیے اپنے اصول وضع کیے لیکن اس کا زیادہ زور انسان کی سیاسی، معاشی، تہذیبی اور سماجی زندگی پر ہے۔ ذیل میں ہم ان چاروں اقسام کی لبرل ازم کا جائزہ لیں گے۔

1- سیاسی لبرل ازم (Political Liberalism)

سیاسی لبرل ازم کا عقیدہ ہے کہ افراد ہی معاشرے اور قانون کی بنیاد ہوتے ہیں اور معاشرے کے ادارے اور معاشرے کا وجود ہی اس لیے ہے کہ وہ افراد کے مفادات کا تحفظ کرے اور انہیں ایسا کرنے کے لیے کسی سماجی رتبے کو ملحوظ خاطر نہیں رکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں میگنا کارٹا (Magna Carta) ایک ایسی سیاسی دستاویز ہے جس میں افراد کے حقوق کا دعویٰ فرماں رواؤں کے خصوصی اختیارات سے بھی زیادہ کیا گیا ہے۔ سیاسی لبرل ازم ایسے معاہدہ عمرانی پر زور دیتی ہے جس کے تحت افراد خود ہی قوانین بناتے ہیں اور خود ہی ان کی پابندی کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ افراد یہ بہتر جانتے ہیں کہ ان کے لیے کون سی چیز بہتر اور مناسب ہے۔ سیاسی لبرل ازم تمام افراد کو بلا امتیاز جنس، نسل اور معاشی رتبے کے حق رائے دہی بھی دیتی ہے۔

2- کلچرل لبرل ازم (Cultural Liberalism)

کلچرل لبرل ازم نجی زندگی میں حکومت کی بے جا دخل اندازی سے افراد کو تحفظ فراہم کرتی ہے اور افراد کی مذہبی، جنسی اور ذہنی آزادی پر زور دیتی ہے۔ اس کے مطابق ہر فرد کو اپنی سوچ کے مطابق طرز حیات اختیار کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ کلچرل لبرل ازم عام طور پر ادب، آرٹ، تعلیم، جوا، جنس، جسم فروشی، اسقاط حمل، ضبط تولید، مہلک امراض اور شراب نوشی جیسے معاشرتی عوامل کے بارے میں حکومت کے وضع کردہ قوانین اور اصول وضوابط کی بھی مخالفت کرتی ہے۔

3- اقتصادی لبرل ازم (Economic Liberalism)

اقتصادی لبرل ازم کو کلاسیکل لبرل ازم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا نظریہ ہے جو انفرادی جائیداد کے لیے

معاہدے کی آزادی دیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس آزادی کے بغیر دوسری تمام آزادیاں نا... ہوتی ہیں۔ اقتصادی لبرل ازم عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کی وکالت کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہے... تجار... کے رستے میں حائل ہونے والی قانونی رکاوٹوں کو بالکل ہٹا دیا جائے۔ یہ حکومت کی جانب سے ... جا... والی سبسڈی اور حکومتی اجارہ داری کو بھی روکنے کے حق میں ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ مارکیٹ میں حکومتی ...ول سوابط بالکل تھوڑے ہونے چاہئیں یا پھر سرے سے ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ بعض اقتصادی لبرل حکومت... جا... سے اجارہ داریوں اور (Cartels) صنعت کاروں کی غیر رسمی تنظیموں جو مارکیٹ پر اثر انداز ہو... کے... یہ عمل کرتی ہیں، پر لگائی جانے والی پابندیوں کو قبول کرتے ہیں جبکہ بعض کے خیال میں ایسی اجارہ دا... او... تنظیمیں جنم ہی ریاستی ایماء پر لیتی ہیں۔ اقتصادی لبرل ازم کے نزدیک اشیاء کی قیمت اور بعض امور... قدرا... زادی پابندیوں سے مبرا سوچ کے ذریعے متعین کی جانی چاہیے۔ یہ لبرل ازم اقتصادی عدم مساوات ... قسم... میں قبول کر لیتی ہے جب یہ عدم مساوات نا... ہموار سودے بازی کی وجہ سے پیدا ہو کیونکہ ایسا ہونا مقا... کے... تول کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات صرف اس وقت قابل قبول ہوگی جب مقابلہ بازی میں کسی قسم کا ... اور ... بصال موجود نہ ہو۔ لبرل ازم کی یہ قسم 19ویں صدی کے وسط کی انگلش لبرل ازم سے بہت زیادہ متاثر ہ...

6- سماجی لبرل ازم (Social Liberalism)

سماجی لبرل ازم کو نئی لبرل ازم (New Liberalism) بھی کہا جاتا ہے۔ ...ل از... 19 ویں صدی کے آخر میں کئی ترقی یافتہ ممالک میں رونما ہوئی۔ لبرل ازم کی یہ قسم جرمی بینتھم ... Jer... my (Bentham) کے نظریہ افادیت پسندی سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ سماجی لبرلز ایسی آزاد تجار... اور... کیٹ بیسڈ معیشت کی حمایت کرتے ہیں جس کے تحت تمام افراد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ یہ نظر... سماجی ...طور پر ترقی پذیر تصورات کی حمایت کرتا ہے جس کے مطابق سماجی رواج وقت کے ساتھ ساتھ اس طر... اختیا... کیے جانے چاہئیں جس کی وجہ سے معاشرے کے تمام افراد اپنی بنیادی آزادیوں سے مستفید ہوسکیں۔ ...نظ... بنیادیں وضع کرنے میں جان ڈیوی اور مارٹیمر ایڈلر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے خیال میں... سب... ادہی معاشرے کی بنیاد ہیں تو پھر تمام افراد کو تعلیم، معاشی مواقع اور دیگر بنیادی ضروریات زندگی تک... سائی ... حاصل ہونی چاہیے۔

معاشی و اقتصادی پہلو پر سماجی اور اقتصادی لبرل ازم میں کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ ... کے ... طور پر سماجی لبرلز کم سے کم اجرت کے قوانین کی حمایت کرتے ہیں۔ جبکہ اقتصادی یا کلاسیکل آزاد خیا... ان قوانین کو معاہدہ کرنے کی آزادی کی پامالی قرار دیتے ہیں۔

لبرل ازم کے منفی پہلو (Negative Aspects of Liberalism)

آزاد خیالی اپنی تمام اقسام میں آزادی کے تحفظ کا دفاع کرتی ہے۔ یہ الگ بات ... کہ لبر... ازم

کے مختلف مکاتب فکر آزادی کے صحیح معنوں پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ آزاد خیالی دور جدید میں اس حد تک مقبول عام ہو چکی ہے کہ بعض مغربی ممالک میں زبانی جمع خرچ تک ہی سہی انفرادی آزادی کو سوسائٹی کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ دور حاضر میں جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو پر امن اور خوشحال زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے، انہیں اپنے اپنے مذاہب اور طرز حیات پر کاربند رہنے کے مواقع فراہم کیے جائیں، وہاں آزاد خیالی کے کچھ منفی پہلو بھی ہیں۔ جو ترقی کے بجائے انسان کے معاشی و سیاسی حوالے سے بالعموم اور اخلاقی حوالے سے بالخصوص زوال کا سبب بن رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پہلو درج ذیل ہیں۔

1- آزادی اظہار کے منفی اثرات

لبرل ازم کے مخالفین اس بات پر معترض ہیں کہ آزادی اظہار کا غلط استعمال فحش گوئی، بہتان طرازی اور اشتعال انگیز گفتگو پر منتج ہوتا ہے۔ جس سے معاشرے میں بدامنی اور افراتفری پھیلنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات آزادی اظہار کا غلط استعمال کر کے دوسروں کے مذہبی جذبات کو بھی ٹھیس پہنچانے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ اس کی واضح اور تازہ ترین مثال ڈنمارک اور بعض دوسرے یورپین ممالک میں توہین آمیز خاکوں کی اشاعت ہے جس سے پوری دنیا کے مسلمان سراپا احتجاج بن گئے تھے۔

2- عدم مداخلت کی پالیسی اور مزدوروں کا استحصال

معاشی لبرل ازم کی عدم مداخلت (Laissez Faire) کی پالیسی سے بعض ممالک میں مزدوروں کا بڑے سفاک انداز میں استحصال کیا گیا۔ ان حالات میں مزدور انتہائی خطرناک ماحول میں کام کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے علاوہ عدم مداخلت کی پالیسی سے منڈی پر دولت مند افراد کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے جس سے مقابلہ کی فضا پنپ نہیں پاتی اور جب مقابلہ کی فضا نہ ہو تو پھر ناقص اشیاء کی پیداوار بھی عام ہو جاتی ہے۔ کم افراد کے لیے فائدہ مند جب کہ زیادہ تر افراد کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

3- شخصی آزادی پر زور اور ریاست کی نفی

لبرل ازم کے حامی ایسی حکومت کو بہترین قرار دیتے ہیں جو کم سے کم حکومت کرے اور انفرادی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انفرادی معاملات اس وقت تک تو احسن طریقے سے چلتے رہتے ہیں جب تک ان کا دائرہ کار صرف ایک فرد کی ذات تک محدود ہو اور جب ایک فرد کے اعمال اپنے دائرہ کار سے باہر نکل کر دوسروں کی زندگی میں مداخلت کی راہ اختیار کر لیں تو پھر اس منہ زور رویے کو روکنے کے لیے کسی نہ کسی تنظیم یا گروہ کی ضرورت ناگزیر ہوتی ہے۔ جو افراد کو اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر زندگی بسر کرنے کا پابند بنا سکے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے سب سے اہم ادارہ یا تنظیم حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ جب کہ لبرل ازم کے حامی ریاست کی نفی کرتے ہیں حالانکہ دور جدید میں حکومت اور ریاست لازم و ملزوم ہیں۔

4- جنسی آزادی اور اس کے نقصانات

کلچرل لبرم ازم فرد کو جنسی آزادی کا حق دیتی ہے۔ وہ اسقاط حمل، ضبط تولید اور [illegible]راب [illegible]شی جیسی معاشرتی قباحتوں کے بارے میں حکومت کے وضع کردہ اصول وضوابط کو رد کرتے ہوئے فرد کی [illegible] آلا[illegible]ئوں میں مگن رہنے کی وکالت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایسی معاشرتی برائیاں ہیں جو آج کے انسان [illegible] بے را[illegible]روی اور اخلاقی گراوٹ کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ خاص طور پر مغربی معاشرے کو اندر ہی اندر جو چیز [illegible]یمک [illegible]کی طرح چاٹ کر اس کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی ہے وہ جنسی آزادی ہی ہے۔ جس کی وجہ سے طلاق کی شر[illegible] میں [illegible]ے روز اضافہ ہو رہا ہے۔ بن بیاہی ماؤں کی تعداد ہے کہ گننے میں نہیں آتی۔ ماں بہن کی تمیز ختم ہو کر [illegible]ئی ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ لبرل ازم کے حامی تو ہم [illegible]نسی پرستی پر بھی کوئی قدغن گوارہ کرنے کے حق میں نہیں [illegible]۔

سوال: نظریہ قومیت کی ابتدا اور ترقی موجودہ دور تک جائزہ لیں۔ 2002ء

سوال: آپ کے خیال میں کیا نیشنلزم ہی سیاسی اتحاد کے حصول کا واحد ذریعہ ہے اپنے جواب کی تائید میں جدید تاریخ سے مثالیں دیجیے۔ 2004ء

سوال: ایشیا اور افریقہ میں نیشنلزم کے ارتقا کا تفصیل سے جائزہ لیجیے۔ 2005ء، 2006ء، 2007ء، 2009ء

قوم پرستی / قوم پرستی کا جذبہ قومیت

NATIONALISM

جواب: قوم پرستی ایک نظریہ بھی ہے اور ایک قسم کا سیاسی رویہ بھی۔ قوم پرستی کے جدید نظریے کو اٹھارویں صدی کے آخر میں ترقی ہوئی۔ اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ "ہر قوم کو اپنے اوپر خود حکومت کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے" اور چونکہ یورپ کی سرحدیں متعدد شاہی خاندانوں اور بڑے جاگیرداروں کی کشمکش کے نتیجے میں وجود میں آئیں تھیں اس لئے وہ بہت سی قوموں مثلاً جرمن، اطالوی، روس، چیک، سربی اور پول کے لئے بے اطمینانی کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ اس بناء پر قوم پرستی انیسویں اور بیسویں صدی کے انقلابی ہیجان کا اہم جزبن گئی۔

قوم پرستی کا نظریہ جن تصورات اور رجحانات سے تعبیر ہوا ہے ان کی یورپ میں ایک طویل تاریخ ہے۔ عہد وسطی کے آخر میں یورپ کے بہت سے علاقوں میں قومی امتیازات اور اختلافات کا شعور بڑھنے لگا تھا۔ چنانچہ فرانس اور انگلستان کے مابین صد سالہ جنگ (1337-1453ء) کو عام طور پر قوم پرستی کی ابتداء تصور کیا جاتا ہے۔

جدید سیاسی فکر میں قوم پرستی کے تصور کو اطالوی مفکر میکیاویلی (1469-1527ء) نے پروان چڑھایا۔ اس نے اٹلی کی منتشر چھوٹی چھوٹی اقوام کو جو آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں ایک قومی ریاست کی شکل میں وجود میں لانے کی سعی کی۔ اس نے مذہب کو ریاست کے تابع کر کے قومی سیکولر ریاست کی بنیاد رکھی۔ پندرہویں صدی کے آخر تک متعدد قومی حکومتیں بن چکی تھیں۔ شروع شروع میں جو قومی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں اختیارات کے مالک موروثی بادشاہ ہوتے تھے۔ بادشاہ ہی قانون اور انصاف کا سرچشمہ تھا۔ انگلستان کے شاندار انقلاب (1688ء) امریکہ کی جنگ آزادی (1775-83ء) اور عظیم فرانسیسی انقلاب (1789ء) کے بعد قومی ریاست اور جمہوریت میں گہرا تعلق قائم ہوگیا۔

قوم پرستی کے نظریے کا دارومدار قوم کی تعریف پر ہے۔ قومیت کی سب سے زیادہ واضح علامت مشترکہ زبان ہے۔ تاہم بہت سی قومیں انگریزی بولتی ہیں اور سوئس باشندے چار زبانیں (جرمن،

فرانسیسی، اطالوی اور رومانش) بولتے ہیں قوم پرستی کے جذبات اکثر خطہ ارضی سے متعلق ہوتے ہیں اور مذہبی یگانگت عام طور پر قومی وحدت کو مستحکم بنا دیتی ہے بعض جوشیلے مفکروں نے قومیت کے لئے ادبیات اور لسانیات کے معیار پیش کئے ہیں۔ چنانچہ ایک خیال یہ ہے کہ سرب قوم وہاں تک پھیلی ہوئی ہے جہاں تک اس کی رزمیہ نظمیں رائج ہیں۔

لیکن یہ تمام فطری علامتیں قومیت کے لئے ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصلی عنصر ''مرضی'' کا ہے۔ جس کو قومیت کے نظریے کی تمام صورتوں میں عام طور پر دخل ہے۔ دوسرے لفظوں میں قوم لوگوں کی وہ جماعت ہے جو اپنے آپ کو قوم سمجھتی ہے۔ اگر ضرورت ہو تو دوسری فطری علامتوں کو بعد میں حاصل کرلیا جاتا ہے۔ فرانسیسی مفکر ارنسٹ رینان (Earnest Renan) نے لکھا ہے کہ ''قوم ایک روح ہے اور ایک روحانی اصول ہے'' اور ہم اس میں یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ عموماً اس سے بھی کچھ زیادہ۔ کیونکہ اکثر قوم پرست موجودہ سرحدوں سے باہر نسلی یا لسانی یگانگت کی بنیاد پر غیر علاقوں پر اپنا حق جتاتے ہیں چنانچہ قوم پرستی ایک وسعت پذیر نظریہ ہے۔

پروفیسر گل کرائسٹ (R.N. Gilchrist) لکھتا ہے کہ ''قومیت ایک روحانی جذبہ ہے جو لوگوں کو باہم اکٹھا کر دیتا ہے۔ یہ جذبہ زبان، نسل، مذہب، روایات، تاریخ اور مفادات پر مبنی ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر آرنلڈ جے ٹوائن بی (Arnold J. Toynbee) نے قوم پرستی کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ قومیت ایک ایسے جذبہ اشتراک کا نام ہے جس کی بناء پر مخصوص لوگ اپنے نظریات، خیالات اور افعال کے اعتبار سے دوسرے لوگوں سے امتیازی حیثیت رکھتے ہوں اور جس کی وجہ سے وہ اپنی منفرد سماجی زندگی کے وجود کا احساس رکھیں۔

پروفیسر ہان کوہان (Han Kohan) کے مطابق قوم پرستی ایک ایسی جذباتی کیفیت کو کہتے ہیں جس کے باعث کوئی فرد خود کو اپنی قومی ریاست کی وفاداری کی انتہا پر محسوس کرتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوران قوم پرستی کی تحریکات بروئے کار رہیں اور انہیں تحریکات کے نتیجے میں پہلی عالمی جنگ (1914-19ء) وقوع پذیر ہوئی۔ جنگ کے بعد پیرس امن کانفرنس (1919ء) میں ''قومی خود اختیاری کے اصول'' کو از سر نو سرحدیں متعین کرنے کا ایک مسلمہ معیار قرار دیا گیا۔ امریکی صدر ولسن نے اس حق کی پرزور حمایت کی۔ اس حق کی بدولت بہت سی قومی مملکتیں وجود میں آ گئیں۔ عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے (1919-39ء) میں قوم پرستی کے جذبات جرمنی، جاپان اور اٹلی میں بہت نمایاں تھے۔ یہ وہ ملک ہیں جہاں لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ دنیا میں انہیں مناسب مقام حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر انہوں نے دوسری عالمی جنگ (1939-45ء) لڑی۔ اس جنگ کے بعد قوم پرستی نے بہت سے سیاسی رہنما پیدا کئے جنہوں نے یورپی نو آبادیاتی حکومتوں سے آزادی کی جدوجہد کی۔

ماہرین عمرانیات قوم پرستی کی تشریح اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک مادر وطن سے وابستہ جدید سیکولر مذہب ہے۔ جس میں روایتی اطاعت شعاری کو بدلنے کے لئے سیاسی انفرادیت کے ایک نئے جذبہ کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ یعنی اس میں بادشاہ یا آقا کی بجائے وطن سے محبت کی جاتی ہے اور وطن دشمنوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

یاد رہے کہ آج کل قوم پرستی کسی بھی سیاسی تحریک سے متعلق ہو سکتی ہے خواہ وہ ویلز یا اسکاٹ لینڈ میں خود مختاری کی تحریک ہو یا عرب یا افریقی اتحاد کی آرزوئیں ہوں۔ اس لئے اس کی تشریح کسی عام نظریہ کے بجائے مقامی حالات میں تلاش کرنی چاہیے۔

قوم پرستی کے دو پہلو/خوبیاں اور خامیاں

قوم پرستی کے دو پہلو ہیں ایک تعمیری اور دوسرا تخریبی۔ یہ ایک نعمت بھی ہے اور لعنت بھی۔ اس کی اہم خوبیاں اور خامیاں حسب ذیل ہیں۔

الف۔ تعمیر پہلو/خوبیاں

1- فرد کی خود غرضی اور مفاد پرستی کا خاتمہ: قوم پرستی فرد کی خود غرضی اور مفاد پرستی کو ختم کر دیتی ہے فرد قوم کے لئے تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور قوم کی بھلائی کو ہی اپنی بھلائی سمجھتا ہے۔

2- قومی فنون لطیفہ کی تعمیر: قوم پرستی کے جذبے کے تحت شاعروں، ادیبوں اور دوسرے باصلاحیت آرٹسٹوں نے قومی فنون لطیفہ کی تعمیر میں غیر معمولی حصہ لیا۔ شاعرانہ کلام، ادب، سنگ تراشی، مجسمہ سازی اور فنون لطیفہ کے دیگر شاہکار نمونے پیش کئے ہیں۔

3- مسابقت کا رجحان: قوم پرستی کی حمایت میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کی قوموں کے درمیان مسابقت کا رجحان شروع ہو گیا ہے۔ تمام قومیں علم وفن میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی زبردست کوشش کر رہی ہیں اور یہ اسی زبردست مسابقت کا نتیجہ ہے کہ انسان کی زندگی کو اور زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے دنیا میں نئی نئی ایجادیں ہو رہی ہیں۔

4- آزادی اور جمہوریت میں ترقی کا راز: قوم پرستی نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا کی ترقی کا راز آزادی اور جمہوریت میں پنہاں ہے۔ جہاں قومی جذبات پیدا ہوتے ہیں وہاں لوگ بالآخر بادشاہت، آمریت اور سامراجیت کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں اور جمہوری حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

5- اتحاد ویکجہتی: موجودہ دور میں قوم پرستی ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ قوم پرستی کا

جذبہ لوگوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرتا ہے۔ وطن کے مفاد کو دیگر تمام مفادات پر افضلیت حاصل ہوتی ہے۔ بقول اقبال ؎

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

6- **فکر و کردار کی تعمیر:** قوم پرستی کا جذبہ افراد کی فکر و کردار کی تعمیر کرتا ہے انہیں محدود نسلی، لسانی اور مذہبی گروہوں کے تعصبات سے بالاتر ہو کر قومی جذبات سے سرشار کرتا ہے۔ اس طرح یہ جذبہ ایک قومی معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے، جو اجتماعی زندگی کو اپنا مقصد اور نصب العین تصور کرتا ہے۔

7- **قابل فخر رہنما:** قوم پرستی کے جذبے کے تحت مختلف قوموں نے بڑے قابل فخر رہنما پیدا کئے۔ پاکستان جو دو قومی نظریے کی بنیاد پر بنا اس جذبے کی بدولت سرسید احمد خاں، علامہ محمد اقبال، چوہدری رحمت علی، لیاقت علی خان اور قائداعظم محمد علی جناح جیسی شخصیات پیدا ہوئیں۔ مہاتما گاندھی (بھارت) مصطفےٰ کمال اتاترک (ترکی) ہٹلر (جرمنی) سولینی (اٹلی) مارشل ٹیٹو (سابق یوگوسلاویہ اب سربیا مونٹی نیگرو) اور شیخ مجیب الرحمٰن (بنگلہ دیش) وغیرہ کا شمار دنیا کے عظیم قوم پرست رہنماؤں میں ہوتا ہے۔

8- **عالمی مملکت کا تصور:** قوم پرستی کی بدولت عالمی مملکت کا تصور دم توڑ گیا ہے۔ عالمی حکومت کے قیام سے بین الاقوامی امن کو تو فروغ ہو سکتا ہے مگر مقابلے کا رجحان اور ترقی کی رفتار سست پڑ جائے گی۔

ب۔ تخریبی پہلو/ خامیاں

قوم پرستی صرف ایک صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ جب وہ اپنی حد میں رہے۔ اگر وہ جارحانہ صورت اختیار کر لے تو وہ دنیا کے لئے لعنت بن جاتی ہے اس کی اہم خامیوں کو حسب ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

1- **سامراجیت:** ہر قوم اپنے آپ کو مضبوط اور طاقتور بنانے کے لئے دوسری قوموں کو غلام بنانا شروع کر دیتی ہے اس صورت میں قوم پرستی سامراجیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اور یہ جارحانہ قوم پرستی دنیا میں جنگوں کا باعث بنتی ہے۔ اس کا نتیجہ دنیا کی تباہی و بربادی نکلتا ہے۔ غرضکہ قوم پرستی انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

2- **جھوٹی بڑائی اور تعریف:** قوم پرستی کی دوسری خامی یہ ہے کہ یہ جذبہ اپنی قوم کی جھوٹی بڑائی اور تعریف کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور یہی جذبہ دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور عناد پیدا کرتا ہے۔ قوم پرستی کا ماٹو یہ ہے کہ اپنی قوم کے لوگ جو کچھ بھی کریں یا کہیں وہ ٹھیک ہے اور دوسری قوم کے لوگ۔ جو

کچھ کرتے ہیں وہ غلط ہے۔

3۔ **استحصال کی ایک منظم ترین شکل:** جارحانہ قوم پرستی استحصال کی ایک منظم ترین شکل اختیار کرتی ہے اور اپنے ملک کے مفاد کی خاطر دوسری قوموں کے جائز مفاد کو بھی نہ صرف نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ اسے پورے طور پر قربان کر دیا جاتا ہے۔

4۔ **نئی استعماریت:** دوسری عالمی جنگ کے بعد قوم پرستی نے ایشیا اور افریقہ میں بہت سے چھوٹے ممالک کو آزادی کی راہ دکھائی مگر آزادی کے بعد انہیں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے بیرونی امداد پر انحصار کرنا پڑا۔ اس طرح یہ ممالک سامراجیت سے آزادی حاصل کرنے کے بعد نئی استعماریت کے ماتحت آ گئے اور بڑی طاقتوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے۔

5۔ **علیحدگی پسندی:** بعض ممالک میں مختلف رنگ و نسل اور مذاہب کے لوگ آباد ہوتے ہیں یہ لوگ اپنے قومی تشخص کی بقاء اور مفادات کے لئے علیحدگی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان مسلم قوم پرستی اور بنگلہ دیش بنگالی قوم پرستی کی بنیاد پر قائم ہوا۔ سوویت روس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ مراکش، بھارت اور سری لنکا میں قوم پرستی کی بنیاد پر علیحدگی کی تحریکیں چل رہی ہیں۔

6۔ **بین الاقوامی امن و سلامتی:** جب تک تنگ نظر جارحانہ قوم پرستی کو ترک نہ کیا جائے گا اس وقت تک دنیا میں کوئی عمدہ سماجی نظام اور پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا جارحانہ قوم پرستی ہی بین الاقوامی امن و سلامتی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ پروفیسر لاسکی (Laski) کے مطابق ''قومی ریاستیں اپنے اقتدار اعلیٰ کی وجہ سے بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے زبردست خطرہ ہیں۔''

7۔ **مفکرین کی آراء:** پروفیسر ہن ٹلے ہیز (Huntley Hayes) کہتا ہے کہ ''موجودہ قوم پرستی کا نظریہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر گیا ہے جس طرح انسانوں میں مذہبی جوش و خروش جنون کی حد تک سرایت کر جاتا ہے اسی طرح قوم پرستی موجودہ ریاستوں میں سرایت کر گئی ہے جس طرح مذہبی جنون خطرات کو مول لیتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قوم پرستی کا جنون خطرات کو دعوت دیتا ہے۔ قوم پرستی کا جذبہ ریاست کے اتحاد اور سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے درست ہے لیکن اگر اس سے آگے بڑھتا ہے تو جنگ اور فساد کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

لارڈ ایکٹن (Lord Acton) کہتا ہے کہ ''ایک قوم ایک ریاست'' کا نظریہ اشتراکیت کے نظریے سے بھی زیادہ گھناؤنا اور مجرمانہ ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ ایک ریاست میں مختلف اقوام کا امتزاج ایک مہذب زندگی کے لئے ایسی ہی شرط ہے، جیسے کہ ایک معاشرہ میں مختلف انسانوں کا امتزاج، پست نسلیں ذہنی برتری رکھنے والی نسلوں کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد میں رہ کر بلند و بالا ہو سکتی ہیں اور بہت سی اچھی باتیں سیکھ سکتی ہیں۔

ممتاز شاعر اور ادیب رابندر ناتھ ٹیگور (Robindra Nath Tagore) لکھتا ہے کہ قوم پرستی مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں مختلف صورتوں میں رونما ہوئی ہے۔ مثلاً استعماریت، شہنشائیت، نوآبادی نظام، سرمایہ داری، نازی تحریک، فاشی تحریک، اشتمالیت، اشتراکیت، جارحیت، نیز قوموں کا حق خود ارادیت وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک میں بعض خوبیاں اور بعض خامیاں ہیں۔

قوم پرستی کے بین الاقوامی تعلقات پر اثرات

موجودہ دور میں قوم پرستی مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا غلط استعمال ہمیں سامراجیت اور استعماریت کی طرف لے جاتا ہے اور اس کا صحیح استعمال قوموں کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا نقیب ہے۔ برطانیہ نے اس تصور کی بدولت لوگوں کی انفرادی آزادی کی قدر قیمت سمجھ لی ہے۔ اس کے حصول کے لئے کلیساء کے لامحدود اختیارات کا مقابلہ کر کے انہیں محدود کیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد اس جذبے سے سرشار ہو کر برطانوی قوم نے دوسری اقوام پر اپنی برتری قائم کرنا شروع کر دی۔

برطانوی قوم پرستی کے اثرات جب فرانس میں پہنچے تو انہوں نے بھی قوم پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر انفرادی آزادی کے لئے مؤثر آواز اٹھائی اور اس کی بدولت انقلاب فرانس (1789ء) رونما ہوا۔ فرانس میں صحیح معنوں میں قوم پرستی کی ابتداء انقلاب فرانس سے ہوتی ہے۔ فرانس میں تاریخ کے اساتذہ بچوں کو پڑھاتے تھے کہ "فرانس ہمیشہ انسانی ترقی کی صف میں سب سے آگے رہا ہے اور اس کا کام آزادی، مساوات اور اخوت کے اصولوں کو دنیا تک پہنچانا ہے۔

جرمنی میں قوم پرستی کے جذبات کے تحت بچوں کو یہ تعلیم دی جانے لگی کہ جرمن قوم اپنی اخلاقی پاک بازی کے لئے جولیس سیزر (102 ق م۔ 44 ق م) کے وقت سے مشہور ہے اور جرمن لوگ خدا کے منتخب بندے ہیں۔ جن کا مقصد دنیا کو تہذیب سکھانا ہے۔

اٹلی بھی قوم پرستی کے درس میں کسی سے پیچھے نہیں رہا چنانچہ اپنے بچوں کو فخر سے پڑھانے لگا کہ روم نے صدیوں تک دنیا کی طاقتوں اور ان کے قلوب پر حکومت کی ہے اور موجودہ اٹلی روم کی پرانی روایات اور وقار کو حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ ان ساری تعلیمات کا مقصد اپنی قوم کو دوسری اقوام کے ساتھ جنگ کے لئے تیار کرنا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ جنگ کے بغیر دوسری قوم پر بالادستی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ قیصر ولیم کے یہ الفاظ اس حکمت عملی کی بہترین وضاحت کرتے ہیں۔ "دائمی اور مستقبل امن ایک خواب کی طرح ہے اور یہ کوئی دلفریب خواب بھی نہیں ہے۔ دنیا کے کاروبار میں جنگ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ خدا خود اس کا موجد اور جاری کرنے والا ہے۔ بغیر جنگ کے دنیا کی ترقی رک جائے گی اور اس پر جمود طاری ہو جائے گا۔"

جنگ عظیم اول (1914-19ء) سے کچھ عرصہ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قوم پرستی کے جذبات

ٹھنڈے پڑ رہے ہیں اور بین الاقوامیت کا دور شروع ہو رہا ہے لیکن جنگ نے ثابت کردیا کہ یہ جذبہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ قائم ہے۔ جنگ کے بعد منعقد ہونے والی پیرس امن کانفرنس (1919ء) میں مفتوح اقوام سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا جس سے قوم پرستی اور جمہوریت کے درمیانی تعلق "آزادی" کے تصور کا خاتمہ ہوگیا اور قوم پرستی میں ایک بار پھر شدت پیدا ہوگئی۔ اٹلی میں مسولینی (1883ء-1945ء) اور جرمنی میں ہٹلر (1889ء-1945ء) کی قیادت میں گمراہ کن تصورات سامنے آئے اور انسانیت کو صرف 20 سال بعد دوسری عالمی جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسری عالمی جنگ (45-1939ء) نے تمام اقوام میں اس احساس کو بیدار کیا کہ جارحانہ قوم پرستی کی گرفت سے اپنے آپ کو نکالا جائے۔ قومی برتری اور بڑائی کے پرانے اور روایتی طرز عمل سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ پرانی دشمنیوں کو بھولا جائے اور اتحاد و تعاون کی نئی راہیں متعین کی جائیں جس سے دنیا کی اقوام میں انتہا پسند قومیت کے بجائے بین الاقوامی اتحاد و ترقی کا احساس اجاگر ہو۔ اس مقصد کے لئے 24 اکتوبر 1945ء کو اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اقوام کے مابین جنگ اور تصادم کی صورت میں اقوام متحدہ کو مؤثر کارروائی کرنے کا اختیار دیا گیا۔

ریاستوں کے مابین باہمی اختلافات کو ختم کرنے کے لئے "بین الاقوامی عدالت انصاف" قائم کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود قومیت کی نشوونما پرانے خطوط پر جاری رہی۔ دنیا میں 200 کے لگ بھگ آزاد اقوام کسی نہ کسی طرح سے قوم پرستی کی قوت کا اظہار کر رہی ہیں۔ اسی جذبے کی وجہ سے انسانیت چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی ہے۔

اگر حقائق کی بنیاد پر سیاسی حالات کا جائزہ کیا جائے تو قوم پرستی کی بنیاد پر ریاستوں کے قیام نے دنیا میں انتشار پھیلایا ہے۔ مثلاً یورپ کے چھوٹے سے براعظم میں 45 سے زائد ملک بن گئے ہیں جن میں سے بعض کی آبادی اور رقبہ پاکستان کے ایک ضلع سے بھی کم ہے۔ دنیا کے اس طرح حصے بخرے کرنے سے ریاستوں کے درمیان دوستی کم ہوئی ہے اور دشمنی بڑھی ہے۔ قومی منافرت اور تعصب کے باعث دنیا خطرناک حد تک جنگی تیاریوں میں مشغول ہے چونکہ چھوٹی اقوام بڑی اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لئے چھوٹی اقوام بڑی اقوام کے تسلط میں جا رہی ہیں۔ اسے اصطلاحاً نئی استعماریت (New Colonialism) کہتے ہیں۔

قوم پرستی مختلف زمانوں میں مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی ہے۔ مثلاً شہنشاہیت، سامراجیت، استعماریت، سرمایہ دارانہ نظام، اشتراکی نظام، نازی تحریک، فاشی تحریک اور قوموں کے حق خودارادیت وغیرہ کی تحریکیں ایسی ہیں جن کے پیچھے کسی نہ کسی طرح سے قوم پرستی کا تصور کارفرما رہا ہے۔ ان سب تحریکوں نے دنیا پر مثبت کم اور منفی اثرات زیادہ چھوڑے ہیں۔ اسی لئے کسی ہندوستانی شاعر و مفکر نے اسے "فتنہ" کہا ہے۔ ہائز (Hayes) نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "قوم

پرستی ایک گالی ہے اور گالی کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

قوم پرستی کی روک تھام

بین الاقوامی تعلقات پر جارحانہ قوم پرستی نے تباہ کن اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس لئے بین الاقوامی تعلقات کی بہتری اور انسانی بقاء کے لئے جارحانہ قوم پرستی کا خاتمہ ضروری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح قرون وسطیٰ میں عظیم لوگوں نے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کیا تھا۔ آج اس سے بھی بڑے پیمانے پر ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی تہذیب وتمدن کی بقاء کے لئے جارحانہ قوم پرستی کی روک تھام کی جائے ہمیں اس وقت ایک عالمی وفاداری اور عالمی خدمت گزاری کی ضرورت ہے۔ اگر انسان کے جذبہ جنگ کو غربت، عدم مساوات اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنے پر لگا دیا جائے تو امید کی جاتی ہے کہ دنیا میں نہ صرف امن قائم ہو جائے گا بلکہ انسانیت کی سلامتی اور خوشحالی کو بھی بے پناہ وسعت ملے گی۔ قوم پرستی کی روک تھام کے لئے ماضی میں حسب ذیل اقدامات کئے گئے ہیں۔

1- **توازنِ طاقت**: جارحانہ قوم پرستی کو روکنے کے لئے توازن طاقت (Balance of Power) کا طریقہ بہت ہی پرانا ہے۔ اسی طریقے کو چارسو سال قبل مسیح میں اپنایا گیا۔ پندرھویں اور سولہویں صدی میں اس نظریے کی تشکیل نو کی گئی۔ یورپ کی سات سالہ جنگ (63-1756) جس میں برطانیہ اور جرمنی، فرانس کے خلاف متحد ہوئے اور ویانا کانفرنس (1815ء) کے فیصلوں میں اس نظریے نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد توازن طاقت کا نظریہ برطانیہ سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اسی توازن کے بگڑنے سے پہلی اور دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی مختصر یہ کہ توازن طاقت نے قومی خودغرضی کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور بعض اوقات اس تصور نے بے لگام قوم پرستی کو تقویت بھی پہنچائی ہے۔

2- **اتحادات**: توازن طاقت کی پالیسی کو برقرار رکھنے اور قوم پرستی کی شدت میں کمی کرنے میں سترہویں صدی کے آخری زمانے کے اتحادات (Alliances) نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور روس کے مابین بادشاہوں کی مجلس (1873ء) سب سے اہم ہے۔ یہ مجلس 1887ء میں بلغاریہ کے مسئلے پر روس اور آسٹریا کے درمیان واضح اختلافات کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ جنگ کے خطرے کو کم کرنے کے لئے جرمن چانسلر بسمارک نے روس اور آسٹریا کا معاہدہ کروایا جس سے روس اور فرانس کے اتحاد کا معاملہ بھی ختم ہو گیا۔

جرمنی، آسٹریا اور اٹلی کے درمیان 1882ء میں اتحاد ثلاثہ (Triple Alliance) قائم ہوا۔ اس معاہدہ کی وجہ سے اٹلی کو فرانس سے تحفظ ملا۔ جرمنی اور آسٹریا پر روس کے حملے کی صورت میں اٹلی

مدد دینے کا پابند تھا۔ اس معاہدے کے جواب میں (1907ء میں برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان اتحاف ثلاثہ (Triple Entete) کا معاہدہ ہوا۔ ان دونوں معاہدوں میں جرمنی اور برطانیہ اپنے اپنے گروہوں کے سربراہ تھے۔ ان اتحادات کی بدولت یہاں ایک طرف توازن طاقت قائم ہوا وہاں دوسری طرف خفیہ معاہدات کی بدولت کشیدگی میں اضافہ بھی ہوا۔ دنیا میں ہونے والی بڑی جنگیں انہیں اتحادات کی مرہون منت ہیں۔ مزید یہ کہ کبھی کبھی اتحادی اپنے ذاتی مفاد کے لئے ساتھیوں کو پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر علیحدہ معاہدہ بھی کر لیتے ہیں۔

3۔ **معاہدات:** قوم پرستی کی شدت کو روکنے کے لئے اتحادات سے ملتی جلتی ایک اور کوشش معاہدات (Treaties) کی ہے۔ عموماً معاہدات جنگوں کے بعد صورتحال کو درست کرنے اور آئندہ جنگوں کو روکنے کے لئے ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں جدید دور کا پہلا معاہدہ ویسٹ فالیہ (1648ء) کا تھا جو یورپ میں 30 سالہ جنگ کے خاتمے پر ہوا اور اس معاہدے کے تحت تمام اقوام کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا گیا۔

پہلی عالمی جنگ (1914-19ء) کے بعد تشکیل پانے والی مجلس اقوام اور دوسری عالمی جنگ (1939-45ء) کے اختتام پر قائم ہونے والی اقوام متحدہ کا مقصد بھی قوم پرستی کے منفی رجحان کو کم کر کے بین الاقوامیت کے جذبے کو فروغ دینا ہے۔ اقوام متحدہ کی کارکردگی حوصلہ افزا نہ سہی بہرحال کوششیں قابل ستائش ہیں۔

4۔ **یورپی رجحان:** انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی معاملات کی رہنمائی اور توازن طاقت کی نہایت بڑی بڑی سلطنتوں کے ایک فضول سے راضی نامے کے ذریعے کی گئی۔ اس راضی نامے کو عموماً طور پر یورپی رجحان (Europen Trend) کہا جاتا ہے۔ جرمنی، آسٹریا، فرانس، اٹلی، برطانیہ اور روس کم و بیش تمام اہم معاملات پر دوستانہ مفاہمت میں متفق ہو گئے تھے۔ اس رجحان کا سب سے اہم کارنامہ برلن کانگریس (1878ء) ہے جس نے روس اور ترکی کی جنگ کو بند کروادیا دیگر یورپی سلطنتوں نے مل کر ترکوں پر روسیوں کی کامل فتح کے ثمرات سے، روس کو محروم کر دیا اس میں شک نہیں کہ بلقان میں آزاد یا نیم آزاد ریاستیں قائم کی گئیں لیکن ملک کے بڑے حصے پر قبضہ ترکی ہی کا رہا۔

بیسویں صدی کے شروع میں یہ رجحان ختم ہونا شروع ہو گیا۔ پیرس امن کانفرنس (1919ء) میں تمام اقوام کے ''حق خود اختیاری'' کو تسلیم کر لیا گیا اور موثر انتظام کے ذریعے مجلس اقوام کا قیام عمل میں لایا گیا۔

5۔ **بین الاقوامی ثالث:** کسی مسئلے کے حل کے لئے دو ریاستیں کسی تیسری ریاست کو ثالث

(Arbitrator) بنالیتی ہیں اور وہ مسئلے یا جھگڑے کا تصفیہ کروا دیتا ہے۔ ثالثی کے لئے فریقین کی رضا مندی ضروری ہے اور ثالثی کا فیصلہ قانونی اعتبار سے حتمی مانا جاتا ہے۔

ہیگ کانفرنسوں (1899ء، 1907ء) میں مستقل عدالتِ ثالثی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان کانفرنسوں میں شریک ممالک ہی ثالثی عدالت کے اراکین کو نامزد کرتے تھے۔ اس عدالت نے کئی ایک اہم فیصلے کئے جن سے بین الاقوامی قانون کی تدوین میں بھی مدد ملی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ عدالت ''مستقل عدالت برائے بین الاقوامی انصاف'' کی شکل میں سامنے آئی اور دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کا نام بین الاقوامی عدالت انصاف کر دیا گیا۔ اگر کوئی فریق عالمی عدالت کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو دوسرا فریق بین الاقوامی قانون کے تحت مہیا ذرائع کو کام میں لا کر پہلے فریق پر دباؤ ڈال سکتا ہے۔

قوم پرستی کا تنقیدی جائزہ

تاریخ انسانی میں قومیت کی ابتداء یہودیوں کی قدیم تاریخ سے ہوتی ہے اور آج بھی یہ احساس لوگوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر قوم پرستی اور اس کے ردعمل کے طور پر رونما ہونے والے بے شمار تاریخی واقعات پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ قوم پرستی کے احساس کو انتہا پسندی کی طرف لے جانے والے وہ لوگ ہیں جو زندگی کے مادی مفادات کے حصول کے لئے انسانی فطرت کی منفی قوتوں کو ابھارنے کا گھناؤنا کھیل کھیلتے ہیں۔ ان لوگوں پر مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں تنقید کی جا سکتی ہے۔

1- **نسلی تسلسل:** ہمارا نقطہ نظر بلکہ عقیدہ ہے کہ انسان تخلیق کے وقت بھی انسان تھا اور اپنی زندگی کے ہر دور میں انسان ہی رہا ہے کبھی کیڑا، حیوان یا کوئی اور شے نہیں تھا۔ انسان کی تخلیق کے بعد اس کی نشوونما خاندان کے روپ میں ہوئی۔ مختلف انسان فطری طور پر مختلف نسلوں کی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لئے اگر کبھی نسل کا سوال پیدا ہوتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس میں برتری و کمتری کی تعلیم انسانوں کی ایجاد کردہ ہے۔ فطرت پوری انسانیت کو ایک ہی گردانتی ہے قومیتوں میں تقسیم نہیں کرتی۔

2- **خطہ زمین:** انسان ایک مخصوص خطہ زمین پر پیدا ہوتا ہے اور بڑے خطہ زمین کو اپنا وطن قرار دیتا ہے اور اس میں توسیع بھی چاہتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس اصول کے تحت کسی خطہ زمین کو وطن قرار دیتا ہے اور اس اصول کے تحت پوری دنیا کو اپنا وطن قرار دینے میں کیا چیز مانع ہوتی ہے۔ چنانچہ خطہ زمین کے حوالے سے قومیت کا تصور بے معنی چیز ہے۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ تمام زمین

انسانوں کا وطن ہے اس کے کسی ایک ٹکڑے پر قناعت کرنا اور اس سے شدید محبت کا اظہار کرنا نہ صرف جاہلیت ہے بلکہ غیر فطری بھی ہے۔

3۔ لسانی مسئلہ: زبان انسانوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ذریعے کا مقصد ایک دوسرے کے احساسات اور خیالات سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اصل چیز ''احساس وخیال'' ہے یا ذریعہ انتقال۔ ظاہر ہے کہ اصل چیز احساس وخیال ہے اور اسے ایک کے بجائے 10 زبانوں میں بھی ظاہر کیا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ہزاروں خیالات ایک ہی زبان میں ادا ہوں تو ان کی حیثیت نہیں بدلتی۔ اس لئے فطرت کا تقاضا ہے کہ ذریعہ اظہار کو مقصد بنانے کی بجائے اصل چیز ''خیال'' کو مقصد کی حیثیت دی جائے ورنہ وہ بنیادی مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے حصول کے لئے زبانیں وجود میں آئی ہیں۔ چنانچہ زبان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا مسئلہ بھی بے معنی اور خودغرضانہ احساس کی پیداوار نظر آتا ہے۔

4۔ رنگ کا تفاوت: انسانوں کے درمیان رنگ کا تفاوت مختلف خطوں اور موسمی تغیرات کا مرہون منت ہے۔ اس لئے انسانوں کے درمیان رنگ کا امتیاز مہمل اور بے معنی چیز ہے۔ اصل چیز انسان کے اندر کی روح ہوتی ہے جس سے انسان کے اچھے اور برے ہونے کا تعین کیا جاتا ہے اور یہی روح دراصل انسان کے اعمال وکردار کے خطوط کو پروان چڑھاتی ہے۔ روح کسی بھی رنگ کے انسان کے اندر ہو اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا اس لئے رنگ کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل غیر فطری بات ہے۔

5۔ مشترکہ مفادات: مشترکہ مفادات کا مسئلہ بھی خالصتاً خودغرضی کی پیداوار ہے۔ عام طور پر جغرافیائی تقسیم اور معاشی وسماجی مفادات کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا مقصد بھی مخصوص لوگوں کے مفادات کا تحفظ ہے۔ مخصوص لوگوں کے مفادات کے تحفظ سے ہمیشہ لوگوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مخصوص لوگوں کے مفاد کے لئے کچھ لوگوں کا نقصان تقاضائے فطرت کے منافی ہے۔ زمینی وسائل پر کسی کا حق ثابت کرنا اور کسی کو محروم رکھنا اور اس بنیاد پر قومیت کو ابھارنا بدترین فطری جرم ہے۔

قوم پرستی کی تشکیل کرنے والے عناصر اگرچہ تنقیدی نقطہ نظر سے غیر فطری اور خودغرضی کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں لیکن اس بات سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان عناصر کے اثرات ماضی میں گہرے تھے، حال اور مستقبل میں بھی گہرے ہی رہیں گے۔

سوال: کلیت پسندی کا مفہوم بیان کریں۔ 1997ء

کلیت پسندی / ہمہ گیریت

جواب: TOTALITARIANISM

کلیت پسندی کا مفہوم MEANING

کلیت پسندی کا لفظ مطلق العنان حکومت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس میں صرف ایک پارٹی حکمران ہو اور جس کی بنیاد حکومت کی ہمہ گیریت کے تصور پر ہو۔ یہ تصور اس فراخ دلانہ تصور کے خلاف ہے، جس میں حکومت کے سپرد چند فرائض کر دیئے جاتے ہیں اور باقی فرائض فرد کی مرضی پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ہمہ گیر حکومت زندگی کے ہر شعبے پر خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا پبلک اپنا اثر رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہر فرد اس کے مطالبے پر سر تسلیم خم کر دے۔ یہ اصطلاح مسولینی کے ماتحت اٹلی کی فسطائی حکومت (1922-43ء) اور ہٹلر کے ماتحت جرمنی کی نازی حکومت (1933-45ء) کے لئے استعمال ہوا کرتی ہے۔

تحقیق اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اگرچہ فسطائی اٹلی میں اور نازی جرمنی میں افراد اور جماعتیں ایسے قانون اور برتاؤ سے دوچار ہوتی تھیں جن کی وہ مخالفت نہیں کر سکتے تھے اور جو اکثر ظالمانہ اور سنگدلانہ ہوتے تھے۔ تاہم طاقت اور اختیارات اس حد تک ایک مرکز میں جمع نہیں تھے جو صحیح معنوں میں جمع ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ لفظ عام طور پر ایسی طرف حکومت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا مقصد حکومت کی ہمہ گیریت ہو۔ خواہ وہ عملی طور پر اس مقصد کو حاصل نہ کر سکے۔ اس وسیع تر معنی میں یہ لفظ عوامی جمہوریہ چین، سوویت روس (1917-91ء) فسطائی اٹلی اور نازی جرمنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فائنر (Finer) نے اپنی کتاب ''مسولینی کا اٹلی'' میں کلیت پسندی کی وضاحت، مسولینی کے اس قول سے کی ہے۔ ''تمام چیزیں ریاست کے تابع ہوتی ہیں۔ کوئی چیز نہ تو ریاست کے دائرہ سے خارج ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس سے متصادم ہے۔''

کارل فریڈرک (Carl Friedrich) کے مطابق 'کلیت پسند ریاست میں اختیارات کی تقسیم نہیں ہوتی۔ صرف ایک فرد یا اس کی جماعت کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ ابلاغ عامہ کی مدد سے سرکاری نظریے کی تبلیغ کی جاتی ہے اور ساتھ ہی طاقت کے ذریعے اس کا نفاذ کیا جاتا ہے۔''

اسیرواتھم (Asirvatham) لکھتا ہے کہ ''جدید سیاسی ادب میں کلیت پسند ریاست آزاد خیال جمہوری ریاست کی ضد ہے۔ کلیت پسند ریاست افراد کے تمام شعبہ حیات پر حاوی ہوتی ہے اور ریاست انہیں پابند بناتی ہے کہ وہ اس کی ہدایت کے مطابق زندگی گزاریں، کیونکہ ان کی زندگی

ریاست ہی کی امانت ہے۔"

کلیت پسندی کی تاریخ HISTORY

کلیت پسندی کوئی جدید طرز حکومت نہیں ہے بلکہ یہ ایک قدیم طرز حکومت ہے۔ قدیم یونانی ریاستیں صحیح معنوں میں کلیت پسند ریاستیں تھیں۔ وہاں معاشرہ اور ریاست میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ ریاست پوری معاشرتی زندگی کو منضبط کرتی تھی۔

پروفیسر ڈننگ (W.A.Dunning) کے مطابق افلاطون (427 ق م-347 ق م) نے ریاست کو ایک مثالی اخلاقی ادارہ قرار دیا ہے۔ اور ریاست میں حکمرانی کے اختیارات ایک فلسفی بادشاہ کے سپرد کیے ہیں، جو افراد کی بہترین رہنمائی کرنے پر قادر ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ فرد اپنی اخلاقی ترقی کے لیے اس کی غیر مشروط اطاعت کرے۔ اس لئے افلاطون کو پہلا فسطائی فلسفی کہا جاتا ہے۔

پروفیسر چارلس میریم (Charles Merrium) کے مطابق ہابس (1588ء-1679ء) بھی مطلق العنان مقتدر اعلیٰ کا تصور پیش کرتا ہے، جو بہتر طور پر سمجھتا ہے کہ ریاست کے دفاع کے لئے کیا ذرائع تیار کرنے ہیں اور لوگوں کو کیا تعلیم دینی ہے۔ اسے قانون سازی، انتظامی اور عدالتی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

ہاب ہاؤس (Hob House) کہتا ہے کہ روسو (1712ء-1778ء) نے نظریہ ارادہ عامہ کے ذریعے اکثریت کی مطلق العنان حکومت کا جواز پیش کیا اور یہی تصور زیادہ خطرناک صورت میں مثالیت پسند (Idealist) مفکر ہیگل (1770ء-1831ء) کے یہاں پایا جاتا ہے۔ جو ریاست کو افراد کی آزادی کی عملی تعبیر بتاتا ہے۔ اسے مطلق، دائمی اور مافوق الفطرت ادارہ قرار دیتا ہے اور یہاں تک کہتا ہے کہ ریاست دنیا میں خدا کا مظہر ہے۔ اسی لئے اس کے ایک شاگرد مشہور مورخ ٹریشکے (Treitschke) نے کہا ہے کہ افراد کو چاہیے کہ ریاست کو سجدہ کریں۔

دوسری طرف عملی میدان میں بعض حکمرانوں کے طریق حکمرانی سے بھی اس موقف کو کافی سہارا ملا۔ سترہویں صدی میں فرانسیسی بادشاہ لوئی چہار دہم خود کو ریاست کہا کرتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں فرانس کے مطلق نپولین بونا پارٹ نے اور انیسویں صدی میں پنجاب کے استبدادی حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے طریقہ حکمرانی سے اس نظریئے کو تقویت دی۔ بیسویں صدی میں اٹلی کی فسطائی جماعت کے قائد مسولینی نے جرمن نازی پارٹی کے رہنما ہٹلر نے اور سوویت روس کے رہبر اسٹالن نے کلیت پسند ریاست قائم کی۔ دوسری عالمی جنگ (1939-45ء) کے بعد ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے اکثر نو آزاد ممالک نے بھی اس نظام کو اپنایا ہے۔

کلیت پسند ریاست کی خصوصیات / اصول

کلیت پسند ریاست کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

1- **آمرانہ نوعیت:** کلیت پسند ریاست آمرانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ جمہوری نظام کی مخالف ہے۔ ریاست کے اعلیٰ اختیارات ایک فرد یا جماعت کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتے ہیں۔ عوامی جمہوریہ چین کی کمیونسٹ آمریت، سوویت روس، فسطائی اٹلی اور نازی جرمنی کی آمریتیں اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

2- **عقل و دلیل کی ناپسندیدگی:** کلیت پسندی میں عقل اور دلیل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسانی جبلت اور خواہشات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مسولینی اور ہٹلر نے اپنی ساحرانہ قوت خطابت سے عوام کی سوچ و فکر پر جوش اور جذبے کا رنگ غالب کر دیا تھا۔

3- **فرد کی آزادی کا خاتمہ:** کلیت پسند ریاست میں فرد کو کسی قسم کی آزادی میسر نہیں ہوتی ذرائع ابلاغ کے تمام ذرائع حکومت کے کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ ہر فرد کو صرف حکومت کے حق میں بولنے اور لکھنے کی آزادی ہوتی ہے۔ جرمن دانشور ڈاکٹر اوتو دیترک (Dr.Otto Dietrich) لکھتا ہے کہ ''کلیاتی نظام میں فرد کی آزادی بے معنی چیز ہے۔ آزادی صرف قوم، نسل اور عوام کی آزادی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی مادی اور تاریخی حقیقتیں ہیں۔ اور انہیں کے ذریعے فرد کے وجود کا اظہار ہوتا ہے۔'' کلیت پسندوں کے نزدیک آزادی اور حقوق ریاست کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ اس لئے فرد کو ریاست کے خلاف کوئی حق نہیں ہوتا۔ جبکہ ریاست کو فرد کی زندگی پر مکمل اختیار ہوتا ہے۔

4- **پروپیگنڈہ:** کلیاتی نظام میں پروپیگنڈہ ایک اہم ہتھیار ہے۔ جس کے ذریعے قائد اور جماعت کے پروگرام کو عوام میں مقبول بنایا جاتا ہے۔ عوام کو متاثر کرنے کے لئے نفسیاتی حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہٹلر کا خیال تھا کہ پروپیگنڈہ میں مقصد کے حصول کیلئے تمام ذرائع جائز ہوتے ہیں۔ کلیت پسند ریاست میں پریس حکومت کی حمایت کرنے کی پابند ہے۔

ڈاکٹر جوزف گوئبلز (Dr. Joseph Goebbels) کہتا ہے کہ ''پریس تشہیری وزارت کے ہاتھوں میں پیانو کی طرح ہے۔ جس پر وہ اپنی مرضی کے راگ چھیڑتی ہے۔'' اس کا یہ بھی قول ہے کہ ''ایک جھوٹ کو سو بار اس طرح دہراؤ کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگیں۔'' لہٰذا جنگ عظیم دوم (45-1939ء) کے دوران فسطائیوں اور نازیوں نے ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال کر کے اپنے عوام کے حوصلے کو بلند رکھا۔

5- قائد کی غیر مشروط اطاعت: کلیاتی نظام میں لوگ اپنے قائد، جماعت اور حکومت کی غیر مشروط اطاعت کرتے ہیں۔ قائد کی نافرمانی بغاوت کے زمرے میں آتی ہے اور کوئی باغی سیاست میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ مسولینی نے اپنی قوم کو یہ نعرہ دیا تھا "اعتقاد رکھو، اطاعت کرو اور لڑو۔" عوامی جمہوریہ چین کے دستور میں لکھا ہے کہ ہر فرد حکومت کے قوانین، کمیونسٹ پارٹی اور اس کے رہنماؤں کی اطاعت کرے۔"

6- قوم پرستی کا پرچار: کلیت پسندی قوم پرستی کا پرچار کرتی ہے۔ ریاست کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتی ہے۔ جذبہ قومیت کو اتنی ہوا دیتی ہے کہ دوسری قوموں کے خلاف بغض ونفرت، حسد و عداوت کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ جو جارحانہ جنگ اور ملک گیری کی ہوس کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ جرمنی اور اٹلی نے پہلی عالمی جنگ (18-1914ء) کے بعد انہی اصولوں پر عمل کیا۔

7- جنگ پرستی: کلیت پسند قومی زندگی کے ارتقاء کے لئے جنگ کو لازمی سمجھتے ہیں۔ مسولینی کا قول ہے۔ "جنگ مرد کے لئے ایسی ہی فطری چیز ہے جیسے زچگی عورت کے لئے" وہ مزید کہتا ہے کہ "دنیا میں بہت سی خوبصورت چیزیں ہیں۔ مگر سب سے زیادہ خوبصورت چیزیں بندوقیں، توپیں اور جنگی ہتھیار ہیں۔" اپنی جنگ پرستی اور سامراجیت کی وجہ سے مسولینی عالمی امن کے نعرے کو بزدل کا خواب کہتا تھا۔ 1939ء میں جب مسولینی نے البانیہ کو فتح کیا تو ایک تقریر میں حقارتانہ انداز میں کہا "میں ان کو نہ بھائی بھائی تصور کرتا ہوں اور نہ بہن بہن۔ میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ کون فاتح ہے اور کون مفتوح۔" مسولینی کی طرح ہٹلر بھی جنگ کا دلدادہ تھا۔

8- رواداری اور انسانیت میں یقین نہیں: کلیت پسندی رواداری اور انسانیت میں یقین نہیں رکھتی۔ بلکہ ریاست اپنے کو مالک کل سمجھتی ہے۔ ہٹلر نے نسلی برتری کا اتنا پروپیگنڈا کیا کہ دوسری ملتیں ذلیل وخوار سمجھی جانے لگیں۔ یہودیوں پر جو مظالم ہوئے، اس سے انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ سے بچے نکال کر ماؤں کے سامنے ذبح کر دیئے جاتے تھے۔

9- معاشری خود کفالت: کلیت پسند ریاست خود کفالت کی پالیسی پر گامزن ہوتی ہے۔ تاکہ جنگ کے زمانے میں اپنی معاشی ضروریات کو اچھی طرح پوری کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جرمنی نے مصنوعی اون، کپاس اور ربڑ تیار کیا اور بین الاقوامی تجارت کے ذریعے اپنی مصنوعات کی کاسی کا انتظام کیا۔

10- مذہب کی دشمن: کلیاتی ریاست مذہب کی دشمن ہے۔ اشتمالیت تو مذہب کو ایک نشہ آور شے (افیون) سمجھ کر اس سے چھٹکارہ چاہتی ہے۔ فسطائیت اور نازیت نے مذہب کو ریاست کا غلام

بنا دیا۔ جرمنی میں عیسائیت کو جرمن نسل کے لئے موافق نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ ہٹلر نے ایک نئی عیسا بت کو
جنم دیا جو جرمن قوم کے لئے مناسب تھی۔ ہٹلر نے عیسائیت کے قول کو ایسے بگاڑا کہ ''قیصر کی چیز ں کا
قیصر کو حساب دو، اور خدا کی چیزوں کا بھی قیصر کو حساب دو۔''

جے۔ اے اسپنڈر (G.A. Spender) لکھتا ہے کہ ''سوویت روس کے حکمرانوں نے : ہب
کو ختم کرنے کی مہم چلائی۔ مسولینی نے اسے بانجھ بنانے کی کوشش کی۔ ہٹلر نے اسے ختم کرلیا اور بین
کے آمر جنرل فرانکو نے اس کا استحصال کیا۔''

11- عوامی تحریک: سوویت روس میں اشتمالیت، اٹلی میں فسطائیت اور جرمنی میں نازیت نے
عوامی تحریک کی شکل اختیار کی۔ گو کہ ان نظریات کے علمبردار شروع میں کم تھے لیکن منظم تھے۔ مد
سے لگن رکھتے تھے اور سیاسی مقاصد سے آگاہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے نہ صرف اقتدار حاصل کر نے
میں کامیابی حاصل کی، بلکہ عوام کی حمایت بھی حاصل کرلی۔ اٹلی اور جرمنی میں عوام کی حمایت حا ل
کرنے کے لئے نفسیاتی حربے (خوف، قوت اور ہیبت) استعمال کئے گئے۔ جبکہ سوویت روس ں
بالشویک جماعت نے تمام ضروریات زندگی کی فراہمی کا وعدہ کر کے عوام کی حمایت حاصل کی۔ بہر ں
ان تینوں ممالک میں عقل کے بجائے جذبات سے اپیل کی گئی اور عوام نے مجنونانہ انداز میں ے
اکابرین کی حمایت کی۔

سوال: بین الاقوامیت سے کیا مراد ہے نیز اس کے ارتقاء کے بارے میں بتایئے۔ 1999ء

بین الاقوامیت

INTERNATIONALISM

بین الاقوامیت سے مراد یہ ہے کہ آزاد قومی مملکتیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر تنہا اپنی کوشش سے اپنے عوام کی کفالت نہیں کر سکتیں۔ لہذا انہیں اپنے عوام کے امن و تحفظ اور خوشحالی کے لیے بین الاقوامی تنظیمیں قائم کر کے اور ان کے ذریعے ایک دوسرے سے تعاون کر کے مشترکہ مفادات کو فروغ دینا چاہئیے۔ بین الاقوامیت کی پشت پر کفالت باہم اور بین الاقوامی تقسیم عمل کے اصول کارفرما ہیں۔ لیکن بین الاقوامیت کسی بھی طرح قوم پرستی (Nationalism) کی ضد نہیں ہے۔ اس سے قومی مملکت کی نفی ہوتی ہے بلکہ یہ اصول قومی مملکتوں کے آزادانہ اور جداگانہ وجود کو تسلیم کرتے ہوئے قوم پرستی کی انتہا پسندانہ شکلوں مثلاً شاونیت، سامراجیت اور استعماریت وغیرہ کو رد کرتا ہے لیکن بین الاقوامی تعاون کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ مملکتیں مشترکہ مفاد کے حق میں اپنے بعض اختیارات سے دستبردار ہونے اور اپنے اقتدار پر بعض پابندیاں قبول کرنے کیلئے بھی تیار ہوں۔ مشہور برطانوی ماہر سیاسیات گولڈ اسمتھ (Gold Smith) نے بین الاقوامیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

”بین الاقوامیت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے تحت ایک فرد اپنے آپ کو صرف اپنی مملکت کا شہری تصور نہیں کرتا بلکہ پوری دنیا کا شہری سمجھتا ہے۔“

سیاسی مفکرین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مختلف ملکوں اور قوموں کو زیادہ سے زیادہ ایک

دوسرے کے قریب لایا جائے۔ تاکہ دنیا میں پائیدار امن قائم رہے اور تمام ملکوں کے لوگ مل جل کر زندگی بسر کریں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دنیا میں آزادی، اخوت اور مساوات کے اصولوں پر عمل ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگ جغرافیائی یا ملکی سرحدوں سے باہر نکل کر خالص انسانیت کے نصب العین کو اپنائیں اور ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھیں ورنہ رنگ، نسل، زبان اور مذہب کے جھگڑوں کی وجہ سے دنیا میں ہمیشہ ہولناک اور خونریز جنگیں ہوتی رہیں گی اور انسانی تہذیب تمدن بلکہ ساری انسانیت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گی۔ اس صورتحال کے پیش نظر سیاسی مفکرین کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ جارحانہ قوم پرستی کی وجہ سے کسی قوم یا ملک میں دوسری قوموں اور ملکوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے دنیا کا امن ختم ہو جاتا ہے اور جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انہوں نے دنیا کے سامنے بین الاقوامیت کا تصور پیش کیا۔ یعنی یہ کہ جغرافیائی حد بندیوں اور قوم پرستی کی تنگ نظری سے باہر نکل کر سوچنا چاہیے اور تمام ملکوں کے رہنے والوں کو مل کر دنیا میں امن قائم رکھنا چاہیے۔

بین الاقوامیت کا ارتقاء (EVOLUTION)

بین الاقوامیت کا تصور نیا نہیں ہے۔ بلکہ انسانی ضرورتیں اور فطرت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ دیگر انسانوں کے ساتھ اشتراک وتعاون کرے اور باہم مل جل کر زندگی بسر کرے۔ چنانچہ جیسے جیسے زندگی پیچیدہ اور گوناگوں مسائل کا شکار ہوتی جا رہی ہے ویسے ویسے انسانی اشتراک کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بعض مصنفین کے نزدیک قدیم یونانیوں، رومیوں اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں بھی بین الاقوامیت کے جذبات بدرجہ اتم پائے جاتے تھے۔ قدیم یونان کی شہری ریاستوں (City States) کا ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا برتاؤ رہتا تھا۔ اور ہر ریاست دوسری ریاست میں اپنا سفیر بھیجتی تھی۔ جنگ کی صورت میں غیر یونانی مفتوحین کو شہری حقوق نہیں دیئے جاتے تھے۔ رومن عہد میں پہلی بار مختلف ملکوں کے لوگوں کے نسلی وقومی اختلافات کو کم کر کے ایک ہی قانون کے ماتحت لانے کی کوشش کی گئی۔ اسے بین الاقوامی قانون (Jus gentium)* کہا گیا۔ رومی عہد کے بعد اسلامی عہد شروع ہوا۔ اسلام نے پورے انسانی سماج میں انقلاب برپا کیا۔ بین الاقوامی طرز عمل میں بھی اس نے بڑی دور رس بلکہ انقلابی تبدیلیاں کیں۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ میں زبردست اصلاح کی۔ اس سے قبل جنگی قیدیوں اور میدان جنگ میں لڑنے والوں میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جاتا تھا اور قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ جنگ بدر (624ء) دنیا کی پہلی جنگ تھی جس میں قیدیوں کے ساتھ

* جس جن ٹیوم (Jus gentium) کا لغوی ترجمہ قانون اجانب ہے۔ گروشش اور دیگر مفکرین نے قانون اجانب کو بین الاقوامی قانون کے ضوابط کے لئے بطور سند استعمال کیا۔

اجاگر کیا گیا۔
حج (631ء) کے موقع پر پیغمبر اسلام آنحضرتؐ نے یہ بین الاقوامی اصول دنیا کے سامنے پیش کیا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم خاک سے پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح سے قومی اور ملکی جھگڑوں اور اختلافات کا خاتمہ کر دیا اور طبقاتی تقسیم و منافرت کا یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا کہ تم اپنے غلاموں کو بھی وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ دنیا کی تاریخ میں اس خطبے کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں انسانیت اور مساوات کا اصول پیش کیا گیا ہے۔
رومن شہنشاہیت کے زوال کے بعد یورپ میں آزادی اور خود مختار سلطنتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ سترھویں صدی میں ویسٹ فالیہ (1648ء) کے صلح نامے نے یورپی ممالک کی آزادی کو تسلیم کر لیا اور اس طرح نہ صرف عالمگیر شہنشاہیت بلکہ عالمگیر پاپائیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور یورپ میں قومی مملکتوں کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں ہالینڈ کے سیاسی مفکر اور مقنن ہیوگو گروشش (1583ء-1645ء) نے "قانون جنگ و امن" (Law of War & Peace) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی اور اس میں بین الاقوامی قانون کو ایک جداگانہ قانون قرار دیا۔ اس کے عہد میں یورپ پروٹسٹنٹس اور رومن کیتھولکوں کی خون ریز جنگوں سے دوچار تھا۔ اس پر ان لڑائیوں کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اس نے سوچا کہ اگر جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ نہ ہو سکے، تو کم از کم اس کی سختی کو ضرور کم کیا جانا چاہئے۔ اس نے بین الاقوامی قانون کی بنیاد انسانی فطرت پر رکھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر بین الاقوامی قانون کی بنیاد ملکی قانون پر رکھی گئی تو ملکی قانون کی طرح یہ بھی بدلتا رہے گا اور وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کیلئے اسے بنایا گیا ہے۔ گروشش کے بعد فرانسیسی مفکر روسو (1712ء-1778ء) نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ اس نے لکھا کہ اگر یورپ کو زندہ رہنا ہے تو اس کی صرف یہ صورت ہے کہ تمام یورپی ممالک مل کر ایک نیم وفاق (Confederation) بنالیں تاکہ ہر ریاست دوسری ریاست پر بھروسہ کر سکے۔ اس حل میں خرابی یہ تھی کہ نیم وفاق بہت کمزور حکومت ہوتی ہے اور اگر وفاق (Federation) قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تو باہمی دشمنی کی وجہ سے یورپی ریاستیں اس کے لئے تیار نہ ہوتیں۔
روسو کے بعد جرمن مفکر کانٹ (1724ء-1804ء) نے بین الاقوامیت کی وکالت کی۔ اس نے کہا کہ ریاست کا وجود عالمی امن اور بین الاقوامی سکون کے لئے بھی ضروری ہے۔ وہ ریاستوں کو اقوام کی ایک "وفاقی لیگ" کے ماتحت رکھنے کا حامی تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مفکرین نے گروشش کے اس نظریہ سے اتفاق نہ کیا کہ بین الاقوامی قانون کی بنیاد فطری قانون ہے۔ ان کے

نزدیک فطری قانون کی حیثیت محض خیالی ہے۔ دنیا میں پائیدار امن قائم رکھنے، جنگوں سے نجات حاصل کرنے اور بھائی چارہ کو فروغ دینے کی صورت صرف یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں میں برطانوی مفکر پروفیسر اوپن ہائم (Openheim 1858ء-1919ء) سب سے ممتاز ہیں اس نے کہا کہ "بین الاقوامی قانون ان رسمی اور رواجی قواعد کا مجموعہ ہے جن کی پابندی تمام متمدن ریاستیں باہمی تعلقات میں کرتی ہیں"۔

ان مفکرین کی کوششوں کے ساتھ ساتھ بعض معاہدات اور کانفرنسوں نے بھی بین الاقوامی قانون کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں معاہدہ ویسٹ فالیہ (1648ء) ویانا کانگریس (1915ء) اور ہیگ کانفرنسیں (1899ء اور 1907ء) غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ ویانا کانگریس یورپی ممالک کی پہلی اجتماعی نشست تھی۔ اس نے بین الاقوامی قانون کے سلسلے میں مختلف قوموں کی آراء کا احترام کیا۔ ہیگ کانفرنسوں کے نتیجے میں مستقل عدالت ثالثی (Permanent Court of Arbitration) کا قیام عمل میں آیا۔ مختصر یہ کہ انیسویں صدی کے اختتام تک کوئی قابل ذکر بین الاقوامی تنظیم قائم نہ ہوسکی۔ لیکن اس صدی میں متعدد عالمی اداروں جیسے عالمی ٹیلی مواصلات یونین (1865ء) عالمی پوسٹل یونین (1874ء) آرٹ کے شاہکاروں کی حفاظت کا عالمی ادارہ، انجمن صلیب احمر (ریڈ کراس) اور انجمن ہلال احمر (ریڈ کریسنٹ) کی بنیاد پڑی۔ بین الاقوامی تعاون و اتحاد کی متعدد تجاویز زیر غور تھیں کہ جولائی 1914ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی اور اس نے نہ صرف دنیا کے امن و امان کو بلکہ پوری انسانی تہذیب کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ تیسری ہیگ کانفرنس جو 1915 میں منعقد ہونی تھی جنگ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ جنگ کے خاتمے پر ہیگ کانفرنسوں کی جگہ ایک بین الاقوامی تنظیم مجلسِ اقوام قائم کی گئی اور امن و جنگ کے معاملات اس کے دائرہ کار میں آ گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اقوام متحدہ اسی مجلس کی جانشین بنی۔

بین الاقوامیت کے عناصر (ELEMENTS)

وہ عناصر جن کی بناء پر بین الاقوامیت کی نشوونما ہوئی حسب ذیل ہیں۔

(1) سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی: سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے ذرائع مواصلات اور رسل و رسائل میں بہت آسانی ہوگئی ہے۔ وقت اور فاصلہ کی قیود ختم ہوگئی ہے۔ وسیع و عریض دنیا ایک "عالمی گاؤں" بن گئی ہے۔ آج کوئی مسئلہ مقامی یا قومی نہیں رہا بلکہ بین الاقوامی ہوگیا ہے۔ ایک ملک کی سیاست میں تبدیلی دوسرے ممالک کی پالیسیوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ تمام امور بین الاقوامیت کے فروغ کا سبب بنے ہیں۔

(2) **عالمی جنگوں کی تباہ کاریاں:** دنیا نے پہلی اور دوسری عالمی جنگوں سے قبل اس قدر ہولناک جنگیں نہیں دیکھی تھیں۔ اس سے قبل جان و مال کا اتنے بڑے پیمانے پر نقصان نہیں ہوا تھا۔ یہ جنگیں کسی ایک یا دو ملکوں تک محدود نہ تھیں بلکہ دنیا کے سبھی ممالک کسی نہ کسی طرح ان میں شریک تھے۔ اور بعد کے نتائج بھی تقریباً سبھی کو بھگتنا پڑے۔ بے روزگاری، بیماری، بھوک اور قحط سے بیشتر ممالک دوچار ہوئے۔ اس تکلیف دہ فضاء میں تمام لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایسا کون سا طریقہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ ایسی ہولناک جنگیں نہ ہوں۔ دنیا میں پائیدار امن قائم ہو اور پوری انسانیت کی بھلائی ہو۔ یقیناً وہ راستہ قوم پرستی کا نہیں بلکہ بین الاقوامیت کا ہے۔ جہاں قومی نقطہ نظر کی بجائے بین الاقوامی زاویہ نگاہ سے مسائل کا جائزہ لیا جاتا ہے اور مسائل کے حل کیلئے پرامن، معقول اور باعزت طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

(3) **اقتصادی انحصاری:** آج پوری دنیا ایک اقتصادی وحدت بن گئی ہے۔ ہر ملک کا دوسرے ملک پر انحصار ہے۔ اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے کے قومی تصور نے سرمایہ کاری، استعماریت اور توسیع پسندی کی بنیاد ڈالی جس کا لازمی نتیجہ جنگ نکلا۔ آج کوئی ملک ہر لحاظ سے خود کفیل نہیں ہے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک خام مال کے حصول اور مصنوعات کی کھپت کے لئے دوسروں سے اشتراک کرنے پر مجبور ہیں۔ صنعت و حرفت اور باہمی لین دین پرامن ماحول میں ہی ممکن ہے اور یہ بین الاقوامیت کے بغیر ممکن نہیں۔

(4) **بین الاقوامی میڈیا:** بین الاقوامی میڈیا خبر رساں ایجنسیوں اور الیکٹرونک میڈیا نے بھی اقوام عالم کو قریب لانے اور بین الاقوامیت کے جذبات پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میڈیا کا موثر اور مثبت کردار ہی بین الاقوامیت کے فروغ کا اہم سبب بن سکتا ہے۔

(5) **بین الاقوامی ادارے:** بین الاقوامی اداروں نے بھی جذبہ بین الاقوامیت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے ان اداروں میں مجلس اقوام (1920-45) اقوام متحدہ اور اس کی تخصیصی ایجنسیاں اور اقلیمی تنظیمیں (ناوابستہ ممالک کی تحریک اسلامی ممالک کی تنظیم، اقوام کی دولت مشترکہ، یورپی یونین، سارک اور آسیان وغیرہ) شامل ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ قوم پرستی قوموں کی ترقی اور بقاء کے لئے ضروری ہے ہم بین الاقوامیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کے بغیر عالمی امن و استحکام اور ترقی و خوشحالی ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "سیاسی ارتقاء میں قوم پرستی کی حیثیت عبوری تھی۔ لہذا اب اس کو بین الاقوامیت کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔ بین الاقوامیت پسندوں کا خیال ہے کہ "بین الاقوامیت قوم پرستی سے کہیں زیادہ بہتر ہے کیونکہ پوری انسانیت کی بھلائی کسی ایک قوم یا ملک کی بھلائی سے زیادہ

بڑی بات ہے۔ عالمی امن کے لئے سب ہی قوموں کو باہمی نفرت اور شک وشبہ کے جذبات کو ک
کرنا ہوگا اور اپنے دساتیر میں ایک جملے کا اضافہ کرنا ہوگا کہ ہم بین الاقوامی قانون اور بین الا اقوامی
عدالتِ انصاف کے فیصلوں کا احترام کریں گے۔ اس کے بغیر پائیدار عالمی امن ممکن نہیں ہے۔ عالمی
وفاق (World Federation) پر غور وفکر وقت کا زیاں کے سوا کچھ نہیں۔

سوال: ہندوستان میں جذبہ قومیت نے ہندوستان کو تقسیم کر دیا مسلم قومیت کا نظریہ ہندو قومیت سے کس طرح مختلف ہے۔

2003ء، 2008ء

ہندو قومیت پرستی کا نظریہ

Hindu Nationalism Ideology

جواب: ہندو نیشنلزم پر بات کرنے سے قبل ہمیں ہندو قومیت پرستی اور انڈین نیشنل کانگریس یا کانگریس پارٹی کی قومیت پرستی میں فرق کو سمجھنا ہوگا۔ کانگریس پارٹی کی نیشنلزم کو بھارتی قومیت پرستی (Indian Nationalism) بھی کہا جاتا ہے۔ کانگریس پارٹی کی نیشنلزم علاقائی اور مدنی تھی جس کے تحت برطانوی راج میں بھارت میں بسنے والے تمام باشندے بھارتی کہلاتے تھے۔ جبکہ ہندو قومیت پرستی (Hindu Nationalism) بھارتی قوم کے خدوخال نسلی معیارات کے تحت وضع کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہندو قومیت پرست، یہاں بھارتی قومیت پرست مراد نہیں ہے۔ انڈیا کے علاقائی اور لسانی تنوع پر غالب آنے پر زور دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک نیشنلزم کی بنیاد علاقائی نہیں بلکہ لسانی اور نسلی خطوط پر استوار ہوتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ایک ایسے مشترکہ کلچر پر بھی زور دیتے ہیں جو زیادہ تر بھارتیوں کو غیر بھارتیوں سے الگ کرتا ہے۔

بھارت کی کثیر المذہب، کثیر قومیتی آبادی اور ہندو قومیت پرست

اوپر بیان کردہ خطوط پر ہندو قومیت پرستی کے خدوخال وضع کرنے میں ہندو قومیت پرستوں کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ نہ تو انڈیا میں بسنے والے تمام لوگ ہندو تھے اور نہ ہی بھارت کے تمام حصوں میں ہندو اکثریت میں موجود تھے۔ اس صورت میں ہندو قومیت پرستی کی راہ میں حائل یہ رکاوٹ ہندو قومیت پرستوں کے لیے ایک ایسا موقع بن گئی جس کے تحت انہوں نے مسلمانوں کو غیر اور دشمن قرار دے کر ہندوؤں کو متحد کرنے کی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ مسلم اکثریت کی جانب سے موجود خطرہ، مکمل طور پر نہیں تو کافی زیادہ حد تک، برطانوی ہندوستان کے بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہونے سے حل ہو گیا۔ اس کے باوجود بھی ہندو قومیت پرستوں کے لیے ایک بڑی مشکل باقی تھی اور وہ مشکل تھی ہندو ازم میں پایا جانے والا تنوع۔ کیونکہ ہندوؤں کی نہ تو کوئی مرکزی تنظیم ہے، نہ کوئی ایک مذہبی متن اور نہ ہی مشترکہ مذہبی رسومات و عقائد، ہندوستان

جو کے ہندوؤں میں اگر کوئی مشترکہ چیز تھی تو وہ تھا ان کا موروثی گروہوں اور ذات پات پر مبنی معاشرتی نظام جس میں گروہ بندیوں کے مختلف معیارات تھے۔ تاہم یہ معاشرتی نظام جس قدر اتحاد کا ذریعہ تھا اس سے کہیں بڑھ کر تقسیم کا داعی بھی تھا۔ کیونکہ ذات پات کا مقامی نظام کافی حد تک مختلف النوع تھا جس کو نچلی ذات پات کے نظام سے مسلسل خطرات لاحق تھے۔

برہمن اور ہندو قومیت پرستی

بھارت میں ''پان انڈین'' ہندو روایت موجود تھی جو کسی حد تک صرف برہمن ذات کو دوام بخشنے کے لیے تھی، برہمن ہندو معاشرے میں پادریوں اور پڑھے لکھے افراد پر مشتمل طبقہ اشرافیہ تھا لہٰذا اس ہندو روایت کو نمایاں کرنے یا اس پر زور دینے کی صورت میں علاقائی کلچروں کی وکالت کرنے والوں اور بلند رتبہ حاصل کرنے کی خواہاں ذاتوں کے خیر خواہوں کی جانب سے مزاحمت یقینی تھی۔ اس طرح اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں کہ ہندو قومیت پرستی کی حمایت روایتی طور پر دریائے گنگا کی پٹی میں بسنے والے ہندی دان طبقے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی اور ابھی تک ہندو قومیت پرستی کو اپنے اس حلقہ نیابت سے باہر نکلنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندو روایت پسندوں اور ہندو قومیت پسندوں میں فرق

1- ہندو قومیت پرستی کو موجودہ اشرافیہ کا سیدھا سیدھا قدامت پسند محافظ نظریہ سمجھ لینا بھی گمراہ کن ہوگا۔ ''ہندو قومیت پرست'' کی اصطلاح کو عام کرنے والے بی ڈی گراہم نے ہندو قومیت پرستوں (Hindu Nationalists) اور ہندو روایت پسندوں (Hindu Traditionalists) میں فرق بھی بیان کیا ہے۔ ہندو روایت پسند اپنے نقطہ نظر میں قدامت پسند تھے جو قدیم قابل قدر اقدار کے سہارے سلسلہ مراتب پر مبنی معاشرتی نظام کے تسلسل کا جواز پیش کرتے تھے، جبکہ ہندو قومیت پسند اجتماعیت کے خطوط پر معاشرے کی تعمیر نو کرنا چاہتے تھے، اور یہی طریق کار ان کے نزدیک ایک ریاست کے قیام کا بھی صحیح طریق تھا۔

2- ہندو روایت پسند ہندو مذہب کے عقائد اور معاشرتی رسومات کے تحفظ اور ہندی و سنسکرت زبان و ادب کا مطالعہ عام کرنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے، جبکہ ہندو قومیت پرست نہ صرف ہندوازم کے تحفظ پر زور دیتے بلکہ ہندو کمیونٹی کی غیر فعال اور خوابیدہ طاقت کی ترقی بھی چاہتے تھے۔

3- ہندو قومیت پسند یورپی فاشزم سے متاثر دکھائی دیتے تھے اور جدیدیت اور صنعت کاری کے ذریعے اجتماعیت پسندی کے خطوط پر ریاست اور معاشرے کی تعمیر نو کے خواہاں تھے۔

ہندو روایت پسند معاشرتی نظام کے تحفظ کے لیے فکرمند تھے تو ہندو قومیت پرست معاشرتی نظام کی تعمیر نو اس طرح کرنا چاہتے تھے جس سے اتحاد کو فروغ دے کر ہندوؤں کو ایک سیاسی طاقت کے طور پر منظم کیا جا سکے۔

موقف اور ادراک کے اس بنیادی فرق کے باوجود ہندو روایت پسند اور ہندو قومیت پسند ایک

دوسرے کے ساتھ سیاسی تعاون کرنے کے علاوہ ایک جیسی تنظیموں میں اکٹھے شامل ہوتے رہے ہیں اور وسیع تر حلقہ نیابت پیدا کرتے ہیں۔ یہی حقیقت ہندو قومیت پرستوں کو مختلف مخمصوں سے بھی دوچار کرتی رہی ہے۔ اسی طرح ہندو قومیت پرستوں اور کانگریس طرز کے بھارتی قومیت پرستوں میں بھی کئی مفادات اور تحفظات مشترک رہے ہیں جن کی وجہ سے بعض اوقات ان دونوں میں نظریاتی طور پر امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہندو قومیت پرستی کی نظریاتی تاریخ

(Ideological Roots of Hindu Nationalism)

ہندو قومیت پرستی، کانگریس پارٹی یا بھارتی قومیت پرستی اور ہندو روایت پسندی کے درمیان پائے جانے والے ابہام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تینوں رجحانات کے مشترک پیش رفتہ واقعات کا جائزہ برطانوی نو آبادیاتی دور میں اٹھنے والے مذہبی اور سیاسی جوش و خروش اور اتھل پتھل کے تناظر میں لیا جائے۔

ہندو قومیت پرستی، جو حقیقت میں انڈین نیشنلزم ہی ہے، کی نظریاتی جڑیں اس مذہبی احیاء پسندی اور اصلاحی تحریکوں میں پائی جاتی ہیں جنہوں نے 19 ویں صدی کے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ ہندو طبقے میں جنم لیا۔ سب سے پہلے ہمیں اس کے آثار ہندوستان خصوصاً بنگال میں شروع ہونے والی لبرل اصلاحی تحریکوں میں ملتے ہیں جن کا مقصد ہندوازم کو ان خصائص سے "پاک" کرنا تھا جو اہل مغرب کے نزدیک انتہائی وحشیانہ تھے۔ بعد میں رونما ہونے والی دیگر اصلاحی تحریکوں کی طرح، ابتدائی بنگالی اصلاح کار بھی ہندو تہذیب کو عظمت رفتہ کی انحطاط شدہ شکل تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس انحطاط کی وجہ ہندوازم کو داغ دار کرنے اور مغربی احساسات کو ناگوار گزرنے والے چھوت چھات، کثیر ازدواجی اور کثرت پرستی جیسے عناصر تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں بھارت کے مختلف علاقوں میں غیر ملکی قبضے کے خلاف الگ قسم کا مذہبی ردعمل دیکھنے میں آیا۔ اس وقت بھارت میں پائے جانے والے قومیت پرستی کے تمام رجحانات کا محرک ایک ایسا معاشی سیاسی اور عسکریت پسند مذہبی احیاء پر مبنی ایجنڈا تھا جس کا مقصد برطانوی راج کا خاتمہ تھا۔ اس طرح کی تحریکیں بھارت کے مختلف علاقوں میں شروع ہوئیں۔ بنگال میں یہ تحریکیں اپنی سرگرمیاں خفیہ سوسائٹیوں کے ذریعے عمل میں لاتی تھیں۔ ان سوسائٹیوں کے ذریعے کہیں دہشت گردی کا سہارا لیا جاتا ہے اور کہیں پر غیر ملکی کپڑے اور معاشی اصلاحات کا بائیکاٹ شروع کر دیا جاتا۔

1891ء میں کانگریس رہنما بال گنگا دھر تلک ایک طرف تو لڑکیوں کی شادی کی عمر میں اضافے کے لیے کی جانے والی قانون سازی کی مخالفت کر رہا تھا اور دوسری طرف انڈین کاٹن پر لگائے جانے والے ایکسائز ٹیکس کے خلاف زوردار احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ اس طرح بال گنگا دھر تلک اور بنگال کی دہشت گرد سوسائٹیوں نے ہم عصر ہندو قومیت پرستی پر براہ راست اثرات مرتب کیے۔

گنگا دھر تلک نے لڑکیوں کی شادی کی عمر میں اضافے کے لیے بننے والے قانون کی مخالفت کے

ساتھ ساتھ ایک نئے ہندو تہوار کو فروغ دینے کی بھی کوشش کی۔ اس تہوار کا نام "تلک گنیش فیسٹیول" مشہور ہوا۔ آگے چل کر مہاراشٹر کی شیو سینا پارٹی نے ہندو مطالبے کے اظہار کے لیے تلک گنیش تہوار کو اپنایا جبکہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) اپنی تنظیم سازی کے لیے بنگال کی دہشت گرد تنظیموں سے متاثر ہوئی۔

ابتدائی مذہبی اصلاحی تحریکیں اور کانگریس کی قومیت پرستی

یہ بات خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ کانگریس کی قومیت پرستی نے بھی مذہب کی ان ابتدائی اصلاحی تحریکوں کے ساتھ اپنی ترغیبات مشترک رکھیں۔ بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور ان جیسے دیگر کانگریس رہنماؤں کی سیکولر لبرل ازم بھی ہندو اصلاح کاروں کے اس خیال کا نتیجہ نظر آتی ہے کہ ذات پات کے نظام، تہمت پرستی اور روشن خیالی کی مخالفت جیسے عناصر نے بھارتی تہذیب کے زوال میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندو قومیت پرستوں کی طرح کانگریس کی معاشی واقتصادی نیشنلزم بھی نو آبادیاتی استحصال اور معاشی پسماندگی کے تجربے کا ردعمل تھی۔ کانگریسی رہنما بھی فرقہ وارانہ تقسیم اور علاقائیت پسندوں سے خوفزدہ تھے۔ ہندو قومیت پرستوں کی طرح ان کا بھی یہ خیال تھا کہ اگر بھارت اندرونی طور پر تقسیم نہ ہوتا تو اس پر فتح حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاہم کانگریسی رہنماؤں نے، خاص طور پر گاندھی جی کے بعد، بھارتی تہذیب کی تکثیریت پر زور دے کر ان تفرقات پر قابو پانے کی کوشش کی۔

وی ڈی ساورکر نے پہلی دفعہ 1924ء میں اپنی کتاب "ہندوتوا کے لوازمات" (Essentials of Hindutve) میں ہندو قومیت پرستی کے نظریے کا واضح تصور پیش کیا۔ انہوں نے اس کتاب میں اس بات پر زور دیا کہ اس تحریک کا مقصد "ہندو سنگھٹن" یعنی ہندوؤں کا اتحاد یا وحدت ہے۔ ساورکر نے اس میں مذہبی عمل دخل کی طرف کم اور معاشی وسیاسی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے۔ جواہر لال نہرو کی طرح ساورکر کے پیش نظر بھی یہ بات سب سے اہم تھی کہ معاشی ترقی کیسے حاصل کی جائے اور یہ بھی کہ مختلف گروہوں کے درمیان سیاسی تعلق داری ہونی چاہیے اور ان کی نمائندگی بھی سیاسی ہونی چاہیے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ مذہبی اقدار سے استعانت کے بجائے قوم کی طاقت اور اتحاد کو فروغ دیں گے۔ ساورکر نے مذہبی اقدار اور رسومات کا تحفظ کرنے کے بجائے بھارتی قومیت سازی کو وضع کرنے کی کوشش کی۔ ساورکر کے نزدیک وہی فرد بھارتی باشندہ ہو سکتا ہے جو بھارت کو اپنی جنم بھومی اور مقدس سرزمین سمجھتا ہو۔ لہٰذا خود اساسی بنیادی اس تعریف میں برصغیر میں جنم لینے والی مذہبی روایات سکھ ازم، جین اور یہاں تک کہ بدھ مت کو بھی شامل کیا ہے بلکہ "غیر ملکی" مذاہب مثلاً عیسائیت اور خاص طور پر اسلام کے پیروکاروں کو اس سے خارج کر دیا گیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندو قومیت پرستی

مذہبی مخاصمت اور تعصب پر مبنی یہ سوچ، خاص طور پر بھارت کی خارجہ پالیسی میں، تقسیم ہند کے بعد بھی جاری رہی۔ اس میں کوئی حیرانگی کی بات نہیں کہ ہندو قومیت پرست ہمیشہ سے پاکستان کے مخالف رہے ہیں اور مذہبی مخاصمت بسا اوقات تو مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں تک بھی وسیع ہوتی رہی ہے۔ کانگریس کے برعکس،

جو مسئلہ فلسطین پر فلسطینیوں کی حامی رہی ہے، ہندو قومیت پرست اسرائیل کے ساتھ پینگیں بڑھاتے رہے ہیں۔ ہندو قومیت پرستوں کا رویہ اکثر جارحانہ رہا ہے اور وہ فوجی طاقت بڑھانے اور ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کے لیے دروغ کرتے رہے ہیں، وہ ایسا 1960ء کی دہائی سے کرتے آ رہے ہیں۔

ہندو قومیت پرست آریہ سماج اور کانگریس کی طرح بہت سے دیگر سیکولر معاملات پر بھی بھرپور طاقت اور اعتماد کے ساتھ اپنے خیالات اور خواہشات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے تجارتی تحفظ اور دیسی انڈسٹری کے فروغ کے لیے کوششوں کی بھرپور حمایت کی ہے۔ ان کا یہ طریقہ استدلال انہیں 1950ء اور 1950ء کی دہائیوں کی قدامت پسند سواتنترا پارٹی اور حزب اختلاف کی دیگر ایسی جماعتوں سے الگ کر دیتا ہے جو کہ نوں کے مفادات کی حامی تھیں۔

انہوں نے اکثر ایک متحدہ ریاست کے لیے اپنی ٹھوس ترجیح کا اظہار کیا ہے۔ وہ کلچر کے ادغام کے معاملے پر کوئی سمجھوتہ نہ کرتے ہوئے ہندی کو بطور قومی زبان نافذ کرنے کی پالیسی پر زور دیتے رہے ہیں۔ اپنے اس ٹھوس موقف کی وجہ سے ہندو قومیت پرست کبھی بھی جنوبی ہندوستان میں سرایت کرنے کے قابل نہیں ہو سکے جہاں کے باشندے دراوڑی زبان بولتے ہیں۔

ہندو قومیت پرستوں کے اس رویے کے باعث جنوب کی چار ریاستیں اور مغربی بنگال، جہاں ہندی نہیں بولی جاتی، اپنی علاقائی شناخت اور ریاستی حقوق کے تحفظ کے بارے میں فکر مند تھے۔ 1990ء کی دہائی میں بی جے پی (BJP) نے ان ایشوز کی اہمیت کم کرنے کی ابتداء کی اور علاقائی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کیا تب وہ کروڑوں ریاستوں میں الیکشن جیتنے کے قابل ہو سکی۔

اس کے علاوہ 1990ء کی دہائی سے لے کر اب تک بھارتی قومیت پرستوں اور کانگریس کے درمیان مختلف معاملات پر اختلافات کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک دوسرے کی پالیسیوں پر روایتی نکتہ چینی کے ذریعے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں جاری ہیں کبھی اقلیتوں کے حقوق اور مسلمانوں کے لیے انتخابات میں نشستیں مخصوص کرنے پر اختلاف ہوتا ہے تو کبھی اپنی ہی سیکولرازم کو ہدف دشنام بنایا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد سے ہندو قومیت پرست کانگریس پر سیکولرازم کے اصولوں کی خلاف ورزی کا الزام لگا رہے ہیں۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کی کانگریسی رضامندی کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا، جبکہ کانگریس کو سیکولرازم کے تحفظ کے لیے نئی نئی اصطلاحات متعارف کرانا پڑتی ہیں جیسا کہ 1990ء کی دہائی میں اس وقت کے ڈپٹی پرائم منسٹر ایل کے ایڈوانی بی جے پی کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے اصلی سیکولرازم (Genuine Secularism) اور مثبت سیکولرازم (Positive Secularism) کی اصطلاحات بنانی پڑیں۔

☆---☆---☆

سوال: یوٹوپین [illegible]

جواب: مغربی ادب کی معروف اصطلاح ہے، جس سے مراد ایسا فرضی مقام، جہاں ہر شے مکمل، مثالی اور بہترین حالت میں ہو، جہاں رہنے والے انسانوں کو تمام حقوق فراہم کیے جائیں انہیں تمام سہولتیں مہیا ہوں غرضیکہ ہر طرف چین و سکون کا دور دورہ ہو۔ ہم اسے اپنی زبان میں جنت ارضی کا عنوان دے سکتے ہیں۔ اس قسم کی ریاست یا مملکت آج تک کبھی وجود میں نہیں آئی۔

لغوی معنی

یوٹوپیا کے لغوی معنی ہیں خیالی جنت، مثالی معاشرت، مثالی دُنیا کے ہیں۔ UTOPIAN SOCIALISM یوٹوپین سے مراد ایک اقتصادی نظریہ ہے جس میں پیداواری ذرائع کی نجی ملکیت سے رضا کارانہ طور پر دستبرداری اختیار کر لی جائے۔

پس منظر

یوٹوپیا ایسی سرزمین کو کہتے ہیں جہاں باہمی اختلافات، استحصال، نفرت، اور رنج و الم کے بجائے باہمی ہم آہنگی، امن و سلامتی اور بھائی چارے کا راج ہو۔ سیاسی اصطلاح میں یوٹوپیا ایسی تخیلاتی جمہوریت کا نام ہے جس میں تمام سماجی اختلافات پر قابو پالیا گیا ہو۔

یہ اصطلاح سب سے پہلے تھامس مور نے استعمال کی تھی۔ سر تھامس مور نے سولھویں صدی عیسوی کی ابتداء کے دوران اپنی ایک کتاب "یوٹوپیا" میں استعمال کیا۔ جس کے معنی ہیں ایسا مقام جس کا کہیں وجود نہ ہو۔ سر تھامس مور نے اپنی کتاب میں ایک جزیرے کا تصور پیش کیا تھا، جہاں ایسی فلاحی ریاست قائم تھی کہ اُس ریاست میں ہر چیز اپنی مثالی صورت میں موجود تھی۔ شاید تھامس مور جانتے تھے کہ ایسی مثالی ریاست کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے اسی لیے انہوں نے اپنی تصوراتی دنیا کا نام یوٹوپیا یعنی مقام رکھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ خود بے یقینی کا شکار تھے تو پھر انہوں نے دنیا کو اس خیالی دنیا کے تصورات کی جانب کیوں متوجہ کیا، جسے کبھی وجود میں لانا خود اُن کے خیال میں ہی ناممکن تھا؟

تھامس مور کے بعد یوٹوپیا کی کئی تشریحات کی گئی ہیں۔ انہیں تشریحات میں سے ایک سوشلسٹ سماج کا تصور بھی ہے۔ گو کہ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے یوٹوپیائی سوشلزم کی ضد میں اپنی سوشلزم کا پرچار کیا تھا مگر پھر بھی وہ یوٹوپیائی سوشلزم کے حامی چارلس فریئیر اور رابرٹ اوون کو بہت زیادہ محترم سمجھتے تھے۔

بعض مغربی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یوٹوپیا کی اصطلاح سرتھامس مور نے ہی وضع کی لیکن اس قبیل کے ادب کی ابتدائی مثالیں ان سے تقریباً 2137 برس قبل یونان میں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو اور افلاطون نے ماضی میں یونان کے عروج کی مثالیں اپنی کتابوں میں پیش کی تھیں، اُن کا مقصد یہ تھا کہ ان کی بیان کردہ مثالوں کو پیش نظر رکھنے کی صورت میں یونانی معاشرہ مزید زوال کا شکار نہیں ہوگا لیکن اُن کی یہ توقعات پوری نہ ہوسکیں چنانچہ مغربی تجزیہ نگار اور ادبی ماہرین ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کو بھی یوٹوپیائی ادب میں شمار کرتی ہیں۔

مقاصد

اگر معاشرے کا ہر فرد سوشلسٹ اخلاقیات پر سختی سے کاربند رہے تو یوٹوپیائی سوشلزم تین کام سرانجام دیتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) زیردست طبقے کو بہتر زندگی گزارنے کے لئے جدوجہد کرنے اور قربانی دینے کی تحریک دیتی ہے۔

(2) سوشلزم کے مقاصد کو واضح معانی عطا کرتی ہے۔

(3) اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ سوشلزم کیونکر اخلاقی ہے، یعنی یہ کہ سوشلزم کے عقائد کا نفاذ کسی فرد کو نظر انداز کیے بغیر یا کسی کا استحصال کیے بغیر کیا جا سکتا ہے۔

کیا مثالی ریاست کا وجود ممکن ہے؟

گزشتہ صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جب انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب برپا کر دیا تو بعض مغربی و مشرقی دانشوروں اور مفکروں کو مثالی دنیا کا نیم واضح خاکہ نظر آیا۔ دراصل یوٹوپیائی تصورات میں ایسا معاشرہ پوشیدہ ہوتا ہے جہاں تمام انسانی خواہشات کی تکمیل ممکن ہو سکے۔ مغربی مفکرین مثلاً ارسطو، افلاطون، سرتھامس میور ہوں یا جی ایچ ویلز یا پھر کوئی اور مفکر! بلکہ مشرق و مغرب کے بہت سے دانشوروں میں سے اکثر کے تصورات اور نظریات کو جب بھی گہری نظر سے پرکھا جائے گا تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان میں سے اکثر کسی بھی صورت میں قابل عمل نہیں ہیں۔ یا اگر قابل عمل ہیں بھی تو انسانوں کے لیے بعض پہلوؤں سے سخت پریشان کن یا نقصان دہ۔ ان میں بعض کے نظریات کو کئی اقوام نے اپنایا بھی لیکن بعد میں وہ خود ان نظریات کو رد کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

مثال کے طور پر کسی مفکر نے یہ خیال پیش کیا کہ انسان کو معاشی طور پر ترقی کرنا چاہیے تب ہی

اُسے وہ مقام حاصل ہوگا، جس سے انسان کی دیگر مخلوقات پر افضلیت اور اشرفیت ثابت ہوسکے

کسی دانشور کے دل میں نوعِ انسانی کے لیے ہمدردی کے جذبات نے سر اُبھارا تو اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سرمائے پر چند طاقتور اور بااثر انسانوں کی اجارہ داری ختم ہونی چاہیے یوں قومی سرمائے اور وسائل کو ریاست کی ملکیت قرار دے دیا گیا سوچا یہی گیا تھا کہ اس طرح اجارہ داری کا خاتمہ ہوجائے گا لیکن ایسا نہیں ہوسکا، پہلے سرمایہ داروں کی اجارہ داری تھی، اب ریاست اجارہ دار بن گئی، عام آدمی پہلے بھی محروم تھا، بعد میں بھی وہ محروم ہی رہا۔

کچھ دانشمندوں نے نوعِ انسانی کے مصائب کا حل یہ پیش کیا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اسے آزادی ملنی چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی خواہش پوری کرے یہ بظاہر بہت ہی دلکش نعرہ تھا، چنانچہ نوعِ انسانی کی بہت بڑی تعداد نے اِس پر لبیک کہا۔ یوں خواہشات کی تکمیل کے حوالے سے آزادی کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا گیا اخلاقی قدریں پامال ہوئیں گھر اور خاندان کا تربیتی انسٹیٹیوشن، جس کا کام معاشرے کو ایسے تربیت یافتہ افراد فراہم کرنا تھا جو اخلاقی، معاشرتی، مذہبی اور روحانی قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے معاشرے کی ترقی کا باعث بنیں تباہ اور برباد ہوگیا بے لگام آزادی کا یہ نظریہ سرمایہ داروں نے اپنے منافع میں کئی گنا اضافے کے لیے پیش کیا تھا۔ انہیں انسانی مصائب کے حل سے کوئی غرض نہیں تھی۔

اس کے علاوہ بعض پسماندہ معاشروں میں بھی بہت سے مذہبی اجارہ دار اجتماعی اور گروہی صورت میں انسانوں کو مصائب سے نجات دلانے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں ان میں سے ہر ایک کے پاس خاص قسم کے معیارات اور وضع قطع کے سانچے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ ان سانچوں میں ڈھل جانے والے افراد ہی نجات حاصل کرسکیں گے بہت سے لوگوں نے اُن کی آواز پر لبیک بھی کہا اور اُن کے وضع کردہ سانچوں میں خود کو ڈھال بھی لیا لیکن ان پسماندہ معاشروں کی اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور روحانی پسماندگی بڑھتی ہی گئی کم نہیں ہوئی۔

یوٹوپیائی سوشلزم کی ترقی

جدید سوشلزم ایک طرف تو معاشرے میں موجود اس مخاصمت کی براہِ راست پیداوار ہے جو سرمایہ داروں اور مزدوروں، پروپرائیٹرز اور نان پروپرائیٹرز کے درمیان ہے جبکہ دوسری طرف یہ نتیجہ ہے پیداوار میں موجود انارکی کا۔ نظریاتی حوالے سے دیکھا جائے تو جدید سوشلزم 18 ویں صدی کے فرانسیسی فلاسفرز کے پیش کردہ نظریات ہی کی توسیع ہے۔ ہر نئے نظریے کی طرح جدید سوشلزم کی جڑیں بھی معاشی حقائق کی سرزمین میں پیوست ہیں۔ فرانس کے وہ عظیم سپوت جنہوں نے لوگوں کے ذہنوں کو آنے والے انقلاب کے لئے تیار کیا وہ بذاتِ خود بہت زیادہ انقلابی تھے۔ انہوں نے کسی بھی بیرونی طاقت چاہے وہ مذہب ہو، فطری سائنس ہو، معاشرہ یا پھر سیاسی ادارے ہوں، کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ہر ایسی طاقت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔

ان کے نزدیک ہر چیز کے لئے ضروری تھا کہ وہ عقل و دانش کے کٹہرے میں اپنا وجود تسلیم کرائے یا پھر اپنے ہونے کی انکاری ہو جائے۔ اس طرح عقل کی کسوٹی ہی ہر چیز کا معیار قرار پا گئی۔ یہ وہ وقت تھا جیسا کہ ہیگل نے کہا کہ جس وقت تمام اصول وقوانین کو انسانی ذہن کی سوچ کے لحاظ سے پرکھا جانے لگا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ صورتحال یہاں تک آ پہنچی کہ ہر وہ حقیقت جو ان اصولوں سے متصادم تھی منہ کے بل زمین پر آ گری اور حقیقت کی روشنی آشکار ہوئی۔ عقل کی سلطنت کا راج ہوا اور اب تک رائج توہم پرستیاں، ناانصافیاں، استحقاق اور استبداد کی جگہ دائمی سچ، انسان کے پیدائشی حق اور فطرت پر مبنی مساوات نے لے لی۔

آج ہم جانتے ہیں کہ یہ عقل و دانش کی سلطنت بورژوازی مثالی سلطنت سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ یہ کہ اس دائمی حق نے بورژوازی انصاف میں ہی اپنی شناخت پائی۔ یہ کہ اس مساوات نے خود کو قانون کے سامنے بورژوازی مساوات تک محدود کر لیا، یہ کہ بورژوازی املاک ہی انسان کا بنیادی حق تصور کیا جانے لگا اور یہ کہ عقل و دانش کی یہ حکومت بورژوازی جمہوری حکومت بن کر رہ گئی۔ اس طرح 18 ویں صدی کے مفکرین بھی اپنے اجداد کی متعین کی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کر سکے۔

اس کے ساتھ ساتھ جاگیرداری اشرافیہ اور شہری باشندوں (Burghers) جو خود کو سارے سماج کا نمائندہ تصور کرتے تھے کے درمیان موجود مخاصمت اصل میں، استحصال کنندہ اور استحصال کا نشانہ بننے والوں، دولتمند ناکاروں اور غریب مزدوروں کے درمیان پائی جانے والی مخاصمت تھی۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے بورژوازی نمائندوں کے لئے ممکن بنایا کہ وہ آگے پیش رفت کر کے ایک مخصوص کلاس کے بجائے ساری دکھی انسانیت کی نمائندگی کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گلڈز کے وہ مزدور جو گلڈز سے باہر نکلے وہ ہو کر جدوجہد میں مصروف ہو گئے جو بعد ازاں جدید پرولتاری کہلائے۔

مثال کے طور پر جرمنی کی تجدید دین اور کسانوں کی تحریک، میں تجدید پتسما کے حامی، انگلستان کے عظیم انقلاب میں مساوات پسند (The Levellers) اور فرانسیسی انقلاب میں بے بیوف (Babeuf) وغیرہ۔

یہ تھے وہ نظری بیان جو ایسے طبقے کی انقلاب آفرینی خیمہ تھے جو ابھی تک مائل بہ ترقی نہیں ہوا تھا جیسا کہ 16 ویں اور 17 ویں صدی میں مثالی سماجی حالات کو یوٹوپیائی شکل اور 18 ویں صدی کے حقیقی کمیونسٹ نظریات وغیرہ اس وقت تک مساوات کا مطالبہ محض سیاسی حقوق تک ہی محدود نہیں رہا تھا بلکہ اس کا دائرہ افراد کے سماجی حالات تک وسیع ہو گیا تھا۔ جس کا مقصد مخصوص طبقات کے استحقاق کا خاتمہ نہیں بلکہ طبقاتی اونچ نیچ کا خاتمہ تھا۔

اس کے بعد تین عظیم یوٹوپیائی مفکرین کا چرچا ہوا جن میں سینٹ سائمن، چارلس فریئیر اور رابرٹ اوون شامل ہیں۔ ان مفکرین نے سماجی طبقاتی نظام کے خاتمہ کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں۔ ان تینوں میں ایک بات مشترک تھی کہ ان میں سے کوئی بھی پرولتاریہ مفادات کا حامی و نمائندہ بن کر نہیں ابھرا۔ انہوں

نے فرانسیسی مفکرین کی طرح اپنی جدوجہد کا آغاز کرنے اور اسے مؤثر بنانے کے لئے کسی مخصو ص قے کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ہمہ وقت تمام انسانیت کی بھلائی اور بہتری پر توجہ مرکوز رکھی۔ وہ ابدی انصاف ور عقل کی مملکت کے خواہاں تھے مگر ان کا نقطہ نظر فرانسیسی فلاسفر سے اتنا مختلف تھا جتنا زمین و آسمان دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان تینوں مفکرین کے نزدیک بورژوازی دنیا، جس کی بنیاد ان فلاسفرز وضع کردہ اصولوں پر تھی، انتہائی زیادہ غیر عقلی، غیر منطقی اور ناانصافی پر مبنی تھی۔ ان کے نزدیک اگر پر خاص انصاف اور عقل کی حکومت قائم نہیں ہو سکی تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس انداز فکر کو ٹھیک طرح سماجی میں جا سکا۔

یوٹوپیائی یا تخیلی سوشلزم پر عملدرآمد کی کوششیں

1820ء اور 1840ء کی دہائی کے درمیان بعض ایسے افراد جو سماجی اور سیاسی نظام کی املیت پر یقین رکھتے تھے، نے سینکڑوں یوٹوپیائی کمیونٹیز کی بنیاد رکھی۔ یہ تجرباتی گروہی سماج ہی یوٹوپ کمیونٹیز کہلائے کیونکہ انہوں نے ایک مثالی معاشرے کا بنیادی خاکہ پیش کیا تھا۔ ان کمیونٹیز کی خصو ت ں بہت زیادہ تنوع تھا۔

شیکری سماج (Shakers)

ان کاملیت پسند سماجوں میں سب سے ابتدائی سماج ''شیکری'' کے نام سے جانا جاتا جس کی بنیاد 1776ء میں ایک انگریز تارک مدر این لی نے رکھی تھی۔ شیکریوں کا عقیدہ تھا کہ نیا ہزار نے لا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ لوگ گناہ کی زندگی ترک کر دیں۔ شیکری سماج میں مرد و زن کو م ی د جہ حاصل تھا۔

اولین عیسائیوں کی طرز پر زندگی گزارنے کی خواہش لئے شیکریوں نے جائیداد کی ملکیت حاصل کر لی اور سادہ زندگی گزارنے پر زور دینا شروع کر دیا۔ ان کا لباس سادہ اور طرز تعمیر زیبائش سے خالی تھا۔ وہ نہ کھڑکیوں پر پردے لگاتے، نہ فرش پر قالین بچھاتے اور نہ ہی دیواروں پر تصاویر آویزاں کرتے تھے۔ شیکریوں کے نزدیک جنسی تعلق ہی گناہ کا بنیادی سبب ہے اس لئے ان میں جنسی تعلق قطعی ممانعت تھی۔ آج شیکری تقریباً ناکام ہو کر رہ گئے ہیں۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اس سماج کے سے بھی کم افراد موجود تھے۔

رابرٹ اوون کی نئی امن کالونی (New Harmony Colony)

اس قسم کا دوسرا تجربہ رابرٹ اوون نے سکاٹ لینڈ میں ایک ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کر کے کیا۔ اوون ہی کے نام انڈیانا امریکہ میں ''نئی امن کالونی'' قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ رابرٹ او صنعتی انقلاب کے سماجی نتائج سے بہت زیادہ خائف تھا۔ رابرٹ اوون نے اس بات سے تحریک لے لوگ ماحول کا شدید اثر لیتے ہیں، انڈیانا میں زمین خریدی جہاں وہ جائیداد کی عوامی ملکیت کا تجربہ اور مذ

کرنے کا نہیں تھا۔ یہ کمیونٹی صرف تین سال یعنی 1825ء سے 1828ء تک ہی قائم رہ سکی۔

چارلس فوریئر کے دستے (Phalanxes)

Phalanxes فرانسیسی نظریہ ساز چارلس فوریئر کے پیروکاروں کا ایسا گروہ تھا جو اپنی جائیداد مشترکہ رکھتا تھا۔ تقریباً 40 کے قریب ایسی تخیلاتی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنی بنیاد چارلس فوریئر کے نظریہ پر رکھیں۔ ان کمیونٹیز میں ہر دستے (Phalanx) کی اپنی مشترکہ سٹاک کمپنی تھی۔ اس کمپنی کا منافع ممبران کی طرف سے کی گئی سرمایہ کاری، ان کی مہارت اور محنت کے تناسب سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ ان دستوں میں خواتین کو ملازمت کرنے، اجرت حاصل کرنے، فیصلہ سازی میں شرکت اور اسمبلی میں اظہار رائے کے برابر مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ ان سب کے باوجود فوریئر کی ایک کمیونٹی اٹھارہ سال تک قائم رہی جبکہ زیادہ تر ناکام ہی رہیں۔

فرانسس رائٹ کی نشوبا کالونی

فرانسس رائٹ کا تعلق سکاٹ لینڈ سے تھا جو غلامی مخالف انقلابی تصورات سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ رائٹ نے 1826ء میں ٹینیسی میں میفس کے قریب نشوبا کالونی قائم کی جس میں مختلف النسل افراد کی رہائش کا تجربہ کیا گیا۔ اس نے ایسی کالونی قائم کی جس میں غلاموں کو تعلیم حاصل کرنے اور اپنی آزادی خریدنے کے لئے پیسے کمانے کی اجازت تھی۔ رائٹ کی مرکزی خاندانی نظام، مذہب، نجی املاک اور غلامی کے خاتمے کی شدید خواہش کے باعث بہت زیادہ غم وغصہ پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے نشوبا کالونی کا خاتمہ محض چار سال بعد کر دیا گیا۔

اس ضمن میں شائد سب سے زیادہ کامیاب مگر بدنام ترین کمیونٹی جان ہمفر نے نوئیز کی اونیڈا کمیونٹی تھی۔ ہمفرے نے 1835 میں پٹنی، ورمنٹ اور 1848ء میں اونیڈا، نیویارک میں کاملیت پسند کمیونٹیز قائم کیں۔ ان میں ''پیچیدہ شادی'' کا تصور بھی رائج تھا جس میں کمیونٹی کا ہر فرد جنس مخالف کے ہر فرد سے شادی کرتا تھا۔ ہمفرے کا خیال تھا کہ نیا ہزاریہ اسی وقت آئے گا جب گناہ سے فوری اور مکمل علیحدگی اختیار کر لی جائے گی۔ ہمفرے 1879ء میں ناجائز جنسی تعلق داری کی سزا سے بچنے کے لئے کینیڈا فرار ہو گیا۔ 1990ء کی دہائی تک بھی اونیڈا میں اس کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے افراد کا سراغ موجود تھا۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوا کہ چارلس فوریئر، سینٹ سائمن، رابرٹ اوون دیگر نے ایسے معاشروں کی تصویر پیش کی جو ان کے خیال میں مثالی اور جنت نظیر تھے۔ ایسے معاشرے جن میں کوئی اختلاف نہ ہو، کوئی سماجی، معاشی اور سیاسی طبقاتی نظام نہ ہو۔ یہاں تک کہ کارل مارکس نے تو سائنسی سوشلزم کو زندگی میں رائج کرنے پر مثالی جنت پر مبنی معاشرے کی نوید سنائی مگر ان تمام معاشرتی اور سیاسی تصورات کا نتیجہ بیسویں صدی میں ہونے والی ہولناک جنگوں، جنگ عظیم اول اور دوئم سے ہم سب پر ظاہر ہو گیا ہے۔

جدید دور میں مثالی ریاست کے قیام کی کوششیں

سوال یہ ہے کہ کیا تمام خواہشات کی تکمیل کے بعد انسان حقیقی مسرت سے ہمکنار ہو سکتا ہے؟ یقیناً سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے بہت سے انسانی تصورات کو متشکل و مجسم کر کے پیش کر دیا ہے لیکن کیا محض سائنسی ترقی کو ہم انسان کی ترقی قرار دے سکتے ہیں؟ کیا آج کے دور کا انسان واقعی ترقی یافتہ ہے؟ بلاشبہ سائنسی نقطہ نظر سے جوہری توانائی کی ترقی ایک عہد آفریں قدم ہے، لیکن ہیروشیما اور ناگاساکی میں لاکھوں افراد کی موت کا ہولناک واقعہ، کیا ہمیں ایسی ترقی پر خوش ہونے کی اجازت دیتا ہے؟ ماضی کی تمام تہذیبوں نے دیگر تہذیبوں پر جو حملے کیے، اُن حملوں کے پس پردہ مقاصد جو بھی ہوں دعویٰ اکثر یہی کیا تھا کہ اُنہیں اقتدار حاصل ہو گیا تو وہ دنیا کو جنت ارضی بنا کر ہی دم لیں گے پھر اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔

بیسویں صدی، جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی اور پیش رفت کے عروج کی صدی خیال کی جاتی ہے اور اس دوران یوٹوپیائی طرز فکر کے حامل اکثر مفکرین نے اس طرز کے خیالات بھی پیش کیے کہ جلد ہی جنت ارضی کا خیالی تصور اب حقیقت بننے والا ہے آپ اکیسویں صدی کے آغاز سے بیس سال پہلے کے سائنسی میگزین اٹھائیں، آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعض مضامین میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ بیسویں صدی کے انسان اربوں سال کی انسانی تاریخ کے خوش نصیب ترین انسان ہوں گے۔ آج ہم اکیسویں صدی میں زندہ ہیں کیا ہم خود کو ایسا خوش نصیب خیال کر سکتے ہیں؟

آج ترقی یافتہ مغربی ممالک کے ادنیٰ اور عام باشندوں کو غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ ممالک کے اشرافیہ طبقے کے افراد سے کہیں زیادہ سہولتیں حاصل ہیں یہی وجہ ہے کہ آج اِن ترقی یافتہ ممالک کے معاشروں کو مثالی معاشرے کہا جاتا ہے یہ بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ ان معاشروں کے افراد اپنی خواہشات کی تکمیل میں اس حد تک آزاد ہیں کہ اُن کے ہاں اب اخلاقی قدروں کے معیارات بھی تبدیل ہوتے جا رہے ہیں آیئے دیکھتے ہیں کہ ان معاشروں کے افراد اپنی بیشتر خواہشات کی تکمیل کے بعد کیا حقیقی مسرت سے بھی ہمکنار ہو رہے ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔

1989ء کے دوران چونکہ سرد جنگ بظاہر اپنے انجام کو پہنچ رہی تھی چنانچہ ایک بار پھر یوٹوپیائی دانشوروں نے نعرہ بلند کیا کہ اب امن و آشتی کی ایک روشن صبح طلوع ہو رہی ہے اور اب دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن جلد ہی اُن کے یہ خواب بکھرنے لگے اور صرف چار سالوں بعد ہی ایمنسٹی انٹرنیشنل کے سیکریٹری جنرل پیریسین نے انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے دنیا کو آگاہ کیا:

> ”چار سال قبل جب دیوار برلن گرائی گئی تو ہمیں ایک نئے اور روشن مستقبل کی نوید ملی تھی لیکن اب ہمارے سامنے جو منظر ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ہولناک خانہ جنگیوں اور حکومتوں کو جبر کے قدیم دور کے طریقوں پر عمل کرتے دیکھ رہے ہیں خوش حالی تو دور کی بات ہے، ہم آج پہلے

سے ۔ں زیادہ انسانوں کو غربت، بیماری اور اذیت کے جہنم میں جلتا دیکھ رہے ہیں۔"
پ ۔ سین کی یہ حساسیت بے جا نہیں تھی، اس لیے کہ صرف 1989ء سے 1998ء کے دس سالوں کے دوران دنیا میں 107 خانہ جنگیاں رونما ہوئیں، صرف 1988ء کے آغاز کے دوران ایک سرحد ر جنگ کے مقابلے میں 32 خانہ جنگیاں برپا تھیں۔

تنقیدی جائزہ

مندرجہ بالا بحث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی انسان کی یہ سب سے بڑی تمنا ہو سکتی ہے کہ وہ دائمی مسرت حاصل کرے اور اس کے حصول کے لئے وہ جدوجہد بھی کرتا ہے، بعض جگہ کامیابی نصیب ہوتی ہے اور بعض جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے لیکن اُس کی مایوسی ہر لحظہ بڑھتی جاتی ہے اُس کی مرکزیت ختم ہو جاتی ہے انتشار پھیلنے لگتا ہے اور عموماً وہ مختلف طرز کے دانشوروں کے بیان کردہ یوٹوپیا کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

نظریہ

(Ideology)

سوال: آئیڈیالوجی ایک سیکولر مذہب ہے۔ بحث کیجیے۔ 2005ء، 2007ء، 2009ء

پس منظر

جواب : آئیڈیالوجی کی اصطلاح اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانسیسی فلسفی ڈیوش۔ ڈی۔ ٹریسی (Destutt De Tracy) نے وضع کی اور اس سے مراد "خیالات کی سائنس" لیا اور خیالات (Ideas) سے مراد نہ تو سائنس کے قطعی اور غیر مبہم خیالات تھے اور نہ فلسفے کے منطقی خیالات تھے، بلکہ وہ خیالات تھے جنھیں کوئی گروہ کائنات کے ساتھ اپنے رشتے کے تعین اور وضاحت کے سلسلے میں قائم کر لیتا ہے اور پھر انہیں راہ نما اصولوں کا درجہ دیے چلا جاتا ہے۔ ان خیالات کا سرچشمہ تاریخی عمل، ثقافتی رسومات، مذہب ہو سکتا ہے۔ ان خیالات کی صداقت کو پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

سائنس کو آئیڈیالوجی کی نقیض قرار دیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک دوسرے مقام پر سائنس بھی آئیڈیالوجی کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ بالخصوص جب سائنس فرد اور کائنات کے رشتے کے تعین میں قائدانہ کردار ادا کرنے لگ جاتی ہے۔

بعد میں بینتھم اور نپولین اس لفظ کا استعمال کیا۔ اسی بنا پر غالباً نپولین نے اپنے دوستوں کو "آئیڈیولوگ" (Ideologue) کہا "جو حقیقی دنیا سے بے خبر اور خوابوں میں رہنے والے تھے۔ ان "آئیڈیالوجیکل خیالات" کا سائنسی مطالعہ کیا جا سکتا ہے (اس مطالعے کو بیٹا آئیڈیالوجی کا نام دیا گیا ہے)

آئیڈیالوجی سے وابستہ تصورات کا اولین بیج غالباً میکاولی (1469ء - 1527ء) نے "دی پرنس" میں بویا۔ اس نے کہا کہ انسانی فیصلے مفادات اور ہوس سے متاثر (اور متعین) ہوتے ہیں۔

لیکن روسی انقلاب 1917ء نے اس لفظ کو مقبول عام کر دیا۔ کمیونسٹ طرز فکر کا اثر سیاست پر اس قدر چھا گیا کہ پورا سیاسی نظام اسی بنیاد پر قائم ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا مشرقی یورپ اشتراکی فکر کے زیر اثر آ گیا۔ چنانچہ اس کے مخالفین کو نئی آئیڈیالوجی کی نہ صرف تحریک ملی بلکہ انقلاب روس سے سبق

لیتے ہوئے دنیا کے بیشتر ممالک میں کمیونسٹ مخالف طرزِ فکر اختیار کیا جانے لگا اور ارباب اقتدار کو اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے ایک بااثر محرک میسر ہونے لگا۔

نظریہ کیا ہے؟

کسی قوم یا گروہ کو زندگی گزارنے کے لئے کچھ اصول، وضوابط یا کسی طرح کے فکری نظام کی ضرورت ہوتی ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ معاشرے کی کارکردگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ فکری نظام ہمہ جہت ہوتا ہے جو معاشرے کے کسی خاص پہلو پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی تمدنی، ثقافتی اور سیاسی تحریک کے فکری تصور کو نظریہ یا آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے۔

آئیڈیالوجی کا مفہوم

آئیڈیالوجی سے مراد ایسے تصورات اور افکار کا مجموعہ ہے جس کے تحت حقائق و واقعات کا تجزیہ کرنے کے لئے اصول دیئے گئے ہوں۔ نیز مقاصد کا تعین کرنے کے سلسلہ میں ایسا باقاعدہ لائحہ عمل تجویز کرے جس کی بنیاد پر مستقبل کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کی تعمیر نو ہو سکے۔

نظریہ کا لفظ سب سے پہلے ایک فرانسیسی فلاسفر ڈیسٹوڈی ٹریسی نے لگ بھگ 1801ء میں وضع کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر بیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک آئیڈیالوجی کا لفظ تقریباً نظریہ، خیالات اور تصورات کے معنی میں ہی استعمال ہوتا رہا مگر 1927ء میں کارل مارکس کی کتاب "German Ideology" کے منظر عام پر آنے کے بعد یہ لفظ کچھ نئے اور وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا۔ لفظ آئیڈیالوجی کو وسیع تر معنی ایک اور فلاسفر کارل منہیم کی کتاب "Ideology and Utopia" نے عطا کیے۔

کارل منہیم کی یہ کتاب 1929ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے بعد Ideology کا لفظ نظریہ، خیالات، تخیلات، جذبات و احساسات، اقدار اور کئی دوسرے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ اوپر بیان کردہ تشریح اور پس منظر کے بعد یہاں نظریہ کی چند حکماء کی بیان کردہ تعریفیں پیش کی جاتی ہیں۔

آئیڈیالوجی کیوں ضروری ہے؟

مکتب یا آئیڈیالوجی کیا ہے؟ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ انسان کو ایک فرد کے عنوان سے یا معاشرے کا ایک عضو ہونے کی حیثیت سے کسی مکتب کا پیروکار ہونا کیوں ضروری ہے؟ اسے کسی آئیڈیالوجی سے وابستہ ہونے اور اس پر ایمان رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کسی فرد یا معاشرے کے لیے آئیڈیالوجی کا ہونا ضروری ہے؟ ان سوالات کے جواب دینے سے بیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں مفکرین کی نظریہ کے متعلق رائے درج کریں تاکہ ہم جان سکیں کہ نظریہ کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔

(2) تاریخی بنانا (To Historicize)

(3) ابدی بنانا (To eternalize) یعنی:۔

(الف) آئیڈیالوجی کا اظہار کچھ اس طور ہوتا ہے کہ وہ عین محسوس ہوتی ہے۔

(ب) آئیڈیالوجی یہ باور کراتی ہے کہ وہ تاریخی طور پر پیدا ہوئی ہے۔ انسانی تاریخ کا بہاؤ جس مخصوص رخ میں تھا' اس رخ میں آئیڈیالوجی کا ظہور لازم تھا۔

(ج) آئیڈیالوجی خود کو ابدی اور مستقل صداقت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ امثال امر کے طور پر کہا گیا ہے کہ جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جو انسانی ضرورتوں اور فطرت کے عین مطابق ہے' یہ انسان کی سیاسی جدوجہد کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے اور جب جمہوریت کسی ملک میں رائج اور مستحکم ہو جاتی ہے تو کسی دوسرے نظام سیاست کی ضرورت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔

مارکسی تصور کے مطابق آئیڈیالوجی کو "پیدا" کیا جاتا اور واضح مقاصد کے تحت بروئے کار لایا جاتا ہے۔ (Antonio Gramsic) نے آئیڈیالوجی کے مارکسی تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے ثقافتی اجارہ داری (Hegemony Culture) کی اصطلاح متعارف کروائی ہے۔ اس اصطلاح کے ذریعے دراصل اس نے اس کا جواب پیش کیا ہے کہ آخر صنعتی یورپ میں کمیونزم کے انقلاب کی مارکس کی پیش گوئی پوری کیوں نہ ہوئی؟

گرامسکی کا نظریہ آئیڈیالوجی

گرامسکی کے مطابق صنعتی یورپ کے ممالک نے ثقافتی اجارہ داری کے ذریعے صنعتی مزدوروں کی سرمایہ داریت کے خلاف ممکنہ مزاحمت کو ٹالا ہے۔ "ثقافتی اجارہ داری" کا اثر و عمل وہی ہے جو آئیڈیالوجی کا ہے۔ ایک گروہ کا دوسرے گروہ پر فوجی طاقت کے استعمال کے بغیر اپنا ذہنی و تصوری اجارہ داری قائم کرنا اور اس اجارے کو فطری و تاریخی بنا کر پیش کرنا اور لوگوں کا اجارے کو فطری و تاریخی تسلیم کر لینا۔ چوں کہ صنعتی مزدوروں نے سرمایہ دارانہ سیاسی اعتقادات' تعلیمی تصورات' شہری قوانین کو فطری و تاریخی سمجھ کر قبول کر لیا اس لیے وہ سرمایہ داریت کے خلاف جدوجہد پر آمادہ نہیں ہوتے۔

ہر چند گرامسکی کا تجزیہ معذرت خواہانہ اور دفاعی نوعیت کا ہے' اور عوام کو "معصوم احمق" کے طور پر پیش کرتا ہے۔ جو خود قوت فیصلہ نہیں رکھتے اور دوسروں کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کر لیتے ہیں۔ مگر یہ آئیڈیالوجی اور اجارہ داری کے میکنزم کی وضاحت' بہر حال کرتا ہے۔ گرامسکی نے جسے ثقافتی اجارہ داری کہا ہے اس کی تشکیل' آلیتھو سے (1918ء - 1990ء) کے مطابق آئیڈیالوجیکل سٹیٹ آپریٹس کے ذریعے ہوتی ہے۔۔۔ اس سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ آئیڈیالوجی کوئی تجرید ہے۔ آلیتھو سے چوں کہ مارکسی ہے اس لیے وہ سامنے دعویٰ پیش کرتا ہے کہ آئیڈیالوجی مادی وجود رکھتی ہے۔۔۔ وہ مادی وجود کی طرح نہ صرف مؤثر

ہے بلکہ ریاستی تنظیموں کے اعمال کی شکل میں ظاہر بھی ہے۔ آئیڈیالوجی فرد اور موضوع پر حاوی ہے یہی بات آئیڈیالوجی کو مابعد جدیدیت کی نگاہ میں موزوں اور اہم بناتی ہے۔

آئیڈیالوجی کی طبقاتی تقسیم

آئیڈیالوجی دو طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم وہ جو کسی سماج گروہ میں مخص ... ثقافتی و تاریخی اسباب سے از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ گروہ بالعموم آئیڈیالوجی کے تشکیلی مراحل کا علم نہیں رکھتا۔ یہ آئیڈیالوجی اس گروہ کو طبقاتی شناخت دیتی ہے اس کے طبقاتی مفادات کی نگہبانی کرتی ہے۔

دوسرے طبقات سے رشتے کی نوعیت کا شعور دیتی ہے۔ آئیڈیالوجی کی دوسری قسم ... ہے ... باقاعدہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ یہ قسم ڈسکورس (رک) کے زیادہ قریب ہے اس آئیڈیالوجی کی درجنوں صورتیں ہیں مثلاً سوشلزم، لبرلزم، سوشل ڈیموکریسی، فیمن ازم نیشنلزم، ریجنل ازم، پان ارب ازم، فاشزم، نازی ازم، کنزرویٹوزم، اسلام ازم، ہندو نیشنلزم، زاؤزم، ریلزم، انٹرنیشنل ازم، گلوبلزم، سنٹر ازم، ... یہودیت، سائنٹزم وغیرہ۔

تاہم آئیڈیالوجی کی کوئی صورت اور قسم ہو اس کی کارکردگی یکساں ہوتی ہے۔ ہر آئیڈیالوجی میں بعض تضادات ہوتے ہیں، انہیں چھپایا یا دبایا جاتا ہے۔ اس لیے آئیڈیالوجی کے مطالعے میں ان چھپائے یا دبائے گئے پہلوؤں کو منکشف کیا جاتا ہے، اور ان کی مدد سے آئیڈیالوجی کے اصل مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یعنی آئیڈیالوجی کی تشکیل میں "غیر" موجود ہوتا ہے جو اس کی تفہیم میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

نظریہ کی اہمیت و افادیت

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نظریہ کسی قوم کو اس کی بقاء کے لئے فکری بنیادیں استوار کرتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ قوم نہ صرف دنیا میں آگے بڑھتی ہے بلکہ دوسری اقوام سے الگ اور ممتاز مقام کی حامل ہوتی ہے۔ نظریہ کسی قوم کے لئے روح رواں اور قوت متحرکہ کا کام کرتا ہے۔ اسی کی بدولت قوم میں اپنے تحفظ و بقاء کیلئے معرکہ آراء ہونے اور اپنی تعمیر نو کیلئے سرگرم عمل ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی ... کمزور اور نیم جان افراد میں ولولہ تازہ پیدا ہوتا ہے، اور وہ عزم و ہمت سے کام لے کر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

نظریہ قوم کی روح

نظریہ کسی قوم کے لئے وہ قوت متحرکہ ہے جو اسے اپنی بقاء اور تحفظ کے لئے سرگرم عمل رکھتا ہے۔ اسی کی بدولت قومیں کٹھن سے کٹھن مراحل سے احسن انداز سے گزر جاتی ہیں اور دیگر اقوام کے لئے زندہ مثال کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ قوم چونکہ افراد پر مشتمل ہوتی ہے لہٰذا اس کے افراد میں جتنا ولولہ تازہ موجود ہوگا اتنی ہی زیادہ ترقی کرے گی اور افراد کو ولولہ تازہ صرف اور صرف کوئی فکری نظام ہی عطا کر سکتا ہے ...

صرف نظریہ ہی ہوسکتا ہے۔

نظریہ اور قوموں کی شیزاہ بندی

کوئی بھی قوم مختلف مکاتب فکر کے افراد پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان الگ الگ سوچ وفکر کے حامل افراد کو ایک خاص سمت میں چلانے کے لئے کسی ایسے مرکزی فکری نظام کی ضرورت ہوتی ہے جس میں اتنی ہمہ گیری ہو کہ وہ افراد کے ذاتی نظریات کو اپنے اندر مدغم کر لینے کی وسعت اور طاقت رکھتا ہو۔ ایسی مرکزی فکری طاقت و نظریہ کہتے ہیں اور نظریہ قوموں کی شیزاہ بندی کے لئے انہیں خاص نصب العین کے تحت منزل کے حصول کے لئے جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔

نظریہ اور تہذیب

تہذیب کسی بھی قوم کی وہ نشانی ہوتی ہے جو بعض صورتوں میں قوموں کے مٹ جانے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے۔ ایسی تہذیبیں جو کئی صدیوں تک اپنے آثار ظاہر کرتی رہتی ہیں ان کے پیچھے ایک طاقتور اور ہمہ گیر نظریے کی قوت موجود ہوتی ہے جو اس تہذیب کو ایسے نقطہ عروج پر لے جاتی ہے جہاں دوسروں کے لئے اسے فراموش کرنا ناممکن بن جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک برطانوی مفکر نے کہا ہے: ''نظریات وہ قوت ہیں جو تہذیبوں کو جنم دیتے ہیں۔''

نظریہ اور انقلاب

روز اول سے لے کر روز حاضر تک زمانے نے مختلف انقلابات دیکھے ہیں۔ ان انقلابات کی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے آپ کو ان کے پیچھے ایک مضبوط اور ہمہ گیر فکری نظام عمل پیرا ملے گا۔ انقلاب محمدیؐ کو دیکھ لیں اس کے پیچھے موجود فکری نظام نے کچھ ہی سالوں میں دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ آج کے دور پر نظر دوڑائیں تو انقلاب فرانس، انقلاب روس، انقلاب چین اور انقلاب ایران کے پیچھے بھی ایک نظریاتی فکر ہی کارفرما تھی۔ ایک مغربی مفکر نے کیا خوب کہا ہے: ''نظریات وہ قوت ہیں جو انقلابات کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ ان میں بم سے زیادہ طاقت پنہاں ہوتی ہے۔''

نظریہ اور دور حاضر، حامی اور مخالفین

دور حاضر میں نظریہ کی افادیت نہ صرف یہ کہ بڑھ گئی ہے بلکہ اس کا دائرہ کار بھی وسیع تر ہو گیا ہے۔ اردو سائنس بورڈ کی تشریحی لغت کے مطابق: ''دور حاضر میں عمرانیات کا ماہر نظریات کو خیالات کے مختلف انداز قرار دیتا ہے۔ وہ مختلف نظریات کے درمیان امتیاز بھی روا رکھتا ہے۔ مثلاً کسی خاص گروہ کے گروہی مفادات (جیسے چھوٹے تاجروں کے طبقہ کے نظریات) یا ''مکمل نظریات'' جو کسی طرز زندگی کے ساتھ کلی تعلق پر مبنی ہوں۔ 1950ء اور پھر 1960ء کے عشروں میں ماہرین عمرانیات کے ایک گروہ نے جن میں ریمنڈ ایرون، ایڈورڈ شلز، ڈینیل بیل اور ایس۔ ایم۔ لپ سٹ سرفہرست ہیں ''نظریات'' کے اسی تصور کو ''لادینیت'' قرار دیا تھا جو ان کے خیالات میں مغربی صنعتی معاشروں میں الہامی عقائد کے

انحطاط یا الہامی نظریات کے خاتمہ کا سبب بن گیا ہے۔"

ایک اور فلاسفر ٹالکوٹ پرسنز نے نظریہ کو ایک تشریحی سکیم قرار دیا ہے جو عمرانی گروہوں نے اس دنیا کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل بنانے کے لئے تیار اور اختیار کی ہے۔ مارکس کے نظریہ کے خاص اور عمرانی اقدار اور روایات کے حامی، دونوں "نظریہ" کو "حقائق کی مسخ شدہ شکل" قرار دیتے ہیں۔ کارل مارکس تو نظریہ کو "ضمیر کی سچائی" کے الٹ قرار دیتے ہیں اور ماہرین عمرانیات "نظریہ" کو "علوم عمرانی" سے متضاد قرار دیتے ہیں تاہم بعد میں آنے والے ماہرین علم بشریات، نظریہ کو زیادہ فطری انداز میں دیکھتے ہیں۔ مثلاً کلیفورڈ گیرٹز کے مطابق: "نظریہ تو ایک طرح کی علامت ہوتی ہے جو دوسری ثقافتی علاماتی نظام میں سے ایک ہوتی ہے۔ مثلاً علمی نظریات، سائنسی نظریات یا پھر مذہبی نظریات جو سب سائنسی انداز ... ئے ہوئے ہیں۔"

سیاسی نظریات

سیاسی جماعتیں اپنے سیاسی محرکات اور پروگراموں کی بنیاد کسی نہ کسی نظریہ پر رکھتی ہیں۔ سماجی علوم کی روح سے دیکھا جائے تو سیاسی نظریہ (Political Ideology) کسی سماجی تحریک، ادارے یا خاص گروہ کا تصورات، اصولوں، عقائد یا علامتوں کا ایسا نظام ہوتا ہے جو اس بات کی تشریح کرتا ہے کہ معاشرے کو کیسے کام کرنا چاہئے اور یہ کسی خاص سماجی ڈھانچے کی تشکیل کے لئے کوئی سیاسی اور تہذیبی لائحہ عمل بھی پیش کرتا ہے۔ وسیع معنی میں سیاسی نظریہ خود کو اس بات سے منسلک کرتا ہے کہ طاقت کا تعین کیسے ہو اور اسے کن مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جائے۔ بعض سیاسی جماعتیں کسی ایک نظریہ پر عمل پیرا ہوتی ہیں جبکہ کچھ دیگر پارٹیاں متعلقہ نظریات سے تحریک تو بھلے لیتی ہیں مگر ان میں سے کسی ایک کو خاص طور پر قبول نہیں کرتیں۔

سیاسی نظریات کی دو جہتیں

(1) اہداف

سیاسی نظریات کی اولین جہت اہداف کا تعین ہوتا ہے جو اس بات پر مشتمل ہوتا ہے کہ معاشرے کا نظام کیسے چلایا جانا چاہئے۔

(2) طریقہ ہائے کار

سیاسی نظریات کی دوسری جہت یہ ہوتی ہے کہ مثالی بندوبست کے لئے حصول کے لئے مناسب ترین طریقوں کا استعمال کیا جائے۔ سیاسی نظریات کا معاشرے کے معاشی، تعلیمی، صحت سے متعلق، لیبر اور جرائم کے قوانین اور انصاف جیسے پہلوؤں سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی نظریات سماجی تحفظ، سماجی فلاح و بہبود، تجارت، ماحول، فوج کے استعمال، حب الوطنی اور معاشرے میں مذہب کے کردار جیسے پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔

نظریہ اور روزمرہ کی سماجی زندگی

عوامی بحث و مباحثہ میں بعض تصورات دیگر موجود تصورات کی نسبت عوام میں جلد پذیرائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اکثر اوقات مختلف دلچسپیوں اور پس منظر والے افراد ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں۔ سماجی علوم کے ماہرین اس مظہر کو نظریات کی شہادت (Evidence) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پر اثر نظریات معاشرے میں وہ مقام حاصل کر لیتے ہیں جن کو معاشرے میں چیلنج کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ نظریات جو رائج اور غالب نظریہ سے مختلف ہوتے ہیں ان کی حقیقی بصیرت کے مندرجات چاہے کچھ بھی ہوں وہ ریڈیکل شکل اختیار کرتے جاتے ہیں۔

ایسی تنظیمیں جو معاشرے میں طاقت حاصل کرنا چاہتی ہوں وہ موجود نظریات پر اثر انداز ہونے کے لیے اس کے قریب آنے کی جدوجہد کرتی ہیں تاکہ وہ جو کچھ بننا چاہتی ہیں آسانی سے بن سکیں۔

اسی طرح سیاسی تنظیمیں بشمول حکومت اور دیگر گروہ (لابی ساز) اپنی مخصوص آراء کی تشہیر کر کے عوام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب معاشرے کے زیادہ تر افراد بعض خصوصی معاملات کے بارے میں ایک جیسا سوچنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ تک بھی بھول جاتے ہیں کہ کوئی متبادل بھی موجود ہے کہ نہیں یہی صورتحال ہے جو کسی قوم کو بالادستی (Hegemony) کے تصور تک لے جاتی ہے۔ "بالادستی" کی اصطلاح کا استعمال معاشرے کے کسی ایک طبقہ یا طبقوں پر ایک طبقہ کے غلبہ کو ہی بیان نہیں کرتا بلکہ اس سے یہ بھی مراد لی جاتی ہے کہ بالادست طبقہ نہ صرف امور عالم میں اپنے نقطہ نظر کو دوسروں پر ٹھونسنے بلکہ ان کو اپنے سماجی و معاشرتی طور طریقے اختیار کرنے پر بھی "مجبور" کرتا ہے۔ یہ سب انتہائی غیر محسوس انداز میں کیا جاتا ہے۔

(بحوالہ: تشریحی لغت، صفحہ 381)

آئیڈیالوجی کی اقسام (Kinds of Ideology)

آئیڈیالوجی دو طرح کی ہوتی ہے۔

1) انسانی آئیڈیالوجی اور

2) گروہی آئیڈیالوجی۔

انسانی آئیڈیالوجی یعنی جس کا مخاطب بنی نوع انسان ہے۔ قبیلہ نسل قوم یا کوئی خاص طبقہ نہیں ہے۔ ایسی آئیڈیالوجی کسی ایک معین گروہ یا طبقہ کی نجات کا دعویٰ نہیں کرتی بلکہ نوع انسانی کی نجات کی دعویدار ہے۔ منصوبہ اور لائحہ عمل تمام انسانوں کے لئے پیش کرتی ہے۔ کسی مخصوص طبقے کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اسے حامی اور مددگار کسی ایک معین حلقے یا گروہ سے حاصل نہیں کرتی بلکہ تمام گروہوں حلقوں ملتوں اور طبقوں کو دعوت دیتی ہے۔

اس کے برعکس گروہی آئیڈیالوجی کا مخاطب گروہ طبقہ یا ایک مخصوص حلقہ ہوتا ہے اور صرف اسی

گروہ کی نجات یا برتری کی دعویدار ہوتی ہے چونکہ اس کے مخاطب صرف اسی گروہ کے افراد ہوتے ہیں۔ بنا بریں یہ جو بھی منصوبہ تجویز کرے گی اسی مخصوص گروہ کے لئے ہوگا۔ لہٰذا صرف اسی گروہ سے اپنے خاص مددگار و جانثار جذب کرتی ہے۔

عالمی سیاست پر آئیڈیالوجی کے اثرات

عالمی سیاست پر آئیڈیالوجی کے اثرات کے متعلق مفکرین کی آراء میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

معروف مفکر پروفیسر ہل (Prof. Hill) کی رائے میں:

آئیڈیالوجی تو ایک ایسے طے شدہ پروگرام کی طرح ہے جس کو پیش کرنے کے بعد لوگوں سے امید رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے طرز عمل کو اس کے اصولوں کے سانچے کے مطابق ڈھالیں گے۔ چنانچہ جن حالات کے تحت بھی کوئی فرد رہ رہا ہو، آئیڈیالوجی قبول کرنے کے بعد وہ اپنے طرز عمل کو اس کی تعلیمات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو اپنی حکمت و دانش اور عقل کو استعمال کر کے خود اپنی راہ ڈھونڈیں۔"

اس کے برعکس بعض مفکرین اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں کہ نظریات (آئیڈیالوجیز) کا عالمی سیاست میں کوئی کردار نہیں۔ اگر کوئی قوم دوسرے لوگوں پر غلبہ پا کر ان پر اپنے تصورات اور طرز زندگی کے نقوش ثبت کرتی ہے تو اس کا سبب کسی آئیڈیالوجی کے اثرات نہیں بلکہ طاقتور قوم کی طرف سے محکوم لوگوں پر دباؤ ڈالنے کے مترادف ہے۔ ان کے مطابق نظریات محض کسی ملک کے تمدنی خدوخال کی سمتوں کا تعین کرتی ہیں۔

معروف دانشور ای ایچ کار (E.H. Carr) کے مطابق:

"1914ء سے قبل خارجہ پالیسی پیشہ ور افراد کے دائرہ کار میں روبہ عمل ہوتی تھی اور اسے جماعتی سیاست سے بلند و بالا خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے اور رائے عامہ کی اہمیت بڑھ چکی ہے۔ رائے عامہ کے رجحانات کے حوالے سے پالیسی پر آئیڈیالوجی کے اثرات کو اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

پروفیسر ڈاکٹر محمد سرور نظریات کی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے نظریات کی اہمیت اس اعتبار سے مسلمہ ہے کہ ان کے بعض اصول قومی طاقت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ قوت و طاقت جس طرح نیشنلزم کی آلہ کار بنی اسی طرح کسی آئیڈیالوجی کی دعویدار بعض ریاستوں نے طاقت کا بھرپور استعمال کیا۔ اشتراکیت ایک عالمی چیلنج کی حیثیت سے اس لیے ابھری کہ اس کی پشت پر دو بڑی طاقتوں یعنی سوویت یونین اور چین کی قوت موجود تھی۔ تاہم آئیڈیالوجی کا منطقی یا فلسفیانہ رخ اس

کے اندر حرکت یا جاذبیت پیدا کرنے میں اتنا فعال نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے ساتھ جذباتی وابستگی متحرک ہوتی ہے۔ کسی آئیڈیالوجی، کے ساتھ جذباتی وابستگی اس کی خامیوں اور اس کے حامی قائدین کی کمزوری پر پردہ ڈالے رکھنے کا موجب بنتی ہے۔ نیز ایسی وابستگی انتہا پسندانہ طرزِ عمل کی آبیاری کا باعث بنتی ہے جس سے عالمی مسائل کو حل کرنے میں مزید مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ عالمی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایسی فضا کا موجود ہونا ضروری ہے جس میں سیاسی مدبر مفاہمانہ طرزِ عمل کے حامل ہوں اور ہر بات میں قومی عزت و وقار کا مسئلہ کھڑا کیے رکھیں۔ یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ اس قسم کے انتہا پسندانہ رویہ جات کے باعث بعض نازک مواقع پر منعقدہ عالمی کانفرنسیں بھی محض پراپیگنڈے کے لیے بنائے گئے فورم کی شکل اختیار کر لیتی ہیں...... ماضی میں اگرچہ آئیڈیالوجی نے عالمی رویوں کو ایک خاص ڈھب پر ڈھالنے کے لیے اہم کردار کیا لیکن مغربی دنیا اور سابق سوشلسٹ ممالک میں اب صورتحال بدلتی نظر آتی ہے۔ اس وقت بیشتر عالمی مسائل کی نوعیت جو بظاہر فکری نظر آتی ہے اصل میں سیاسی ہے۔ خواہ مسائل چین و روس، چین و امریکہ یا پھر عرب اسرائیل کی باہمی کشمکش سے متعلق ہی کیوں نہ ہوں۔ اب تو فکری اختلافات کی نوعیت بھی تغیر پذیر ہے۔ عالمی سطح پر ماضی کے متحارب ممالک کے درمیان اشتراک و تعاون کی طرف پیش رفت جاری ہے۔ مشرقی یورپی ممالک، جو ماضی میں اشتراکیت نواز تھے، وہاں کے لوگوں کے اندر قوم پرستانہ وابستگیاں اجاگر ہو رہی ہیں۔ نیز جمہوری لبرل افکار پنپ رہے ہیں۔ جرمنی کو تقسیم کرنے والی فکری تقسیم معدوم ہو گئی ہے۔ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کے اندر الگ امہ کا تشخص ابھر رہا ہے۔" ("بین الاقوامی تعلقات اور عالمی سیاست۔" ص 206-205)

مندرجہ بالا تعریفات سے اہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ آئیڈیالوجی کسی ملک کی خارجہ پالیسی کے مقاصد متعین کرتی ہے اور پھر اس کے لیے اخلاقی معیار بھی مقرر کرتی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کے حصول کی جدوجہد کے لیے ایک آئیڈیالوجی اخلاقی جواز بھی مہیا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کی خارجہ پالیسی پر ہمیشہ سے یہ فکری اصول برتر حیثیت میں رہا کہ عالم اسلام سے تعلقات کو فروغ دیا جائے اور یہ بات ملک کے ہر دستور میں "رہنما اصول" (Guiding Principles) کے طور پر موجود ہے۔